ہمارا اردو ناول منزل بہ منزل

ڈاکٹر عبدالسلام

ہمارا اردو ناول

منزل بہ منزل

ڈاکٹر عبدالسلام

ناشر

قمر کتاب گھر۔ اردو بازار کراچی

قیمت ....

اشاعتِ اوّل .... ایک ہزار (۱۰۰۰)

ناشر .... قمر کتاب گھر اردو بازار کراچی

خطاطی .... نصر خوشنویس اکیڈمی

فہرست

اپنے بچّوں

جگنوؔ، عزیزؔ اور اقبالؔ

کے نام

ایسی بلندی ایسی پستی

عزیز احمد

"گریز" پہلا ناول ہے جسے عزیز احمد نے جم کر اور اپنے ادبی بلوغ کے زمانے میں لکھا۔ یہ خاصا اختلافی ناول رہا ہے۔ ترقی پسند حلقوں میں اس کی بے انتہا تعریف کی گئی اور اسے اس تحریک کا بہترین ناول کہہ کر پکارا گیا۔ کنہیالال کپور نے اس کے ہیرو نعیم کو مستقبل کا انسان قرار دیا ہے خلیپ پر ان کی جو رائے ہے اس میں یہ جملہ بھی ملتا ہے "ٹیکنیک، پلاٹ اور کردار سازی کے اعتبار سے بہت کم جدید اردو ناول گریز سے ٹکر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس کشن پرشاد کول، ڈاکٹر احسن فاروقی، علی عباس حسینی وغیرہ نے اس ناول کی عریانی پر کافی سخت اعتراضات کیے ہیں۔

عزیز احمد کے تمام ناولوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کا بہترین ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" قرار پاتا ہے اس ناول میں عزیز احمد کا مقصد حیدر آباد کے جاگیردار رؤسا اور دولت مندوں کی گھناؤنی زندگی اور ان کی اخلاقی پستی کی تصویر پیش کرنا تھا مختلف قسم کے نشیب و فراز دکھانے کے لیے انھوں نے مختلف قسم کے کردار پیش کیے ہیں۔

زندگی کی پیش کش کے سلسلے میں عزیز احمد نیچرلزم کے قائل ہیں۔ اس انداز پر عقیدہ رکھنے والا اصولی طور پر زندگی میں کسی قطع و برید کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ قصے کا کوئی خاکہ مرتب نہیں کرتا۔ بہ الفاظ دیگر اس قسم کے ناولوں میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا۔ عزیز احمد اپنے اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ایسی بلندی ایسی پستی" مسلسل نہیں لکھا گیا اور نہ پہلے سے (کاغذ پر) اس کا کوئی خاکہ تیار کیا گیا۔ ایک خاکہ ذہن میں محفوظ تھا جس بات کے لیے طبیعت موزوں ہوئی پہلے اسی کو لکھ ڈالا۔ اس تجرباتی ناول میں وقت کے

فریب کو بھی توڑنا تھا اور صرف سریندر کی خود کلامیوں میں نہیں، ناول کی بنیادی تکنیک میں، کیونکہ ڈرامائی لمحے وقت کی ہموار اور غیر دلچسپ سطح پر یوں ابھرتے ہیں جیسے دھند کے اوپر کی برفانی چوٹیاں۔ ان ڈرامائی لمحوں کی علّیت ثانوی چیز ہے"

ذہن میں خاکہ محفوظ ہونا اور قصے کا الگ الگ ٹکڑوں یعنی ابواب میں منقسم ہونا پلاٹ نہیں تو کیا ہے۔ پلاٹ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ خاکہ کاغذ پر مرتب کیا جائے۔ بس خاکہ کا مرتب ہونا ضروری ہے میں اسے مصنف کی خامی یا فروگزاشت نہیں سمجھتا بلکہ خوبی سمجھتا ہوں۔ اس اقتباس میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ انھوں نے وقت کے فریب کو بھی توڑا ہے مگر یہ بات صرف سریندر کی خود کلامی میں نظر آتی ہے جو شعور کی رو کے کافی قریب پہنچ جاتی ہے۔ پھر بھی صحیح معنوں میں ڈرامائی وقت یا نفسیاتی زمان (Psychological time) کا تصور اس میں نہیں ابھر پایا ہے۔ اس میں تسلسل زماں (Time Sequence) وہی روائتی ناول جیسا ہے۔ عزیز احمد نے یورپین ناول کا مطالعہ محض طالب علمانہ یا عالمانہ نظر سے نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے ادیبانہ نظر سے کیا ہے۔ ناول نگاری کا شعور ان کی فطرت کا جزو بن گیا ہے۔ ٹکنیک کے جو تجربے انھوں نے پیش کیے ہیں وہ محض تقلیدی نظر نہیں آتے بلکہ ان کی شخصیت میں ہو کر گزرے ہیں۔

عزیز احمد زندگی کو پوری سچائی کے ساتھ من وعن بیان کرنے کے ہیں۔ اس ناول میں ایک جگہ لکھتے ہیں "گریز کو پڑھ کر کرشن چندر نے مجھ سے کہا تھا "مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم آخر میں نعیم الحسن اور بلقیس کی شادی نہ کرا دو"، میں نے جواب میں کہا تھا کہ نعیم اور بلقیس کی شادی ناول میں اس لیے نہ ہو سکی کہ زندگی میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو مصنف کے اختیار کی بات نہیں۔ ماحول اور ہیرو ہیروین کے اختیار کی بات ہے۔ اپنی حد تک تو مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ میں نے حقیقت نگاری کو ہمیشہ فوٹوگرافی سمجھا ہے۔ ممکن ہے کبھی کبھی شیشہ دھندلا ہو، فلم

خراب ہو یا فلم لیتے وقت روشنی ٹھیک نہ ہو یا میری اپنی بصارت یا بصیرت میں فرق ہو لیکن میں نے زندگی کی تنقید ہمیشہ زندگی کی عکاسی کے اندر سے کی ہے اور اصلی اور حقیقی کے فرق کا قائل نہیں ؛؛

یہ عزیز احمد کی بہت بڑی خوبی ہے کہ انھوں نے زندگی کی سچی پیش کش کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ ناول ہو یا افسانہ ان کے یہاں زندگی کی پیش کش میں اتنی سچائی پائی جاتی ہے کہ ان کے قریبی ساتھی ان کے کرداروں کی نشان دہی بھی کر سکتے ہیں مگر جس قسم کی عکسی فطرت نگاری کا انھوں نے دعویٰ کیا ہے ان کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر قائم نہ رہ سکے۔ انھوں نے شعوری طور پر اس کی کوشش ضرور کی ہوگی مگر غیر شعوری طور پر ان کا تخیل پیش کش اور ترتیب میں مکمل طور پر عمل پیرا رہا ہے۔

"ایسی بلندی ایسی پستی" کا شمار ان ناولوں میں ہوتا ہے جنھیں ہم تہذیبی ناول کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً "امراؤ جان ادا"، "شام اودھ" اور "فسانۂ آزاد"۔ "امراؤ جان ادا" میں لکھنؤ کی تہذیب کو ہمدردانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اس لیے اس میں ایک رومانی حسن پیدا ہو گیا ہے "شام اودھ" کا انداز بھی تقریباً اسی کا ہے "فسانہ آزاد" میں لکھنوی تہذیب اپنے پورے حسن و قبح کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" میں اس کے برخلاف پیش کش کا انداز طنزیہ ہے اور حیدر آباد کے طبقۂ امراء کی زندگیوں میں اگر کوئی حسن ہوگا بھی تو وہ نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ زندگی کی جانب یہ رویہ غالباً ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی کی بنا پر ہے۔ کرشن چندر کے یہاں بھی یہی انداز نظر آتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تضاد پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں آورد ہے جبکہ عزیز احمد کے یہاں آمد نظر آتی ہے۔

"امراؤ جان ادا" کی طرح یہ ناول بھی توازن کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں زندگی اور کردار ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ کردار زندگی سے ابھرتے ہوئے نظر

اُتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کردار ذراسی دیر کے لیے بھی نمودار ہوتا ہے اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

وہ حیدرآباد کی بلندی کی پستیوں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے کے قابل اس لیے ہوئے ہیں کہ اتفاق سے یا خوش قسمتی سے وہ کچھ عرصہ تک حیدرآباد کی انتہائی بلندی سے وابستہ رہ چکے ہیں۔

اصل واقعہ کی ابتدا نورجہاں کے نانا قابل جنگ کے حالات سے ہوتی ہے ۔۔ یہ اس زمانے کے آدمی تھے "جب سرسید سینے پر تمغے اور ستارے لگاتے تھے۔ حالی نثر میں بے تکلف انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے تھے اور نذیر احمد کا ابن الوقت آکس ٹنگ کھاتا تھا اور ابھی تائب نہیں ہوا تھا۔

حیدرآباد میں مغربیت کس طرح درجہ بدرجہ آئی اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے سلطان حسین اور نورجہاں کے زمانہ تک یہ طبقہ مغربیت اور مشرقیت کا عجیب و غریب امتزاج بن چکا تھا۔ مدار المہام اور نظام کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی ریشہ دوانیاں چل رہی تھیں آپس میں کیسی کیسی رقابتیں تھیں اور ان رقابتوں کا ان کے خاندانوں پر کیا اثر پڑ رہا تھا۔ اعلیٰ کوثر نواز جنگ اور ذی جاہ جنگ کی رقابت کا نقشہ بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ذی جاہ جنگ کے پاس دہری جاگیریں تھیں ۔ اعلیٰ کوثر نواز جنگ اپنی محنت سے آگے بڑھے تھے۔

"ذی جاہ جنگ چھ فٹ کے لمبے بڑے گورے چٹے بارعب آدمی اور خاندانی جاگیردار تھے۔ ذی جاہ جنگ خان حضرت کے سوا کسی اور کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بات نہ کرتے تھے"

ذی جاہ جنگ اس رقابت میں اس قدر الجھے رہے کہ وہ اپنی اولاد کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ ان کی بدترین اولاد جوان کی بدنامی کا باعث ہوئی وہ سروری تھی جو نورجہاں کے بھائی خاقان کو بیاہی گئی تھی

"خاقان کا تقریباً ہر دوست اور کئی عزیز دعوے کرتے تھے کہ ان کے اور سروری کے تعلقات ہیں۔ فرخندہ نگر میں شوہری کے اصول مغرب سے بہت مختلف ہیں کسی عورت کی محبت کا راز فاش کرنا یا اس سے اپنے تعلقات کے غلط یا صحیح دعووں کا کھلم کھلا اعلان اپنی مردمی، مقبولیت، مردانہ حسن، اپنے استغنا کا اعلان اور اشتہار سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سروری بے چاری اتنی بدنام ہوئی کہ لوگوں نے مشہور کیا کہ وہ اُرڈرلیوں تک سے پھنسی ہوئی ہے۔ ایک رات جب وہ سیدھی پی کے ایک اُرڈرلی سے اختلاط کر رہی تھی خاقان نے اسے خوب مارا۔ چیخ و پکار کی آواز سن کے ذی جاہ جنگ آئے اور انھوں نے بیٹی اور داماد دونوں کو راتوں رات گھر سے نکال دیا۔ دونوں پھر الگ گھر لے کے رہنے لگے۔"

ذی جاہ جنگ بڑے با اثر جاگیردار تھے ان کے خاندان سے رشتہ جوڑنے کے لیے خاقان کی ماں خورشید زمانی بیگم نے سروری کے لیے پیغام بھجوایا۔ ذی جاہ جنگ اس کی آوارگی سے عاجز تھے۔ انھوں نے فوراً قبول کر لیا۔ سروری نے اپنے سسرال میں بھی خوب گل کھلائے۔ ساس کی پٹائی کر دی۔ دونوں یہاں سے نکل کر ہی ذی جاہ جنگ کے گھر گئے تھے۔ آخر کار وہاں سے بھی نکالے گئے۔ سروری امیر گھرانوں کی آوارہ لڑکیوں کا بدترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس کی زندگی کے ذریعے مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر تربیت کی طرف دھیان ہی نہ دیا جائے تو نتیجہ اس شکل میں برآمد ہوتا ہے۔ سروری انتہائی بلندی میں انتہائی پستی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

مصنف نے تربیت کی خرابی اور مخلوط نسل کے ملے جلے تاثرات کا نمونہ بھی اسی خاندان سے پیش کیا ہے۔ قابل جنگ نے اپنی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد اپنی لڑکیوں کو پڑھانے کے لیے اینگلو انڈین استانی مس اسکرو رکھی بعد میں اس سے شادی کر لی اور اس کا اسلامی نام سکندر زمانی بیگم رکھا۔

اس سے کندر زمانی بیگم کے بطن سے دو بیٹے محمود شوکت اور نیازی پیدا ہوئے یہ گویا خورشید زمانی بیگم کے سوتیلے بھائی اور خاقان کے سوتیلے ماموں تھے۔ ان کا حال مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"اور خصوصاً نیازی کے نام سے تو سب واقف تھے۔ فرخندہ نگر کے باہر اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے یہ دونوں بھائی جوان وڈر اور کسان عورتوں کو اٹھائے جاتے اور وڈر اور مزدور ان کے پیچھے دوڑتے پتھر مارتے اور تھک ہار کر خاموش ہو جاتے۔ یہاں تک کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہی عورتیں روتی اور کپڑے ٹھیک کرتی ہوئی اپنے شوہروں اور اپنے بھائیوں کے پاس واپس آ جاتیں۔ شہر کی سڑکوں پر چلتے چلتے کسی ماما یا ڈھیرنی یا لمباڑتی کے سینے پر ہاتھ پھیر دینا تو ان دونوں بھائیوں کا عام مشغلہ تھا۔"

اسی نیازی کی بیوی اپنے فیشن کے اخراجات کے لیے کسی اور سے پھنسی ہوئی تھی۔ نیازی بھی اس سے واقف تھا اور دوسرے لوگ بھی واقف تھے۔ پینے میں اس کا یہ مقام تھا کہ پورے فرخندہ نگر میں سوائے ابوالہاشم انجینیر کے کوئی اس کا مدمقابل نہ تھا۔

حیدرآباد کے اس طبقہ کا نظام اخلاق عجیب وغریب قسم کا تھا۔ ان کا خیر و شر کا معیار بھی نچلے اور متوسط طبقے کے معیار سے الگ تھا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد دربار میں اثر رسوخ حاصل کرنا تھا۔ چاہے اس کے لیے انھیں کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ انھیں اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ ان کی اولاد کس طرح پروان چڑھ رہی ہے۔ اور کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔ عورت ان لوگوں کے نزدیک صرف جنسی تسکین کا ذریعہ تھی اس لیے ان کے گھروں میں بنجارنیں، وڈرنیاں اور اینگلو انڈین عورتیں تک نظر آتی ہیں عشق کی صلاحیت نہ ان کے مردوں میں تھی نہ ان کی عورتوں میں۔ عشق کے لیے جس ذہنی اور اخلاقی ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان کے خمیر ہی میں نہ تھا

مصنف لکھتے ہیں ”مقطع وہی شادی سہی لیکن محمود شوکت، نیازی، اصغر ان سب کے نزدیک عشق عشق ہی نہیں تھا جب تک اس میں بدمعاشی کی شان نہ ہو۔ وہ عشق عشق ہی نہیں تھا جس میں ڈینگیں نہ ماری جائیں اور خواہ انجام شادی کیوں نہ ہو پینگیں بڑھا کر لڑکی کو خراب کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ وہ عشق تھا جس کا وہسکی کے گلاس سے بڑا گہرا تعلق تھا“

اینگلو انڈین اور انگریز عورتوں سے ان کے مرد ہی شادیاں نہیں کرتے تھے ان کی عورتیں بھی کر لیا کرتی تھیں اس قسم کی ایک عورت زینت رکاب جنگ ہے جو رکاب جنگ کی زندگی میں ہی فلرٹ کرتی تھی اس کی موت کے بعد اس نے ایک انگریز لیوس سے شادی کر لی۔ شادی سے پہلے وہ اس کا پاندان اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ فرخندہ نگر میں زینت کو گندی بھینس، کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ جنس کے معاملے میں بڑی آزاد خیال تھی۔ مردوں کو قابو میں کرنے کا گر اسے خوب آتا تھا۔ شادی کی وہ اس لیے قائل ہے کہ ”شادی دراصل ایک طرح کی کنوی نینس ہے“۔

جیسا کہ میں نے کہا تھا جنسی رویہ کے لحاظ سے اس طبقہ کے بیشتر افراد تقریباً یکساں ہیں مگر مصنف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر کردار کو الگ الگ ابھارا ہے۔ مردانہ کرداروں میں سب سے زیادہ توجہ سلطان حسین پر دی گئی وہی اس ناول کا ہیرو ہے۔

اس کا کردار بھی عجیب و غریب ساخت کا نظر آتا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ انجنیئر ہے۔ دولت کی فراوانی ہے۔ عورتوں کے پیچھے وہ بھی اسی طرح بھاگتا نظر آتا ہے جیسے ”گریزنگ کا نغیم۔ وہ مسوری سیر کے لیے نہیں بلکہ صرف عورت بازی کے لیے جاتا ہے۔ جہاں میوائٹے کے لان کے آگے فیشن ایبل بیویاں دوسری عورتوں کے مال دار شوہروں سے اندھیارے میں لپٹی رہتی تھیں کئی کاروباریوں نے دوسروں کی بیویاں اڑا لیں۔ کئی نے

اپنی بیویوں کو طلاق دی۔

سلطان حسین پرانا مسورین تھا۔ اسے اس قدر عورتیں مل جاتی تھیں کہ وہ شادی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ مگر جب اس کی جوانی ڈھلنے لگی تو جوان لڑکیوں نے اس کی طرف ملتفت ہونا بند کر دیا۔ مسوری میں صرف کملا پریش برابر حقِ رفاقت ادا کیے جا رہی تھی۔ ایک دن سلطان حسین بمبئی سے آئی ہوئی ایک پارسی لڑکی کی طرف ملتفت ہوا۔ اس نے بڑے طنز بہ انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیا۔ اس نے بتایا کہ یہ سب "ڈبلیو۔ ٹی ہے"۔ سلطان حسین سمجھ جاتا ہے کہ اس کا مطلب ویسٹ آف ٹائم ہے۔ لہٰذا وہ فرخندہ نگر آ کر شادی کر لیتا ہے۔ اس کی ماں اور بہن نور جہاں کو پسند کر کے اس سے اس کی شادی کر دیتی ہیں۔ وہ شادی ازدواجی زندگی کے لطف کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ اس کی مارکیٹ ویلیو گر چکی ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کے سامنے دوسری عورتوں سے عشق کرتا پھرتا ہے۔ اسے دھوکا دے کر کملا پریش سے ملتا ہے دوسری عورتوں کے ساتھ بڑی آزاد خیالی کا مظاہرہ کرتا ہے مگر اپنی بیوی کے ساتھ وہ بہت تنگ نظر بن جاتا ہے۔

شادی کے بعد جب وہ ہنی مون کے لیے مسوری جا رہا تھا آگرے کے اسٹیشن پر ایک مزدور اس کی بیوی نور جہاں کی طرف گھور رہا تھا۔ اس نے فوراً کھڑکی بند کر دی۔ ایک دن پارٹی میں اس نے دیکھا کہ وہ ایک مرتبہ اطہر اور نور جہاں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے غصے سے پوچھا "کس کو گھور رہی ہو؟"

"کسی کو نہیں"، نور جہاں نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم برابر گھور رہی تھیں"، اس نے آہستہ سے کہا۔

"میری جان مت کھاؤ"، نور جہاں نے آہستہ سے اسی غصہ کے انداز

میں کہا۔

"حرافہ۔ رنڈی" سلطان حسین نے بہت ہی آہستہ کہا۔

وہ معمولی کپڑا بیچنے والوں کو بھی اس کا یار کہہ کر پکارتا۔ جو بھی اس سے ملتا وہ اسے اس کا یار کہتا۔ ذرا بھی غصہ آجاتا تو وہ اسے حرافہ۔ رنڈی کہہ کر پکارتا۔ بیوی کے ساتھ اس کا انداز گفتگو بہت ہی عامیانہ ہوتا ہے مگر غیر عورتوں سے وہ بڑے اخلاق سے پیش آتا ہے۔ بیوی بھی جب تنگ آکر اس سے اسی لہجہ میں گفتگو کرتی ہے تو یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا وہ اپنی بیوی کی پٹائی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

سلطان حسین یہ چاہتا تھا کہ وہ جب گھر میں داخل ہو تو نور جہاں ہنس کے اس کا استقبال کرے۔ اس کا موڈ دیکھ کر بات کرے۔ اس کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو اس مستعدی سے پیش کرے جیسے کوئی خادمہ اور بجز اس کے کہ بیوی زیادہ اچھے کپڑے پہنتی ہے زیادہ سلیقے سے بات کرتی ہے برابر بیٹھ کر کھانا کھاتی ہے اور اس میں اور نوکروں میں فرق ہی کیا ہے۔

وہ بیوی پر حق ملکیت کا قائل تھا۔ امریکہ کے تعلیم یافتہ انجینئر اور مہذب سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والے شخص کی فطرت میں یہ رجحان بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی اسے صرف کمینہ پن ہی کہا جا سکتا ہے۔

نور جہاں کے خلع لے لینے کے بعد وہ خدیجہ سے شادی کر لیتا ہے۔ خدیجہ گو نور جہاں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھی لیکن وہ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی "معاشی بندھن کچھ ایسا تھا کہ اسے دنیا میں ہر طرف سلطان حسین ہی سلطان حسین ہی نظر آتا تھا" نور جہاں پر حق ملکیت قائم نہ ہو سکتا تھا۔ خدیجہ اس کے اس حق کو بہ خوشی تسلیم کر لیتی ہے "وہ ایک انسان کے جسم اور روح کا مالک بننا چاہتا تھا۔ اور بن چکا تھا۔ نور جہاں کے ساتھ کے

زمانے اور نور جہاں کے خلع کے زمانے میں اس نے محسوس کیا تھا کہ ازدواجی تعلق کے باوجود نور جہاں اس طرح اس کی ملکیت نہیں تھی جیسے اس کا مکان اسکی زمین اس کی سمجھ سے یہ حقیقت بالاتر تھی کہ نسوانی حسن جسم کا ایک روحانی جوہر ہوتا ہے۔ جس کی تسخیر حکومت سے نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے والہانہ جذبے اور عقیدت سے جس میں محبت کرنے والے کو اپنی اغراض کا ہوش نہ رہے۔"

اس ناول میں جس نسوانی کردار پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے ـــــ وہ نور جہان ہے۔ اس کردار کی تشکیل میں مصنف نے وراثت اور ماحول کے اثر کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے وراثت کے مختلف اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔

نور جہاں، مشہور النساء اور سرتاج تینوں بہنیں ہیں۔ ان تینوں نے ایک ہی انداز کی تعلیم پائی۔ ایک ہی ماحول میں پلی بڑھیں۔ ان کے دادا مشہور الملک تھے اور نانا قابل جنگ، مشہور الملک اور قابل جنگ کی جھلک ان تینوں بہنوں میں مختلف درجوں اور مختلف امتزاج کے ساتھ نظر آتی ہے ان تینوں بہنوں کی شخصیت کو مصنف نے بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مشہور النساء کے مقابلے میں سرتاج کے کردار پر زیادہ توجہ اس لیے دی گئی ہے کہ اس کی اور نور جہاں کی فطرت میں جو تضاد نظر آتا ہے۔ اس کی بنا پر سرتاج کا کردار نور جہاں کے کردار کو واضح کر دیتا ہے۔ نور جہاں کے بارے میں لکھا ہے۔

"ایک طرف سے اسے اپنے اندر مشہور الملک کی میراث ملی تھی، ضبط، وقار عزت و عصمت کا۔ دوسری طرف قابل جنگ کی میراث۔ ذرا سا تکبر (مشہور النساء سے زیادہ مگر سرتاج سے بہت کم) ذرا سا تلذذ۔ آزادی، تبدیلی کھلی ہوا کی خواہش، جنسی آزادی کی سختی سے دبائی ہوئی خواہش اور مشہور الملک کی پوتی قابل جنگ کی نواسی سے زیادہ مضبوط اور ثابت قدم تھی۔ اس لیے اطہر کی جو کشش اس کے لیے تھی اسے ہر مرتبہ وہ گناہ کا خیال سمجھ کے اپنے

دل سے نکال دینا چاہتی تھی اس نے احتیاط کی ہر مرتبہ ضرورت سے زیادہ کوشش کی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ اطہر پر جنون سوار ہو رہا تھا۔"

ممتاز شیریں نے نورجہاں کی فطرت کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔" اس ناول کا مرکزی کردار نورجہاں کچی مٹی ہے جس طرح اسے ڈھالا جائے ڈھل سکتی ہے۔

نورجہاں کی زندگی خام مواد ہے جو ایک طرف وراثت اور دوسری طرف خارجی ماحول کے زیرِ اثر تشکیل پاتا ہے ...... نورجہاں کی زندگی کردار اسے نہیں بنتی۔ یہاں تک کہ اس کی سلطان حسین کے ساتھ ازدواجی زندگی کے چھوٹے سے المیے کی بھی وہ خود ذمے دار نہیں تھی بڑے قد کے کرداروں کا المیہ خود ان کے کردار سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ان کے کردار کے کسی خاص نقص سے۔ یہاں وہ نقص جس سے المیہ پیدا ہوتا ہے فرد کے کردار میں نہیں معاشرے میں ہے۔"

نورجہاں کے واقعہ کو المیہ سمجھنا بھی غلطی ہے۔ ممتاز شیریں نے اس واقعہ کی ذمے داری معاشرے پر ڈالی ہے۔ یہاں معاشرے کے زیادہ اہم نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس ناول کا موضوع ہی اس مخصوص... معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے کردار صرف ذریعہ ہیں غایت نہیں۔ اس ناول کے مختلف کردار اس معاشرے کی مختلف خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اب فرخندہ نگر کی زندگی کے ایک نہایت ہی اہم رکن کا حال بھی سن لیجیے۔ یہ ہیں راجہ راجایان شمشیر جنگ۔ یہ درحقیقت حیدر آباد کے مدار المہام سرکشن پرشاد شاد ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "طلسم مقناطیس و کہربا" کا ذکر بھی

کیا گیا ہے۔ اس میں کشن پلی کا منظر بالکل "فسانۂ عجائب" کی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے اس کتاب سے مراد "چنچل نار" یا کوئی اور تصنیف ہو جو مہاراجہ نے اپنے نام سے کسی اور سے لکھوائی ہو۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب تھی ان کا حال ملاحظہ ہو۔

"خدا جانے اِن آنکھوں کے پپوٹوں کے پیچھے اس دماغ کے خلیوں اور خانوں کے اندر کیا تھا۔ خان حضرت سے بے انتہا خلوص اور وفاداری، غریبوں کی پرورش اور فیاضی۔ اپنوں سے اخلاق، مصاحبین سے مروت اور دنیا کی ہر عورت کے لیے محبت، چھوٹی رانی کی ترچھی راجپوتی آنکھوں کے لیے محبت۔ ڈھیرنیوں کے لیے محبت۔ دوسروں کی بہو بیٹیوں کے لیے محبت، ماماؤں اور لونڈیوں کی میلی ساڑھیوں اور اوڑھنیوں سے محبت۔"

جہاں کے مدار المہام ایسے ہوں وہاں کے امراء بھی اگر ایسے ہی ہوں تو کیا تعجب کی بات ہے۔

سرکشن پرشاد اور علامہ اقبال میں بڑے مراسم تھے۔ جوش ملیح آبادی علامہ اقبال کا خط لے کر ان کی خدمت میں پہنچتے ہیں وہ اس خط کی بنا پر ان سے محبت سے پیش آتے ہیں جوش کا مختصر حلیہ کس قدر دلکش ہے یہ اس زمانہ کے جوش کا بڑا اچھا نقشہ پیش کرتا ہے۔

"نو وارد جو ذرا لاابالی سا آدمی تھا۔ اول جلول کپڑے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی صورت شراب خواروں کی سی مگر رندی کے ساتھ جلال و وقار اس نے اپنا نام بتایا شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی۔"

اس جاگیردار طبقہ میں ایسے مرد بھی ہیں جو اعتدال کے قائل ہیں ان کی زندگیاں کامیاب ہیں۔ البتہ ایسے لوگ نسبتاً کم ہیں۔ حیدر محی الدین عرف۔ جی آئی پی کا انجن جس کی رنگت اس کے طرف سے ظاہر ہو رہی ہے اسی قسم کا انسان ہے۔ اسے اپنی بیوی سرتاج سے بڑی محبت ہے سرتاج بھی حیدر

محی الدین کی بڑی وفادار ہے۔۔ بقول بعض یہ وفاداری زیادہ تر بیگر کی بنا پر ہے سرتاج اور نورجہان کا باپ سنجر بیگ انتہائی نیک انسان ہے بارے میں کوئی اسکینڈل مشہور نہیں ہے۔۔

حیدرآباد میں جاسوسوں کا جال بھی پھیلا ہوا تھا۔"اس زمانہ کا دستور تھا کہ خان حضرت کے جاسوس صاحب علی شان بہادر کے یہاں اور صاحب عالی شان بہادر کے جاسوس خان حضرت کے یہاں متعین رہے"۔ عزیز احمد نے ان ریشہ دوانیوں کی تفصیلات بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کی ہیں۔

محمد حسن عسکری نے اسے اردو کا پہلا اجتماعی ناول کہہ کر پکارا ہے سہیل بخاری بھی ان کے ہم خیال ہیں خود عزیز احمد نے اسے تجرباتی ناول کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ناول چاہے بقول عزیز احمد گالزوردی کے "صاحب جائیداد سے متاثر ہو یا ابسن کے "گڑیا کے گھر سے" مگر یہ مشابہت محض فارم کی حد تک ہے۔ اصل چیز وہ زندگی ہے جس کی پیش کش مصنف کے عمیق مشاہدے اور فنکاری کا ثبوت پیش کر رہی ہے اس اعتبار سے صرف "امراؤ جان ادا" کو ہی اس ناول پر فضیلت دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں تک اس انداز کا تعلق ہے اردو کا کوئی اور ناول اس سے ٹکر نہیں لے سکتا۔

نگری نگری پھرا مسافر

نثار عزیز بٹ

"نگری نگری پھرا مسافر" ایک عجیب وغریب بلکہ اب نارمل لڑکی کی کہانی ہے اس لڑکی کو بیک وقت دو دنیاؤں میں زندگی گزارتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ایک دنیا اس کے گرد وپیش کی دنیا ہے۔ جس میں اس کا سابقہ اس کے شعور سے پڑتا ہے۔ دوسری دنیا اس کے لاشعور کی دنیا ہے۔ اس کی زندگی کی باگ ڈور اس کے لاشعور کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے فیصلے ہمیں خلافِ عقل اور احمقانہ نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لاشعور کسی عقل اور کسی منطق کے تابع نہیں ہوتا۔ وہ شعوری طور پر جن کی تمنا کرتی ہے۔ جن کے قریب آنا چاہتی ہے۔ جب وہ اس کے قریب آجاتے ہیں اسے اپنانا چاہتے ہیں تو وہ خود انھیں اپنی توقع کے خلاف رد کر دیتی ہے۔ شاید وہ خود بھی نہیں جانتی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ میرزا ادیب نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے وہ زندگی بھر آدرش کی متلاشی رہی۔ اس آدرش پر اس کا کوئی بھی چاہنے والا پورا نہ اتر سکا۔

شاید اس کی وجہ مصنفہ کی سمجھ میں بھی نہ آئی ہو اس لیے کہ تخلیقی عمل چاہے وہ ناول اور افسانے ہی کا کیوں نہ ہو مکمل طور پر شعور کے تابع نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے اس کا ادراک افلاطون نے کیا سقراط نے مختلف شاعروں سے ان کے اشعار کا مطلب پوچھا مگر وہ بتانے سے قاصر رہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ شاعر جو کچھ کہتے ہیں وہ اپنے ذہن سے نہیں کہتے بلکہ ے زیرِ اثر کہتے ہیں جسے افلاطون نے شعر کی دیوی بتا تھا وہ دراصل لاشعور ہی ہے

ذرا انگار کے بچپن پر نظر ڈالیے۔ وہ نو دس مہینے کی تھی کہ اس کے ماں باپ ہیضے میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ اس کے بعد وہ نانی کے حوالے کی گئی۔ پانچ سال کی تھی کہ نانی بھی مر گئی۔ خالائیں پھوپھیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں اس کی پرورش اس کے رشتہ داروں کے لیے ایک مسئلہ بن گئی۔ کوئی اس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے دو چچا تھے" چار سال تک افگار ایک خالہ سے دوسری خالہ اور ایک چچا سے دوسرے چچا کے ہاں منتقل ہوتی رہی اور اس کی مستقل رہائش کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہر جگہ اس کے ساتھ یکساں بے نیازی کا سلوک ہوتا رہا۔ محبت کر کے کون گلے آفت ڈالتا! محبت اور شفقت اسے کہیں نہ مل سکی۔ خود ہی کپڑے بدلتی۔ کنگھی کرتی اور اسکول چلی جاتی۔

یہ زمانہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جب انسان کے کردار اور اس کی شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گرد و پیش کی دنیا سے کس قسم کے تعلقات اس کے ذہن میں جڑ پکڑ رہے ہوں گے۔

اس کے عزیزوں کا رویہ اس کی تعلیم کے سلسلے میں دو رخ اختیار کر سکتا تھا یا تو وہ بالکل نکمی ثابت ہوتی یا بہت ذہین۔ شاید یہ بھی انتقام کی ایک صورت تھی کہ اس کی تمام ذہنی صلاحیتیں اس سمت میں لگ گئیں اور وہ جس اسکول میں بھی جاتی جلد ہی جماعت میں چوٹی پر پہنچ جاتی۔

شاید ان حالات نے اس میں بے سہارا پن اور محرومی کا احساس پیدا کر دیا ہو اس کے ذہن میں یہ جاگزیں ہو گیا ہو کہ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ کسی سے وفا کی امید نہیں کی جا سکتی۔ کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

جب وہ ہوش سنبھالنے کی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی تو اسے

اپنے تمام خانہ زادوں اور چچازادوں میں سے صرف ایک انسان سے دلچسپی ہوئی وہ اس کے بڑے چچا احمد خان کا لڑکا منصور تھا۔ منصور کے لیے اس ناپختہ ذہن میں عجیب و غریب ملے جلے سے جذبات تھے۔ جلد ہی سارے خاندان کو اسکی پسندیدگی کا علم ہو گیا۔

اس کے چھوٹے چچا مراد خان کی بیوی پانچ سال کا ایک لڑکا چھوڑ کر مر گئی۔ مراد خان مستقل طور پر افگار کو اپنے ساتھ گھر لے آئے اس کے سال بھر بعد مراد خان دردانہ کو دلہن بنا کر لے آئے۔ شروع شروع میں دردانہ افگار سے کچھ کھنچی کھنچی رہی مگر بعد میں اس نے گیارہ سالہ افگار سے دوستی کر لی۔

فرصت کے اوقات میں افگار رسالوں سے اپنی پسند کے مضامین نقل کرتی رہتی تھی۔ کسی رسالے میں کوئی درد بھری کہانی مل جاتی تو "وہ گھنٹوں سسکیاں لیتی اور اس کا دل عظیم قربانیاں کرنے کو تڑپنے لگتا ہے"۔

اس نے ایک رسالے میں پڑھا "غم کی آگ میں سے روح کندن ہو کر نکلتی ہے" وہ خاموشی کے ساتھ منصور کی پرستش کرتی رہی۔ منصور کو وہ بہت بلند انسان سمجھتی تھی۔ منصور نے چند مہینے ان کے گھر میں گزارے تھے۔ اس کے بعد کالج سے منصور کے خط چچا کے نام آتے رہے" ان خطوط کے مضامین سے افگار کی محبت زدہ نظر نے منصور کا جو بت بنایا تھا وہ بہت مقدس بہت پاکیزہ تھا"۔ یہ مقدس بت ہر وقت تصور میں اس کے ساتھ گھومتا رہتا۔ بخار کی حالت میں بھی اس کا ذہن منصور ہی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ بخار کی حالت میں منصور سے باتیں کرتی رہتی۔

ایک دن اتفاق سے منصور چھٹیاں گزارنے اپنے چچا کے یہاں آ گیا اس نے اپنی حالت سنیاسیوں جیسی بنا رکھی تھی۔ افگار صرف دور ہی سے دیکھ کر تسکین محسوس کر لیتی تھی۔ سامنے آنے پر وہ بوکھلا جاتی۔ منصور اپنا زیادہ تر وقت تنہائی میں دریا کے کنارے گھومنے یا بیٹھنے میں گزار دیتا۔

منصور کے تیاگ سے اس کے بیراگ سے افگار کو عقیدت ہوگئی۔ اس کی محبت میں میں پرستش کا مادہ غالب تھا۔ اسے کبھی منصور کے پاس بیٹھنے یا اس سے باتیں کرنے کی خواہش نہ ہوتی۔ وہ تمنا کرتی کہ سنگھاسن پر منصور آنکھیں بند کیے بیٹھا رہے اور وہ ہاتھ میں پوجا کی تھالی لیے والہانہ آرتی کا رقص کرے اور رقص کرتے کرتے منصور کے قدموں میں جا گرے۔ منصور کو شاید احساس بھی نہ تھا کہ وہ افگار کے ہر لمحے پر چھایا ہوا ہے۔

تصور کی دنیا میں وہ منصور کو عجیب عجیب حالتوں میں دیکھتی "منصور کسی پہاڑی گپھا میں بیٹھا ہے اس کی آنکھوں میں رس ہے اُس کی پیشانی پر عظمت ہے۔ ہرنیاں دیوداسیوں کی طرح اس کے گرد رقص کر رہی ہیں!" یہی تصورات اس کے سکون کا باعث تھے۔

اس زمانہ کے واقعات بیان کرنے میں مصنفہ نے ہندی آمیز زبان استعمال کی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ ایسے علاقے میں رہ رہے ہیں جہاں تقسیم سے پہلے بھی ہندوانہ تہذیب غالب نہیں تھی۔ افگار سوچتی بھی ہے تو اسی زبان میں۔ اور انہی علامات کے سہارے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں "انہیں پیار کیے بغیر نہیں رہ سکتی مالک! پھر نہ کہنا تم مورکھ ہو......... تو خود ہی جھک کر مجھے اپنی شرن میں لے لے......... مالک افگار کی نظر میں ایک پوتر سی مورتی تھی"

ایک دن منصور نے افگار کو اپنے کمرے میں بلایا اور اپنے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح گویا ہوا "یہ بڑے دنیا دار لوگ ہیں خود تو خیر ان سے کچھ ہوتا نہیں ہے یہ اوروں کو بھی مایا میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی باتوں سے آپ نہ گھبرائیے۔ ہر بڑے یوگی کو ایسی ہی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے"

اپنی ہتھیلی کی طرف اشارہ کر کے کہا "بھگوان کی راہ اس سے بھی

پتلی اور خطرناک ہے "افگار گانا بھی گاتی ہے تو" ایک تیرا سہارا پر بھوجی ایک سہارا تیرا"۔ افگار اور منصور کے ذہن میں ایسے خیالات کا آنا اور بہند .... سنیاسیوں جیسی روش اختیار کرنا قطعی خلاف قیاس ہے ایسے خیالات ذہن میں اس وقت آتے ہیں جب گردو پیش اس قسم کا ماحول ہو اور ناول میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ نہ اس علاقے میں اس کا امکان ہے۔ اتنا اشارہ ضرور کیا گیا ہے کہ منصور کو کسی ہندو لڑکی پریتم سے محبت ہو گئی تھی پھر بھی اتنا رنگ چڑھنا خلاف قیاس ہے اور شاید پریتم لڑکیوں کا نام ہوتا بھی نہیں۔

افگار کو حرارت رہنے لگی تھی۔ منصور کئی دن تک اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا رہا۔ ایک خالہ نے اس کا ذکر کچھ مشکوک انداز میں دروازے سے کیا۔ افگار نے دوسرے دن ڈاکٹر کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اس دوران منصور کو بلانے کے لیے بڑے چچا کا خط آ گیا اور وہ چلا گیا۔

منصور کے جانے کے بعد افگار نے پرانا مشغلہ پھر شروع کر دیا یعنی رسالوں کو جمع کر کے ان میں سے اپنے پسند کے مضامین خوبصورت مجلد کاپیوں میں نقل کرنا۔ مگر اب مضامیں کی نوعیت بدل گئی تھی۔ منصور کی کاپیوں کے خشک پند و نصائح کی جگہ اب وہ ذرا جذباتی مضامین نقل کرنے لگی تھی۔

منصور کے جانے کے بعد وہ دل میں طے کر لیتی ہے کہ وہ کسی سے شادی نہیں کرے گی" اس نے اپنی زندگی خدا کی راہ میں گذارنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اب منصور کا بھی اس کی زندگی پر کوئی حق نہیں" افگار اس وقت مڈل کا امتحان دینے والی تھی گویا عمر ۱۳، ۱۴ سال ہو گی۔

اُس کے بعد افگار نے مضامین نقل کرنے کی بجائے خود لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ذہن پر بھی ہندو دیو مالا سوار ہے۔ تھوڑی دیر

دیر کے لیے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ منصور کو کسی ہندو لڑکی سے محبت تھی؛ اس لیے اس پر ہندوانہ رنگ چڑھ گیا مگر افگار کے سلسلے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ اس کا یہ اندازِ فکر قطعی خلاف قیاس نظر آتا ہے "افگار اچانک آنکھیں بند کر لیتی تو اسے محسوس ہوتا جیسے وہ بندرابن میں ہے جہاں اس کی کٹیا میں چمپا کے پھول کھلے ہیں۔"

افگار کے امتحان دینے کے بعد یاسمین اسے اپنے گھر لے گئی۔ کچھ دن بعد اتفاق سے منصور گھر آ گیا۔ اس نے ایک مہینے کے لیے چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا اسے جو کچھ کہنا ہوتا کاغذ کے پرزے پر لکھ کر دے دیتا۔

ایک دن منصور نے افگار کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ گئی تو اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں محصور کر لیا۔ افگار بغیر احتجاج کے خاموش اور بے حس کھڑی رہی۔ منصور نے اسے اپنی جانب دیکھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے مشین کی طرح آنکھیں اٹھا کر منصور کی آنکھوں میں ڈال دیں اس کے بعد منصور اسے چھوڑ کر کمرے کا دیوانہ وار چکر لگانے لگا تو افگار آہستہ سے اوپر چڑھ کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

اس کے دوسرے دن منصور گھر سے نکل گیا۔ جب تک منصور گھر میں رہا۔ افگار ڈرتی رہی کہ " وہ ساری بندیاں چھوڑ چھاڑ کہیں اسے بھی عادی محبت کی عمومیت میں گھسیٹ کر عام گھریلو زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ کر دے" افگار کے خیال میں منصور روحانی بلندیوں کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔ منصور سے اس کی عقیدت اور بڑھ گئی۔

کرسمس کی چھٹیوں میں افگار پھر بڑے چچا کے گھر گئی۔ ایک دن بعد احمد خان منصور کو لیے گھر میں داخل ہوا۔ منصور اس شرط پر گھر واپس آیا تھا کہ اس کی شادی افگار سے ہو۔ منصور نے افگار کو اپنے کمرے میں لا کر خود اس سے اپنا ارادہ ظاہر کیا قرینِ قیاس تو یہی تھا کہ افگار

خاموش رہتی اور اپنے دیوتا کی خواہش کے آگے سر جھکا دیتی مگر اس نے کہا "مجھے پھانسی کر دیں مگر ایسی باتیں نہ کریں"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اچھوتی زندگی گزارنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ منصور نے اس کا غیر متوقع جواب سن کر بھی اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ انکار کی وجہ پوچھنے پر افگار نے کہا "میں نے اپنی زندگی خدا کی راہ میں وقف کر دی ہے۔ مجھے اب اس پر کوئی اختیار نہیں رہا"

افگار منصور کو بے انتہا پسند کرتی تھی۔ خدا کی راہ میں زندگی گزارنے کا تصور مسلمانوں میں نہیں ہے صرف عیسائیوں میں ہے۔ مگر وہاں بھی ننیں بعض اوقات جبلت جنس کے ہاتھوں مجبور ہو کر خانقاہیں چھوڑ بھاگتی ہیں۔ افگار کا یہ رویہ قطعی خلاف فطرت۔ خلاف قیاس اور محض تخیلی ہے۔

افگار کے انکار کے باوجود احمد خان، زینب اور منصور مراد خان کے گھر گئے۔ زینب نے پیغام دیا۔ انکار کا سوال نہ تھا۔ لہٰذا یہ لوگ اپنی... دانست میں منگنی کر کے واپس لوٹ آئے۔

اس کے بعد افگار کی طبیعت خراب رہی۔ بایاں پھیپھڑا ٹی۔بی سے متاثر ہو چکا تھا لہٰذا اسے سینی ٹوریم میں داخل کروا دیا گیا

یہاں اس کی ملاقات ایک خوبصورت اور زندہ دل لڑکی اجیارا سے ہوئی جو عمر میں اس سے کچھ بڑی تھی۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی مگر اسے ایک اور شادی شدہ انسان اعظم سے محبت تھی۔ وہ ٹوٹ کر محبت کرنے کی قائل تھی انجام کے بارے میں سوچے بغیر۔ افگار اور اجیارا میں اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا پورا نام لینے کے بجائے افگار اسے "اجی" کہتی ہے اور اجیارا اسے "افی" کہتی ہے۔

افگار کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں "اس کی زندگی کے تمام جذبات کے ساتھ محبت کے جذبات بھی زیر زمیں چلے گئے تھے

محبت میں اس کا رویہ اس نوٹس بورڈ کی طرح تھا جس کے سامنے والے حصہ پر ہمیشہ "نہیں" لکھا ہو۔

سینی ٹوریم میں افگار کو عرفان کی "سرِ راہ" پڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔۔ یہ کتاب اسے عرفان نے پیش کی تھی ۔ عرفان اس میں بہت دلچسپی لیتا تھا مگر "عرفان سے اسے صرف ہمدردی تھی محبت نہیں"۔

یہاں ایک نرس مس سندرداس بھی اس کے کافی قریب آجاتی ہے وہ اسے اور اجیارا کو سینی ٹوریم کے ڈاکٹروں کے خصوصاً ڈاکٹر زبیری کے قصے سناتی ہے۔

افگار اجیارا کو اپنا قصہ سناتے ہوئے کہتی ہے۔ "لیکن میں خوش کبھی نہیں رہ سکی اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں؟........ میں نے ہمیشہ المناک کتابیں پڑھی ہیں اور رو رو کر لطف حاصل کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی ہر چھوٹی تکلیف کو بڑھا چڑھا کر اپنی مظلومیت کا خط اٹھایا ہے" وہ اپنی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہتی ہے "اب مجھے محبت چاہیے صرف محبت.....میں چاہتی ہوں کوئی مجھ سے محبت کرے انمٹ اتھاہ محبت۔ جس سے میری جنم جنم کی بھوک مٹ جائے" اس کی آنکھوں میں عرفان کی تصویر جھلکی لیکن وہ تو اسے کبھی کا بھول چکا ہوگا۔ پھر ڈاکٹر زبیری کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے آیا "اجی! میں کیا کروں مجھے کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ کبھی میں چاہتی ہوں مجھے کسی سے پاگل پن کی حد تک پیار ہو جائے"

اسے کئی چاہنے والے پسند بھی آئے مگر وہ کسی سے محبت نہ کر سکی مگر کیوں؟ اس کا جواب اس ناول میں نظر نہیں آتا۔

عرفان کا افسانہ پڑھ کر اسے عرفان کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے سوچا اسے عرفان سے محبت ہو گئی ہوتی۔ اجیارا کے بھائی نعیم کے لیے بھی اس کے دل میں یہی تمنا پیدا ہوتی ہے کہ نعیم اسے پسند آجائے اور نعیم اسے پسند کر

ے لیکن اس محبت کرنے اور کیے جانے کی تمنا کے باوجود وہ کسی سے محبت نہ کر سکی۔

سینی ٹوریم کے قصے میں ڈاکٹروں کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔ دو ڈاکٹر خاص طور سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر بدر جو اپنی مہارت، توجہ اور ہمدردی کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ڈاکٹر زبیری جو لڑکیوں کو پھانسنے میں ماہر ہیں مگر ان کا طلسم جلد ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

افگار کا مرض ٹھیک ہو گیا اور اسے چھٹی ملنے ہی والی تھی۔ اس دوران میں اسے عرفان کے دو خط ملے۔ عرفان کا خیال اس کے ذہن میں کمزور پڑ چکا تھا البتہ نعیم کے بارے میں وہ زیادہ سوچنے لگی تھی۔ ان دونوں کا آمنا سامنا ہوتا رہا مگر یہ ملاقاتیں محبت کا رنگ نہ اختیار کر پائیں۔

افگار اور دردانہ کو مذاق سوجھا کہ مشہور کر دیا جائے کہ افگار کی منگنی کسی اور جگہ ہو گئی ہے پھر دیکھا جائے کہ منصور پر کیا گزرتی ہے۔ خلاف امید یہ مذاق کارگر ہو گیا اور منگنی ٹوٹ گئی

منصور کی منگنی اس کی والدہ نے کسی اور جگہ کر دی مگر وہ افگار کو برابر خط لکھتا رہا کہ "خدارا میرے ساتھ شادی کر لو" اس کا پڑھائی سے جی اچاٹ ہو گیا۔ "پہلے جو لوگ اسے دیوانہ کہتے تھے اب کریک کہنے لگے اور افگار جو بڑے عرصے تک عادتاً محبت کیے جا رہی تھی بالآخر لوگوں کے ساتھ مل کر اس پر ہنسنے لگی"۔

منصور جسے افگار تیاگ اور تپسیا کی علامت سمجھتی تھی جسم اور غیر جسم کی کشمکش میں جسم کے تقاضوں سے شکست کھا گیا۔ چند ہی سال میں وہ شخص دنوں کھانا نہیں کھاتا تھا اور چالیس چالیس میل پیدل چلتا تھا بے شمار کرداری کمزوریوں کا ایک مضحکہ خیز مجموعہ بن کر رہ گیا۔ رشتے دار لڑکیوں سے مذاق۔ نوکرانیوں میں دلچسپی۔ یہ سب کمزوریاں آہستہ آہستہ اس کے

کردار میں ابھرنے لگیں۔" منصور کی اس تبدیلی کی کسی حد تک افگار بھی ذمہ دار تھی۔ ٹھکرائے ہوئے انسان کا یہ رویہ ہرگز خلافِ فطرت نہیں تھا۔ بہرحال رفتہ رفتہ دونوں میں فاصلہ بڑھتا گیا۔

سینی ٹوریم میں افگار نے اجیارا کے بھائی نعیم میں دلچسپی لینی شروع کی۔ بظاہر نعیم بھی افگار میں کسی حد تک دلچسپی لیتا تھا مگر جیسا کہ میں نے کہا یہ دلچسپی محبت کا روپ اختیار نہ کر سکی۔ لہٰذا یہ دونوں بھی تھوڑے سے قریب آئے مگر دونوں میں سے کسی طرف سے بھی بیتابی اور تڑپ کا مظاہرہ نہ ہوا اس لیے یہ دونوں بدستور اپنے اپنے راستے پر چلتے رہے۔

افگار صحت مند ہو کر گھر چلی آئی۔ گھر آنے کے کچھ دن بعد اسے پھر حرارت رہنے لگی اس کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا اس لیے اسے کچھ عرصہ بستر پر آرام کرنا پڑا۔ اس دوران میں وہ مطالعہ کرتی رہی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ آرام کرنے سے پانی خود بخود خشک ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اسے دوبارہ سینی ٹوریم میں داخل ہونا پڑا۔ اور پرانی سہیلیاں رفعت اور اجیارا پھر مل گئیں۔

محبت کے سلسلے میں اجیارا اور افگار کے رویوں کا فرق ایک بار پھر سامنے لایا جاتا ہے۔ اعظم اور اجیارا میں طے ہوتا ہے کہ رات کے وقت اعظم اجیارا سے ملنے اس کے کمرے میں آئے گا۔ اجیارا افگار کو چوکیداری پر مامور کرتی ہے۔ افگار ڈرتی ہے کہ کسی کو پتہ چل جائے گا مگر اجیارا نتائج کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ حالانکہ یہ کس قدر خوفناک تصور تھا کہ کوئی مرد کسی لڑکی سے سینی ٹوریم کے کمرے میں ملنے آئے۔ اتفاق سے اعظم نہیں آپایا۔ اجیارا کو بڑا دکھ ہوتا ہے وہ چلا چلا کر افگار سے کہتی ہے کہ وہ کسی طرح اعظم کو بلا دے۔

چند دن رہ کر افگار گھر آ گئی۔ اس کے عزیزوں سے اس

کے لیے پیغام آئے مگر اس نے یہ بہانہ بنا بنا کر انکار کر دیا کہ وہ مکمل طور پر تندرست نہیں ہے اس لیے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی وہ اپنی پڑوس کی سہیلیوں شاہدہ اور جمیلہ کے ساتھ سیر کو چلی جاتی اور دونوں لڑکیوں کے ساتھ اس کی زندگی میں بھی تھوڑی سی دیر کے لیے خوشی کی لہر دوڑ جاتی

سینی ٹوریم سے اجیارا کو بھی چھٹی مل گئی۔ وہ نعیم کو لے افگار سے ملنے اس کے گھر آئی۔ افگار سے نعیم کی ایک آدھ رسمی سی بات بھی ہوئی اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ اس طرح نعیم اب افگار کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے دور چلا گیا۔

افگار کے رویے کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا جاتا ہے "اگر اسے یہ یقین ہو سکتا کہ اس کے ذہن میں اس کی یاد میں نعیم یا عرفان یا کوئی اور ہمیشہ کے لیے جم کر رہ جائے گا تو وہ زمان و مکان و حالات کی چنداں پرواہ نہ کرتی۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ افراد سے زیادہ وہ ایک آدرش کی دھن میں محو ہے اور وہ آدرش اپنی رو میں بالآخر اسے ہر فرد سے دور لے جاتا ہے"

ڈاکٹر کی اجازت سے اس نے کتابیں سنبھالیں۔ اسے راتوں کو نیند آتی تو پڑھی کتابوں کے واقعات ذہن میں الٹتے پلٹتے۔ اس نے لاہور جا کر دوبارہ تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ گھر والوں نے مخالفت کی مگر ڈاکٹروں نے اجازت دے دی اور وہ لاہور پہنچ گئی۔ یہاں وہ لڑکیوں کے ایک اور گروہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ ان میں اس کے سب سے زیادہ قریب نور ہے جو دو سال تک ذہنی ہسپتال میں رہ چکی ہے اسی کے توسط سے عرفان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر نور اور عرفان کے باہمی تعلق کی نوعیت سمجھ میں نہیں آتی۔ ان میں کافی بے تکلفی ہے مگر جذبات سے عاری۔

افگار کا بھائی نوید بھی ہوسٹل چھوڑ کر افگار کے ساتھ رہنے کے لئے

آجاتا ہے۔ ایک دن نور، سائرہ، تنویر، فریدہ اور افگار پکنک منانے کے لیے لارنس گارڈن جاتی ہیں۔ سائرہ نے چپکے سے عرفان کو بھی اطلاع دے دی تھی چنانچہ وہ بھی آن پہنچا۔ خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ کھیل کے ساتھ گرم گرم فقروں کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔

عرفان نچلے متوسط گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اسکول کی تعلیم ختم کی اور والدین سے بغاوت کر کے شہر کی خاک چھاننے آ رہا۔ فاقے کیے، ٹھوکریں کھائیں، بالآخر مذہب خدا اور معاشرے سب سے باغی ہو گیا۔ اتفاق سے فرخی کی ٹیوشن مل گئی اور اس طرح نور سے متعارف ہوا۔ نور سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ مگر عشق افگار سے ہوا۔ اب اس نے افگار کے گھر آنا شروع کر دیا۔ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ افگار کو محسوس ہوا کہ اس کے پڑوسی ان ملاقاتوں کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر ایک دن اس نے عرفان سے کہہ دیا کہ وہ اس سے نہ ملا کرے۔

افگار کے دو تین ہفتے سکون سے گزرے ایک دن دروازے پر دستک ہوئی اور عرفان اس حالت میں داخل ہوا۔ "عرفان آ کر آرام کرسی پر گر گیا۔ اس کا رنگ بالکل سپید ہو رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میلوں پیدل چل کر آیا ہو۔"

اس نے افگار سے کہا "میں آپ کی بات نہیں مان سکتا سنتی ہیں آپ۔ بعض چیزیں انسان کے اپنے بس سے باہر ہوتی ہیں۔" عرفان کے اصرار پر اس نے کہا "یہ سارا قصور میرا ہے کیوں میں آپ سے ملتی رہی کیوں میں نے وقتی رفاقت حاصل کرنے کے لیے آپ کو اتنے دکھ میں ڈال دیا۔ مجھے کیسے معلوم ہوتا کہ کیا ہو جائے گا۔

عرفان اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اسے طرح طرح

۔ ہی آخر کار عرفان چلا گیا۔ مگر اس کی حالت اور اس کا

استقلال دیکھ کر افگار کے دل میں اس کے لیے درد اٹھا وہ اس سے مرعوب ہوگئی۔

افگار سمجھتی تھی اب عرفان نہیں آئے گا۔ مگر دوسرے ہی دن وہ پھر آگیا اس کے بال گرد میں اٹے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ عرفان کے پوچھنے پر نہ یہ کہہ سکی کہ وہ اس کی ہے نہ یہ کہہ سکی کہ وہ عرفان سے نفرت کرتی ہے۔

دوسری صبح عرفان پھر موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ گھر گیا ہی نہیں تھا۔ رات بھر سڑکوں پر چلتا رہا اور پیتا رہا۔ وہ کسی طرح افگار کو بھولنے اور چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ افگار نے آخری ہتھیار استعمال کیا۔ "آپ کو عزت کی روایت کا کچھ خیال نہیں۔ میری بدنامی ہوتی رہے۔ آپ کو کچھ احساس نہیں ہوتا" یہ ہتھیار کارگر ہوگیا۔ اس دن کا گیا عرفان پھر واپس نہیں آیا۔ صرف ایک دفعہ اس کا خط آیا پورے صفحہ پر صرف ایک شعر لکھا تھا وہ اُن کے حلقے سے بھی دور ہوگیا۔ نور کو بھی تعجب ہوا کہ عرفان کہاں چلا گیا۔

اس کی طویل غیر حاضری سے وہ افگار کو یاد آنے لگا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ عرفان سے ملے مگر تنہائی میں نہیں سب کی موجودگی میں۔" پھر وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ کہیں اسے عرفان سے محبت تو نہیں ہو رہی ایک لاشعوری علم کے باوجود کہ وہ اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر دھوکا دے رہی ہے۔ وہ اس شبہے کو جڑیں پکڑتا دیکھ کر خوش ہو جاتی۔"

اس کے بعد وہ کتابوں سے اکتا کر نادرہ کے گھر چلی گئی اور "وار اینڈ پیس" میں منہمک ہوگئی اور جنگ مذہب اور عقل کے فلسفہ پر غور کرتی رہی۔

اجیارا کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہ نادرہ کے گھر سے آئی تو

اسے اپنے کمرے میں اجیارا نظر آئی ۔ وہ اجیالا سے کہتی ہے ” میں چاہتی ہوں کہ مجھے کسی کی ذات سے محبت ہو سکے اتفاقیہ غیر یقینی جذبوں سے نہیں “ شاید افگار کا المیہ یہی رہا ہے ۔

عرفان نے دوستوں کے سمجھانے پر ڈھا کہ میں ریڈیو کی نوکری قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا وہ کئی دن تک افگار کی کھڑکی کے باہر کھڑا رہا مگر افگار نے ادھر دیکھا تک نہیں ۔ بہر حال چند دن بعد وہ نظر نہیں آیا ۔

عرفان کی طویل غیر حاضری سے افگار نے اپنے دل میں اس سے ملنے کے لیے ایک بے چینی سی محسوس کی ۔ اس نے بہت رکتے رکتے نور سے اس صورت حال کا ذکر کیا ۔ نور کو عرفان نے پہلے ہی بتا دیا تھا ۔ آخر کار نور کے توسط سے یوسف کے اسٹوڈیو میں اس کی ملاقات ہو گئی ۔ عرفان نے افگار سے کہا ” خط لکھیں گی “ افگار نے نفی میں سر ہلا دیا عرفان کے اصرار پر کہ آپ کو لکھنا ہو گا ۔ اس نے پھر انکار کر دیا ۔ بہر حال مایوس ہو کر عرفان اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلا گیا ۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جب عرفان اس شدت سے محبت کرتا تھا افگار کے دل میں بھی اس کے لیے ہمدردی تھی ۔ افگار کو اس کی محبت کی سچائی کا بھی یقین تھا ۔ پھر اس کے مزید قریب آنے میں کیا چیز مانع تھی ۔ وہ آخر کیا چاہتی تھی ۔ ایک نوجوان لڑکی کا آدرش اور کیا ہو سکتا ہے ؟ اس مقام پر افگار کا رویہ قطعی خلافِ فطرت نظر آتا ہے ۔ اگر کوئی ایسی لڑکی یہ رویہ اختیار کرے جو ایک آدھ مرد سے دھوکا کھا چکی ہو تو پھر بھی اس کا جواز پیدا ہو سکتا ہے مگر یہاں یہ بات بھی نہیں ہے ہمیشہ افگار ہی پیچھے ہٹی ہے اس کی وجہ اگر

خود کو ایذا پہنچانے کا جذبہ کہا جائے تو یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

میجر عابد اس کی زندگی میں آنے کی کوشش کرتا ہے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے عابد کے کالج میگزین میں چند مضامین پڑھے تھے اور وہ اس کے علم سے مرعوب ہوئی تھی۔ اسے پتہ چلا تھا کہ عابد اسے بڑی سنجیدگی سے پسند کرتا ہے۔ مگر جب عابد کا پیغام آیا تو افگار نے بغیر ہچکچائے انکار کر دیا۔ عابد نے یہ انفرادیت دکھائی کہ بڑی تمکنت سے افگار کا انکار قبول کر لیا۔

عابد کی شادی ہو گئی مگر کچھ عرصہ بعد اس کی بیوی مر گئی۔ اس لیے اس نے پھر افگار سے سلسلہ جنبانی کی۔ عابد نے خط لکھا تو افگار نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ الفت بھابی اپنے بھائی عابد کا پیغام لے کر آئی۔ اس مرتبہ دردانہ کی طرف سے سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ افگار اس مخالفت کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ وہ عابد سے ملنا چاہتی تھی مگر دردانہ اس کے لیے تیار نہ تھی۔

اتفاق سے نور اس کے گھر آئی۔ افگار نے اس سے پوچھا کہ وہ عابد سے کس طرح ملے۔ ایک دن عابد اچانک ان سے ملنے آ گیا۔ وہ ان سے گھل مل گیا۔ نور نے رائے دی کہ عابد برا نہیں ہے "ایسے شخص اچھے ہوتے ہیں جو ہر لحاظ سے درمیانے ہوں۔"

نو مدانی سے واپسی پر عابد کا خط آیا کہ وہ کب اپنے گھر آ رہی ہے اس دوران میں نتیجہ نکلا اور افگار امتحان میں اوّل آئی۔ عابد نے سنا تھا کہ افگار صحت کی بنا پر دو تین سال انتظار کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس کے لیے تیار تھا مگر گھر والوں کے اصرار پر اس سے پوچھ رہا تھا۔ عابد کو افگار کے گھر والوں کی مخالفت کا علم تھا وہ چاہتا تھا کہ

افگار اس سلسلے میں اس کی مدد کرے ۔ افگار اس بات پر چڑھ گئی ۔ وہ ایم ایس سی میں داخلہ لینے لاہور جانے کی تیاریاں کر رہی تھی ۔ اتفاق سے عابد آ گیا ۔ وہ گھر میں اکیلی تھی ۔ دونوں میں چند غیر نتیجہ خیز باتیں ہوئیں پھر نوین آ گیا اور باتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ افگار نے دوسرے دن اسے خط لکھا کہ "مجھے تو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ آپ اپنے خاندان سے دست بہ گریبان ہوں اور میں اپنے آپ ہر اچھی پڑھی لکھی لڑکی کے ساتھ گزارہ کر لیں گے اس لیے یہ معاملہ ختم کر دینا چاہیے ۔" اس طرح عجیب غیر فطری اور بے تکے انداز میں یہ معاملہ ختم ہو گیا ۔ لڑکیاں اگر کسی کو پسند کرتی ہیں تو اس طرح معاملہ ختم نہیں ہونے دیتیں اور پھر افگار تو ضدی لڑکی تھی ۔

اس کے بعد اس نے ایم ایس سی کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن روانہ ہو گئی اسے کیمبرج میں داخلہ ملا تھا ۔ لندن جانے والے مسافروں میں ایک صاحب کو نوین جانتا تھا ۔ اس نے ان سے یعنی کمال انور سے اس کا تعارف کروایا ۔ جہاز میں وہ نیم فلسفیانہ قسم کی باتیں کرتے ہیں ۔ جن سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا ۔

اس کتاب کا قصہ کافی مختصر ہے ۔ مصنف نے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے ۔ جو حد درجہ ابنارمل ہے ۔ اس میں عجیب و غریب نفسیاتی الجھنیں ہیں جن کی طرف نہ واضح اشارے ملتے ہیں نہ ان رویوں کا کوئی جواز نظر آتا ہے ۔

میرزا ادیب اس کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "اردو میں بہت کم ایسے ناول لکھے گئے ہیں جنہوں نے ہمیں اس قسم کے عظیم کردار دیے ہوں ۔" انھوں نے اسے اپنی نوعیت کی پہلی تخلیق کہہ کر پکارا ہے یہ درست ہے کہ اس سن اشاعت یعنی ۱۹۵۴ء تک اچھے ناول کم لکھے گئے تھے ۔ نام نہاد تاریخی ناولوں نے قارئین کا ذوق اس قدر بگاڑ دیا

کہ لوگ سنجیدہ ناولوں کی طرف توجہ دینے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔

میرزا ادیب کو تعجب ہوا ہے کہ نثار عزیز کی مادری زبان اردو نہیں ہے اور وہ ریاضی جیسے خشک مضمون کی پروفیسر ہیں اس کے باوجود انھوں نے ایسی خوبصورت نثر لکھی ہے۔ ہمارے یہاں کئی سائینس والوں نے اعلیٰ درجہ کی شاعری کی ہے۔ ریاضی اور ادب کی یک جائی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس کتاب میں جس قدر مصنفوں اور شاعروں کے نام ملتے ہیں مثلاً۔ ہارڈی۔ سمرسٹ مام، جین آسٹن، ڈکنز۔ گالزوردی آرنلڈ بینیٹ جارج ایلیٹ، ٹالسٹائی گورکی وغیرہ اور شاعروں میں شیکسپیئر۔ کیٹس۔ شیلے ٹیگور، براؤننگ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس مصنفہ نے اتنی کتابوں کو اپنے ذہن سے گزارا ہو ادبیت کا اس کی روح میں رچ بس جانا ایک قدرتی بات ہے۔

کتاب کی ہیروئین "گیتا" اور "وار اینڈ پیس" وغیرہ سے زندگی میں رہنمائی حاصل کرتی ہے اور کئی ہیروئنوں سے ہم آہنگی محسوس کرتی ہے۔

مصنفہ پر ٹیگور کی شاعرانہ نثر کا بھی کافی اثر نظر آتا ہے۔ اس میں جابجا انشاء پردازی کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔ اس کے کئی حصے اچھے خاصے انشائیے نظر آتے ہیں۔ اس کی ضخامت میں زیادہ حصہ انہی اجزاء کا ہے ورنہ اس کا اصل قصہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس میں لایعنی بحثیں بھی ہیں۔ کبھی خدا کے وجود پر۔ کبھی مذہب پر۔ کبھی دعا کی نوعیت پر کبھی کسی معمولی بات پر۔ ان بحثوں کو خواہ مخواہ فلسفیانہ رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس ناول کے مرکزی کردار کے نام پر اگر آپ غور کریں تو

یہ ایک علامتی نام نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ زخم خوردہ نظر آتی ہے۔ بہت ممکن ہے غیر شعوری طور پر مصنف نے یہ نام منتخب کر لیا ہو۔ بہر حال یہ نام نذیر احمد کے علامتی ناموں سے مختلف ہے اس میں وہ یدنمائی نہیں ہے جو ابن الوقت۔ جاں نثار نصوح اور ظاہر دار بیگ وغیرہ میں نظر آتی ہے۔

خونِ جگر ہونے تک

فضل احمد کریم فضلی

فضلی نے بقول خود بیس سال بنگال میں گزارے ہیں یعنی ملازمت کی تقریباً دو تہائی مدت۔ اسی دوران میں وہ مختلف اضلاع میں متعین رہے اس طرح انہیں بنگال کی زندگی کو جامعیت کے ساتھ اور بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔

بنگال برِصغیر کا ایک عجیب و غریب علاقہ ہے۔ انتہائی خوبصورت مناظر سے مالا مال۔ تالاب، دریا، لہلہاتے ہوئے کھیت معلوم ہوتا ہے ساری فضا پر موسیقیت طاری ہے مگر یہ صرف وہاں کا ظاہر ہے۔ سال میں تین فصلیں پیدا کرنے والا بنگال اکثر قحط کی زد میں رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگال دنیا کے انتہائی گنجان آباد علاقوں میں سے ہے۔ جس زمین کو سیلاب بہا کر لے جاتے ہیں، لوگ اس پر پھر آباد ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ سب سے زرخیز دہی علاقہ ہوتا ہے۔ پیداوار اور آبادی کا تناسب وہاں کبھی بھی خوش گوار نہیں رہ سکتا۔ ہمارا زرعی اور معاشی نظام بہت بڑی حد تک وہاں کی بھوک اور افلاس کا ذمہ دار ہے۔

فضلی نے یہ ناول وہاں کے مناظر پیش کرنے کے لیے نہیں لکھا بلکہ ان کے زمانہ میں جو زبردست قحط پڑا تھا اور اس قحط کے دوران جن حالات سے انھیں سابقہ پڑا تھا اسے پیش کرنے کی خاطر انھوں نے ناول کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اتفاق سے وہ اس علاقہ میں متعین

تھے جہاں قحط کی تباہ کاریاں انتہائی شدید تھیں۔ وہ حاکم ضلع تھے جس دردمندی کے ساتھ انھوں نے اس قحط کے حالات لکھے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یقیناً اسی طرح لوگوں کی خدمت کی ہو گی جس طرح اس ناول میں مجید صاحب نے انجام دی ہیں۔ اس ناول میں فضلی مرحوم خود مجید صاحب یا موزید شاب کے روپ میں جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ غزل کے پیرایہ میں ہر بات کہی جا سکتی ہے مگر غزل کے اشارے کنایوں کو سمجھنے کے لیے جس عقل مندی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس بیوکریسی میں نہیں تھی جسے فضلی صاحب بنگال سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ اندھے بھی تھے اور بہرے بھی۔ انہیں بات کو کھل کر کہنا تھا اس لیے انھوں نے ناول کا میڈیم اختیار کیا۔

فضلی بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ عموماً غزل گو دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ SENSUOUS ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی غزل گو میں تخلیقی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان دونوں صلاحیتوں سے انھیں اس ناول کی تیاری میں بڑی مدد ملی۔

فضلی صاحب نے لکھا ہے کہ اس ناول کے واقعات مدتوں ان کے تحت الشعور اور لاشعور میں ڈوبتے ابھرتے رہے اور ان میں کانٹ چھانٹ اور تہذیب و تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر یہ انتظار درمیان میں نہ آتا تو ناول کو یہ پختگی نصیب نہ ہوتی۔

انھوں نے اپنے کردار یعنی کہانی کی نمائندگی کرنے والے افراد مختلف علاقوں سے منتخب کیے اور انھیں ایک ضلع میں لا کر جمع کر دیا۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں ناول کے فن پر عبور حاصل ہے

ناول بہرحال فکشن ہوتا ہے اسے حقیقت اگیں ہونے کے باوجود مکمل طور پر واقعاتی اور وقوعی نہیں ہونا چاہیئے۔

ر کتاب کے آخر میں جو اختتامیہ سپرد قلم کیا گیا ہے اس میں کئی باتیں غور طلب ہیں لکھتے ہیں"۔ مصنف نے قصّہ کی تربیت، تکنیک، اسلوب زباں و بیاں کے چند نئے تجربے کیے ہیں"۔ اس سے پہلے لکھا ہے۔ "مصنف کو غزل محبوب ہے۔ اتنی کہ اس نے ناول میں بھی غزل کی تکنیک استعمال کرنے کی کوشش کی ہے ناول کے متداولہ شرح وبسط کو نظرانداز کر کے غزل کے ایجاز واختصار، اشاریت اور ایمائیت سے کام لیا گیا ہے۔ .... اسی لیے شائد اس ناول میں بھی غزل کے اشعار کی طرح معنی کی تہیں نظر آئیں۔ اگر مصنف یہ طریقہ کار اختیار نہ کرتا تو ناول کی ضخامت دگنی تگنی ہو جاتی"۔

غزل کی تکنیک کا انداز مصنف نے شعوری طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آٹھویں باب کی ابتدا اس طرح کی ہے"۔ بنگال کی زندگی بالکل غزل بنی جا رہی تھی۔ میر کی غزل۔ بادی النظر میں بے ربطی بھی تھی سادگی بھی مٹھاس بھی۔ لوچ بھی۔ ترنم بھی"۔ اس باب میں بنگال کی جو حالت بیان کی گئی ہے وہ میرؔ کی غزل کے بجائے مرثیہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

تیرھویں باب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے "۔ بنگال کی فضا غزل تو اب بھی بنی ہوئی تھی مگر اب میرؔ کی غزل کی جگہ حافظ کی غزل لے رہی تھی"۔

غزل کے ان حوالوں سے فضلی مرحوم خود بھی دھوکا کھا گئے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے بھی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی جیسے نقاد بھی اس مغالطے میں آجاتے ہیں۔ ان کے نزدیک غزل سے مشابہت

کی ایک وجہ اس کی ابتدا اور اس کا اختتام ہے ابتدا بھی جعدار کے چوہیا مارنے کے واقعہ سے ہوتی ہے اور اختتام بھی۔ اسے ڈاکٹر فاروقی غزل میں ردیف کی تکرار سے تشبیہ دیتے ہیں۔ دراصل یہ انداز غزل کا نہیں بلکہ ترکیب بند کا ہے اور پھر یہ مشابہت صرف خارجی ہے۔ آخر میں اس واقعہ کا اعادہ زبردستی کیا گیا ہے محض غزل کی تکنیک کا رنگ دینے کی خاطر ورنہ ناول کو اس سے پہلے ہی ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔

اس کے علاوہ بقول مصنف اس میں غزل کے ایجاز و اختصار اشاریت اور ایمائیت سے کام لیا گیا ہے ورنہ اس کی ضخامت دگنی تگنی ہو جاتی۔ پہلی بات تو یہ کہ اس ناول میں ناول کی عام قصہ گوئی والی تکنیک ہی استعمال کی گئی ہے اور واقعات کی ترتیب۔ دروبست جس طرح ہمارے سامنے لائی گئی ہے وہ اس سے زیادہ ضخامت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اگر مصنف اسے طول دیتے تو اس کی تنظیم ڈھیلی اور کمزور ہو جاتی اور اس طرح وحدت تاثر میں کمی آجاتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس اختصار کے باوجود فضلی نے انشاء پردازی کا شوق پورا کرنے کے مواقع نکال لیے ہیں۔ مثال کے طور پر چوتھے باب کی ابتدا میں یا صفحہ ۹۸ پر کشتیوں کی دوڑ ختم ہو جانے کے بعد اسی دریا کا منظر رات کی تاریکی میں بیان کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی مقامات پر مناظر کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، کہیں کہیں تو یہ منظر قصہ کا جزو بن جاتا ہے اور کہیں کہیں محض انشاء پردازی بن کر رہ جاتا ہے خصوصاً ان مقامات پر جہاں فضلی نے بنگال کے مناظر کو میر اور حافظ کی غزل سے تشبیہ دی ہے بنگال بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے۔ قدرت کا حسن قدم قدم

بکھرا نظر آتا ہے اس لیے یہاں کی زندگی پیش کرنے والا مناظر کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہیں کہیں منظر کشی کے نمونے بہت ہی کامیاب اور فطری نظر آتے ہیں۔ ناول کے ابتدا میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ انتہائی مناسب ہے مگر جہاں مصنف نثر میں شاعری کرنے لگتے ہیں منظر بے پیوند سا نظر آنے لگتا ہے۔

طوفان کا منظر بڑی عمدگی سے پیش کرتے ہیں "جوار کا پانی پیچھے سے ہڑبڑ کرتا ہوا آیا۔ کشتی اور تیز چلنے لگی۔ آسمان پر ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نمودار ہوئے وہ بھی کشتی کی طرح بہنے لگے تھے۔ جلد ہی آسمان پر ایسی سینکڑوں ہزاروں کشتیوں کے پرے کے پرے جم گئے جیسے آسمان کا بحری بیڑا جنگ کے لیے تیار ہو رہا ہو۔ تارے چھپ گئے ہوا تھم گئی۔ نغمہ ختم ہو گیا۔ جگنو غائب ہو گئے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا" یہ گویا طوفان کی آمد آمد تھی۔

اب ذرا حقیقی طوفان کا رنگ دیکھیے "بجلیاں چمک رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں کنارے پر عجیب تماشا نظر آیا۔ فضا میں نرالا رقص ہو رہا تھا۔ طوفان اپنے مرکز پر یکایک ناچنے لگا تھا زمین سے کئی سو فٹ اوپر مکانوں کے ٹین ناچ رہے تھے بکریاں ناچ رہی تھیں۔ مرد ناچ رہے تھے عورت ناچ رہی تھی۔ بچے ناچ رہے تھے اور آسمان کی طرف ناچتے چلے جا رہے تھے۔ یہ رقص یکایک رقص بسمل بن گیا۔ ٹین ناچتے ہوئے آتے شپ سے سر کٹ کر الگ ناچنے لگتا۔ دھڑ الگ ناچتا رہتا۔ ایک عورت کا سر بھی بکھرے ہوئے بالوں کے ہالے کے درمیان ناچنے لگا۔ ایک گائے کا سر بھی ناچ اٹھا اور جھٹک کے آدمی کے پیٹ سے ٹکرایا۔ پیٹ میں سینگیں گھس گئیں" بقول مصنف طوفان تو آتے ہی رہتے تھے مگر ایسا طوفان کسی نے نہ دیکھا تھا۔ ایسے میں بارش بھی آگئی اور اس زور شور کے

ساتھ کہ معلوم ہوتا تھا کہ سال بھر کا پانی آج ہی برس جائے گا۔ پانی کی بوندیں تھیں کہ لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں۔ بڑی بڑی کشتیاں ڈوب رہی تھیں الٹ رہی تھیں۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ جمعدار صاحب کی کشتی بھی ڈوب گئی۔ جمعدار جلودھر اور پھول محمد تو اتفاقاً زندہ بچ گئے۔ کشتی چلانے والا شیخ چاند البتہ ڈوب گیا۔

طوفان اترنے کے بعد کا منظر بھی ملاحظہ ہو۔" بھاٹے کی وجہ سے پانی بہت دور تک ہٹ گیا تھا۔ دیہات کا ڈیڑھ میل ٹکڑا بالکل صاف ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے درخت اکھڑے پڑے تھے۔ کچھ درخت کھڑے رہ گئے تھے ان کی اونچی اونچی ڈالوں پر مکانوں کے ٹین ٹنگے ہوئے تھے۔ تڑے مڑے جیسے کوئی دھوتی ٹانگ دے۔ لاشیں جگہ جگہ نظر آ رہی تھیں۔

اس ناول کی غایت بنگال کے قحط کی ہولناکیوں کا نقشہ پیش کرنا ہے۔ اس بہانے بنگال کی پوری زندگی کا تبصرہ اس میں آ گیا ہے قحط کے ذمہ دار بہت بڑی حد تک قدرتی اسباب ہوتے ہیں لیکن حکومت کا انتظام اچھا ہو۔ متعلقہ لوگ ہمدرد اور انسانیت کا درد رکھنے والے ہوں۔ معاشی نظام میں ناہمواریاں نہ ہوں۔ مفاد پرستوں کو کھلی چھٹی نہ ہو تو قحط آ بھی جائے تو سہولت سے گزر جاتا ہے مگر بنگال میں یہ سب کچھ نہیں تھا اس لیے قحط کی ہولناکیاں ایسی تھیں کہ جن پر گزریں یا جنہوں نے دیکھا ان کا تو کیا حال ہوا ہو گا۔ پڑھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ فضلی نے تمام متعلقہ مسائل کی طرف حکومت کو، اہل سیاست کو اور باشعور لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہی یہ ناول لکھا ہے

قحط کا بیان اگر کچھ طویل ہو جائے تو امید ہے کہ قارئین درگزر کریں گے۔ مگر اسے پیش کرنا ضروری ہے اس کے بغیر ناول نگار کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔

قحط کا علم ہوتے ہی مفاد پرستوں نے چاول سمیٹنا شروع کر دیا۔ دام چڑھ گئے اور غریب لوگ جنہیں اندازہ نہیں تھا کہ قحط دبے پاؤں آ رہا ہے سرت ساہا جیسے بنیئے کے ہاتھ چاول بیچتے چلے گئے۔ جب لوگوں کے پاس نہ کھانے کو رہا نہ خریدنے کو پیسے رہے تو وہ بھوکوں مرنے لگے۔ فاقہ زدہ آدمی ایک دم سے نہیں مر جاتا۔ اس کی موت کا منظر بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ساری آبادی لنگر خانوں کی طرف چل پڑی تھی۔ کچھ تو راستے ہی میں مر جاتے تھے۔ لنگر خانوں کا یہ حال تھا "لنگر خانوں سے کھچڑی بٹتی۔ جس میں دال چاول کم اور پانی زیادہ ہوتا۔ لوگ طرح طرح کے برتن لے کر آتے ٹوٹے پھوٹے۔ المونیم کے۔ پیتل کے۔ لوہے کے، مٹی کے۔ پتوں کے۔ اکثر برتنوں کی صورت اپنے مالکوں کی صورت کی طرح مسخ ہوتی۔ جب پیٹ میں گرم گرم کھچڑی پڑتی تو ادھر ڈوبی ادھر نکلی کا قصہ ہوتا۔ اپنے ساتھ جسم کا کچھ بچا کھچا خون بھی لے کے نکل جاتی آدمی غلاظت میں لت پت پڑا رہتا۔ مکھیاں بھنکتی رہتیں۔ تھوڑی دیر میں چیل کوے منڈلانے لگتے گدھ خوشی کے مارے اپنے بڑے بڑے پر پھٹکنے لگتے۔"

انہی کے ہم جنسوں کی بہیمیت دیکھیے کہ جن کے پاس کچھ پیسے تھے وہ ان فاقہ زدہ لوگوں کے بچے دس دس روپے میں خرید رہے تھے۔ جب پیٹ کا یہ حال ہو۔ اخلاق، محبت، مذہب ہر چیز ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ لوگ اپنے بچوں کو بیچ رہے تھے۔ ہری منڈل نے مجبور ہو کر بیچا جیرا باپ کو بھی مشورہ دیا کہ تم لوگ لنگر خانے تک نہیں پہنچ سکو گے اس لیے اپنی بچی مینا کو "دھنی لوگوں کے ہاتھ دے دو وہ اسے پال لیں گے تمہیں

کچھ روپیہ مل جائے گا۔ مجبور ہو کر جگیر باپ اور کلثوم نے اپنی لاڈلی بیٹی کو بیچ دیا۔"

قحط ہی کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو۔" یکایک اس کی نظر ایک بوڑھی عورت کی لاش پر پڑی۔ بڑھیا بالکل ننگی تھی جسم پر ایک دھاگا بھی نہ تھا۔ جگیر باپ نے منہ پھیر لیا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ وہ بڑھیا ننگی کیوں تھی۔ ضرور کسی نے اس کے مرنے کے بعد اس کا کپڑا اتار لیا ہوگا۔ بیچ کھانے کے لیے۔" ایسا سماں دیکھ کر جگیر باپ نے دیکھا ایک گھورے پر کچھ لوگ پڑے ہوئے ہیں کچھ بے حس و حرکت ہیں۔ کچھ کے ہاتھ آہستہ آہستہ گھورے کو ٹٹول رہے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی چھلکا آجاتا ہے کسی کے ہاتھ میں کوئی ہڈی۔ کچھ کتے بھی سونگھتے پھر رہے ہیں۔ جگیر باپ بھی گھورے پر گر پڑا۔ ادھر ادھر ٹٹولنے لگا۔ ایک چوسی ہوئی ہڈی اس کے ہاتھ میں آگئی وہ اسے اپنے منہ کے پاس لے جا رہا تھا کہ ایک کتا غرا کے جھپٹا اور ہڈی ہاتھ سے چھین لے گیا۔"

جہاں کھچڑی بٹتی تھی وہاں تک پہنچ کر کھچڑی حاصل کرنا بھی آسان نہ تھا۔ اول تو بے تحاشا بھیڑ تھی۔ پھر دھکا پیل اتنی تھی کہ یہ جاں بلب لوگ اسے برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔ پیشہ ور مسٹنڈے فقیر دھکا دے کر آگے نکل جاتے تھے۔" گھنٹوں کے بعد جب خدا خدا کر کے جگیر باپ اور ہری منڈل کی باری آئی۔ جگیر باپ ذرا آگے تھا اس کے ہاتھ میں پتوں کا ایک دونا تھا جسے اس نے زمین سے اٹھا لیا تھا۔ دونے میں جب جلتی ہوئی گرم گرم کھچڑی پڑی۔ بھاپ نکل رہی تھی۔ جگیر باپ ٹوٹ کے گرا اس نے کھچڑی میں بجائے ہاتھ ڈالنے کے منہ ڈال دیا۔ ہری منڈل سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ ہری منڈل اپنا منہ اس دونے میں گھسیڑ رہا تھا اس وقت دو بھوکے انسان تھے۔ نہ کوئی ہندو تھا نہ کوئی مسلمان اس نے

دونا اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ بجیر باپ نے اپنی طرف۔ ناتوانوں کی لڑائی ہوئی دونا پھٹ گیا۔ کھچڑی گر پڑی۔ دونوں بھی گر پڑے۔ حسرتوں کا ڈھیر ہو گیا۔ پیچھے کے لوگ انہیں روندتے ہوئے گزر گئے دو تین کراہوں کی آواز آئی اور بس ؎

کچھ تو جنگ کی وجہ سے اور کچھ شاید انتظام کی خاطر جگہ جگہ فوج پڑی ہوئی تھی۔ فاقہ زدہ عورتوں کو دیکھ کر سوائے ترس کھانے یا منہ پھیر لینے کے اور کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا مگر ایک فوجی فاقوں کی ماری حاجرہ کے ہاتھ میں روپیہ رکھ دیتا ہے اور جمعدار صاحب سے کہتا ہے کہ رات کو اپنی بیوی کو ہمارے پاس بھیج دینا۔ ہاتھ پاؤں دبا دے گی یہ انسان کی بہیمیت کا بدترین نمونہ ہے۔

قحط زدہ لوگوں کی جنہیں کئی کئی دن سے چاول کا ایک دانہ بھی نہ ملا ہو ان کی حالت کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ بے چارے اپنی بیویوں کو فوجیوں کی بھینٹ چڑھانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

مصنف نے اس ناول میں صرف قحط ہی کا حال نہیں لکھا ہے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ پیش کیا ہے۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنے کرداروں کا انتخاب بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ کیا ہے۔

اس ناول کا ملکہ قصہ کا اہم ترین اور مرکزی کردار جمعدار صاحب ہیں ہیں جن کا نام جلیل الدین ہے مگر بنگال کے تلفظ کی رو سے وہ ذلیل الدین یا ذلیل میاں بن جاتے ہیں۔ یہ بہت ہی عجیب و غریب اور دلچسپ آدمی ہیں۔ ویسے تو انھیں غریب ہی تصور کرنا چاہیے مگر ان کے ارد گرد جس طرح کے لوگ آباد ہیں ان کے درمیان انھیں کھاتا پیتا انسان کہا جا سکتا ہے یہ پہلی جنگ عظیم میں سپاہی بھرتی ہو کر گئے تھے۔ جنگ میں انھوں نے کیا کارگزاری دکھائی اس کا لوگوں کو رفتہ رفتہ علم ہو ہی گیا۔ انھوں نے

خود کو جمعدار کے عہدے پر ترقی بھی دے لی تھی اس لیے بعض لوگ انھیں زمان دار شباب بھی کہتے ہیں۔

اپنی کارگزاریوں کے فرضی قصے سناتا ان کا محبوب مشغلہ ہے یہ قصے چونکہ ہر وقت سنائے جاتے ہیں اس لیے فارسی کی پرانی مثل کے مطابق ایک ہی واقعہ کبھی یہ کچھ ہو جاتا ہے کبھی کچھ۔

بہادری کے ان قصوں سے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ صرف جمعدار صاحب کی انا کی تسکین ہو جاتی ہے اس لیے لوگ انھیں برداشت کر لیتے ہیں البتہ گاؤں کا ایک شوخ لڑکا بھول محمد جوان کا معتمد خاص بلکہ جاں نثار ہے کبھی کبھار شرارتاً انھیں لوک دیتا ہے۔ اسے ان سے بے پناہ محبت ہے۔ اس کا منشا انھیں ذلیل کرنا نہیں بلکہ صرف لطف لینا ہوتا ہے۔

ایک دفعہ اپنی بہادری کا قصہ سناتے سناتے جمعدار اپنے ہاتھ کا زخم دکھا کر کہنے لگے کہ ایک جرمن سے خوب گتھم گتھا ہوئے مگر اس نے ان کا ہاتھ چبا ڈالا بھول محمد سے نہ رہا گیا وہ ہنس پڑا۔ "مگر چاچا یہ نشان تو پھوڑے کا ہے"۔

"پھوڑا کب نکلا تھا جھوٹا کہیں کا"۔

اس پر بھول محمد نے تفصیل بتائی انھیں یاد آ گیا کہ بھول محمد ہی تو ہسپتال سے دوا لایا تھا مگر انھوں نے ایسی استادی سے بات بنائی کہ بھول محمد منہ دیکھتا رہ گیا۔

انھیں جمعدار کے عہدے پر ترقی ملنے کی بھی وہ مختلف اوقات میں مختلف وجوہات بتا چکے تھے۔ ایک مرتبہ اس سلسلے میں بھی بھول محمد نے ان کی بات کاٹ دی تھی مگر وہ حسب معمول بات بنا گئے تھے۔ انھوں نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ انھیں وکٹوریہ کراس بھی ملا تھا مگر وہ رزائن

دیتے وقت واپس کر آئے۔ جلودھر نے ان کی باتوں کو جھوٹ قرار دیا تو انھوں نے انتہائی غضب ناک ہو کر کہا: "تم جھوٹا تمھارا باپ جھوٹا۔ تم خود نوکری سے نکالا گیا اور اب یہاں گاؤں میں آ کے بدمعاشی کرتا ہے۔"

تقسیم سے پہلے بنگال میں اردو کو احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا جمعدار کو اردو میں بھی تھوڑی سی شدبد ہے۔ ایک غزل نما قصیدہ ان کی تصنیف ہے جسے وہ اکثر گاتے رہتے ہیں۔

"بلبل کا چیں چیں میں آواز مرجیا ہے۔"

ان کی اردو دانی کی وجہ سے اردگرد کے لوگ ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں لوگ عموماً ان کی عزت کرتے ہیں۔ گاؤں کا واحد بنیا سرت سا ہا بھی انھیں کاکا کہہ کر پکارتا ہے۔ زمیندار کے کارندے نگن بابو یہ تو مانتے ہیں کہ جمعدار جھوٹ بولتے ہیں مگر انھیں برا آدمی نہیں سمجھتے۔ ایک مرتبہ نگن بابو کے گھر ڈاکہ پڑا تھا پونیر میاں نے دشمنی نکالنے کے لیے یہ چاہا کہ ڈاکوؤں میں جمعدار کا نام بھی لکھا دیا جائے۔ تو نگن بابو نے کہا کہ "وہ بکواسی ضرور ہے مگر چور اچکا نہیں ہے۔"

جمعدار صاحب جو کام بھی کرتے ہیں خلوص سے کرتے ہیں کسی کام میں وہ اگر آگے بڑھ جائیں تو پھر پیچھے نہیں ہٹتے۔ پونیر میاں جو مسلم لیگ کے کارکن ہیں شہر میں وکالت کرتے ہیں کچھ تو اپنی شہرت کے لیے اور کچھ اپنے داماد سلطان میاں کی خاطر اسکول کھولتے ہیں۔ پھول محمد کے مشورے سے وہ اس کے مقابلے میں مدرسہ کھول دیتے ہیں اور مدرسے کے لیے مولانا مستنصر باللہ کو رکھ لیتے ہیں۔ جو فاضل دیوبند

ہیں اور حاجی بھی ہیں پونیر میاں اسکول کے معائنہ کے لیے حاکم ضلع مجید صاحب کو بلاتے ہیں ان کی بھد اڑ جاتی ہے اور جمعدار صاحب کے مدرسہ کا سکہ مجید صاحب کے دل پر جم جاتا ہے۔

یونین بورڈ کے الیکشن ہوتے ہیں پونیر میاں اس کے لیے کھڑے ہوتے ہیں جمعدار صاحب کو اپنا طرف دار بنانا چاہتے ہیں۔ بھول محمد کے مشورے سے جمعدار خود کھڑے ہو جاتے ہیں پونیر میاں کو جواب دیتے ہیں " میں البتہ کھڑے ہوں گے۔ میں دکھائیں گے کہ آپ ایسے کام کرنے سکتے ہیں کہ نہیں۔ البتہ سکتے ہیں!"

جمعدار صاحب گاؤں میں کافی مقبول ہو چکے تھے اس لیے وہ جیت جاتے ہیں اور پونیر میاں ہار جاتے ہیں مگر وہ حکومت کی طرف سے نامزد ہو جاتے ہیں اس کے بعد پریذیڈنٹ کا الیکشن ہوتا ہے جمعدار صاحب کے حوصلے بڑھ چکے تھے وہ پونیر میاں کے مقابلے پر پھر ڈٹ جاتے ہیں۔ نگن بابو بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے ووٹ بٹ جاتے ہیں اور نگن بابو پریذیڈنٹ منتخب ہو جاتے ہیں اس سے مصنف نے یہ بھی دکھایا ہے کہ مناسب منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے بنگال میں مسلمانوں کے ووٹ بٹتے رہے اور ہندو وہاں کی سیاست میں تناسب سے زیادہ دخیل رہے۔

جمعدار صاحب کی آمدنی کم تھی۔ ممبر بننے کے بعد وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ پر اور زیادہ خرچ کرنے لگے۔ نتیجہ ہوا کہ وہ مقروض ہو گئے۔ انھوں نے اپنے کئی کھیت سرت ساہا کے ہاتھ بیچ دیے ان کی پریشانیاں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ وہ غریب تو تھے مگر ان کے حوصلے بڑے تھے۔ ان میں قربانی اور ایثار کا مادہ اس قدر ہے کہ قحط کے زمانہ میں وہ خود بھوکے رہ کر چاند کی بیوہ حاجرہ

اور گیدو کی ماں کی خبر گیری کرتے رہے جب گیدو کی ماں او ہاجرہ ... خیرات لینے کے لیے پہنچیں تو جمعدار اسے برداشت نہ کر سکے انھیں گھر لے آئے۔ خود فاقہ کیا مگر انھیں چاول کھلائے۔

اس کے بعد جمعدار کے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہ بچا چو کی بیچ کر سات سیر چاول لائے اس میں سے تین سیر بچیر باپ کے یہاں پہنچا دیے۔ ایک سیر گیدو کی ماں اور ہاجرہ کو دیے گھر کے لیے صرف دو سیر رکھے۔ اس کے بعد قحط اور بھی بھیانک شکل اختیار کر جاتا ہے جمعدار صاحب بھی آخر میں لنگر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں وہاں بھی غیرت مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان حالات میں جمعدار صاحب کا کردار کچھ خلاف قیاس ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کسی انسان سے خودداری اور ایثار کی توقع کرنا اس کے ساتھ انتہائی زیادتی ہے۔

شروع میں جمعدار صاحب میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں۔ ہری منڈل کا کھیت بہہ کر ان کے پاس آ گیا تھا تو ان کی نیت بدل گئی وہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہے وہ روتا پیٹتا آیا تب بھی انھوں نے صاف انکار کر دیا اس نے پنچایت کی دھمکی دی تب بھی جمعدار صاحب انکار ہی کرتے رہے۔

ایک زمانہ میں جب کہ لوگ ملیریا اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہو رہے تھے جلودھر اور مخلص اپنی پارٹی کی تبلیغ کی خاطر لوگوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے انھوں نے پھول محمد کی دیکھ بھال کی اور باتوں باتوں میں جمعدار صاحب کو بھی کمیونسٹ پارٹی کا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ جمعدار صاحب ان کی خدمت خلق سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ منافق ہیں۔ مخلص اور جلودھر ان سے بہتر

انسان ہیں اس لیے کہ وہ منافق نہیں۔ ان دونوں نے انھیں مذہب سے بھی برگشتہ کرنے کی کوشش کی جمعدار صاحب انہی خیالات کی بنا پر کافی پریشان رہے۔ وہ مولانا مستنصر باللہ کے پاس گئے ان کے پاس ایک نورانی بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ مولانا مستنصر باللہ کے پیر تھے۔ جمعدار صاحب نے جلودھر اور مخلص کے خیالات ان کے سامنے بیان کیے اور کہا کہ یہ دونوں لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں مگر کوئی مسلمان یہ کام نہیں کر رہا ہے۔ پیر صاحب مذہب کی حقیقت بڑے موثر اور دلنشیں انداز میں جمعدار صاحب سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی اصلاح تقریباً اسی طرح ہو جاتی ہے جس طرح توبۃ النصوح میں خواب دیکھ کر نصوح کی ہو گئی تھی۔ اب وہ بالکل مختلف انسان تھے۔ انھیں ہری منڈل کے کھیت کا بھی خیال آیا۔ بی بی جان بھی جمعدار صاحب کو ان کے رویہ پر ملامت کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ صبح ہی جاکر ہری منڈل کا کھیت واپس کر آئے

قلب ماہیت کے بعد ان کی حالت یہ تھی "تہجد کا وقت آگیا تھا جمعدار صاحب نے بہت دنوں کے بعد تہجد کی نماز پڑھی۔ بی بی جان پانچ وقت کی نماز پڑھتیں مگر تہجد نہ پڑھتیں آج انھوں نے بھی پڑھ لی۔ دونوں کا یہ حال تھا کہ نہ محض سر سجدہ میں تھا بلکہ دل بھی۔ جس وقت میاں بیوی نماز پڑھ کے اٹھے اس وقت دونوں کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔"

مصنف نے مذہب کے جوش میں جمعدار صاحب کو کچھ زیادہ ہی بلند کر دیا۔

جمعدار صاحب، جلودھر اور مخلص سے اکثر بے رخی سے پیش آتے تھے مگر وہ سمجھ رہے تھے کہ جمعدار صاحب ان کے ہم خیال ہوتے جا رہے ہیں۔ قلب ماہیت کے بعد بھی وہ مایوس نہیں ہوئے تھے ایک دن وہ دونوں آئے اور جمعدار صاحب کو سمجھانے لگے کہ ان حالات میں

سرت ساہا کی دکان لوٹ لینا بالکل حق بجانب ہے وہ سمجھاتے ہیں کہ اس کا سارا دھن حرام کی کمائی ہے لوگ مر رہے ہیں اور وہ چاول دبائے بیٹھا ہے۔ جمعدار صاحب سوچنے کے لیے دو ایک دن کا وقت چاہتے ہیں وہ دونوں چاہتے ہیں کہ فوراً یہ کام ہو جائے۔ جمعدار صاحب گھر آ کر بی بی جان سے مشورہ کرتے ہیں وہ انھیں سختی سے منع کر دیتی ہیں اور جمعدار صاحب یہ خیال دل سے نکال دیتے ہیں۔

اسمبلی کے الیکشن کا وقت آتا ہے جمعدار صاحب کے ہوتے جتے ہوتے تھے پونیر میاں کو مسلم لیگ نے ٹکٹ دیا جمعدار صاحب سیاسی شعور سے قطعی عاری تھے۔ وہ ان کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلم لیگ کو کوئی آلسان سمجھتے ہیں ۔ مولانا مستنقر باللہ انھیں سمجھاتے ہیں کہ مسلم لیگ کیا ہے۔ وہ ان سے کہتے ہیں کہ وہ مسلم لیگ کی خاطر پونیر میاں کی مدد کریں۔ مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ پونیر میاں بہت برے انسان ہیں مگر قومی یکجہتی کی خاطر وہ جمعدار صاحب کو راضی کر لیتے ہیں کہ وہ پونیر میاں کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوں۔ یہاں مصنف نے شاید یہ بھی بتانا چاہا ہو لیگ امیدواروں کے انتخاب میں احتیاط نہیں برتتی تھی اور اس جماعت کے نام پر بہت سے برے لوگ بھی منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچ جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ لوگوں کے دلوں میں مسلم لیگ کے بارے میں برا تصور قائم کرتے تھے۔

جمعدار صاحب پر مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں ان کا اکلوتا بیٹا چھالو مر جاتا ہے۔ چھالو ان کے بڑھاپے کی اولاد تھا اور وہ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ بی بی جان مر جاتی ہیں وہ یہ تمام صدمات صبر سے سہہ لیتے ہیں۔ ان کی انسانیت اس کے باوجود زندہ رہتی ہے۔ ہم انھیں دوسری حیثیات میں بھی دیکھتے ہیں۔ غریب خانے میں پہلے وہ

کپڑا بنا کرتے تھے۔ پھر مجید صاحب نے انھیں نگران بنا دیا۔ وہ ہر کام انتہائی محنت اور لگن سے انجام دیتے ہیں۔ بے ایمانوں کی قلعی کھولتے ہیں وہ حق بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ پونیر میاں سے انھیں اتنی نفرت ہے کہ انھوں نے پونیر میاں کو کبھی معاف نہیں کیا۔ ان کے خان صاحب بن جانے پر بھی وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے۔ جمعدار صاحب بنگال کے عام مسلمانوں کا بڑا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جمعدار صاحب کے کردار کی تشکیل میں بھول محمدؐ اور بی بی جان کا حصّہ بہت اہم ہے ان کے توسط سے ان کی فطرت کے بہت سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ جمعدار صاحب بھول محمد کو بیٹے کی طرح عزیز رکھتے ہیں ان کی باتیں سننے کے لیے کوئی نہیں ملتا تو وہ تمنا کرتے ہیں کہ اس وقت بھول محمد ہی آجاتا بھول محمد کا تعلق جمعدار صاحب سے عجیب سا ہے۔ وہ ان کا سب سے بڑا مشیر ہے اور ان کا جانثار ہے مگر عام شوخ لڑکوں کی طرح کبھی کبھی وہ ان کی بات کاٹ کر ان سے لطف لیتا ہے۔ مگر جمعدار صاحب کے لیے اس کی سچی محبت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا ان پر اعتراض کرے یا ان کی بات کاٹے۔

جیسا کہ موضوع کا تقاضا تھا ناول کے بیشتر حصّہ کا انداز سنجیدہ ہے۔ مصنف اس سنجیدگی میں شوخی پیدا کرنے کے لیے کبھی جمعدار صاحب کے کردار سے کام لیتے ہیں اور کبھی بھول محمد سے۔

بھول محمد کو جب ہم مختلف اہم معاملات میں دخیل پاتے ہیں تو یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آخر اس کی عمر کیا ہے۔ مصنف نے اسے گاؤں کے لڑکوں کا سردار اور کبڈی کا ماہر کہا ہے۔ گاؤں کے لڑکے اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ کبھی وہ دوڑ کر کہیں جاتا ہوا نظر آتا ہے کبھی جمعدار صاحب کے لیے کوئی چیز لاتے لیجاتے۔ جب پونیر میاں اسکول کھولتے

ہیں اور مجید صاحب اس کے معائنے کے لیے آتے ہیں تو اسے اسکول کا طالب علم ظاہر کرتے ہیں مگر وہ خود کو جمعدار صاحب کے مدرسے کا طالب علم کہہ کر سارا کھیل بگاڑ دیتا ہے۔ پونیر میاں کو بھی دل سے ناپسند کرتا ہے اس لیے ایک بہانے سے نعرہ لگا کر درخت پر سے پونیر میاں پر کود پڑتا ہے مجید صاحب کی لانچ میں سارنگ کے ساتھ جو حرکتیں کرتا ہے اس سے بھی وہ کم عمر لڑکا ہی نظر آتا ہے تقریباً ۱۲-۱۰ سال کا۔

اس کے بعد اس کے دو چچاؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بڑے چچر باپ باپ اور چھوٹے عمدہ میاں۔ عمدہ میاں بالغ النسان ہیں کہنے کو ان کے برائے نام ڈاڑھی مونچھ بھی ہے۔ بھول محمد سے عمر میں ۵-۶ سال بڑے ہیں مگر قد میں ۲-۳ انگل چھوٹے ہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی عمر ۱۶-۱۵ سال ہوگی۔

مجید صاحب تو بہت سادہ لوح النسان ہیں اس لیے ان کا بھول محمد سے مشورہ لینا تو کچھ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مگر پونیر میاں اور جلودھر بھی اسے ساتھ ملانا چاہیں اس سے اس کی رائے کی اہمیت اور اس کے اثر کا اندازہ ہوتا ہے مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ وہ کم عمر چھوکرا نہیں ہے بلکہ سمجھ دار لڑکا یا نوجوان ہے۔ اہم معاملات کو سمجھ سکتا ہے۔ جمعدار صاحب کو سمجھاتا ہے کہ مسلم لیگ کی خاطر پونیر میاں کے حق میں بیٹھ جائیں۔ یہ سیاسی سوجھ بوجھ کسی نوعمر لڑکے کی بس کی نہیں۔

جب ہری منڈل کا کھیت بہہ کر جمعدار صاحب کے ٹیلے پر آ گیا تھا۔ اور جمعدار صاحب نہ صرف اس پر قابض ہو گئے تھے بلکہ اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے تھے۔ بھول محمد ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کرتا اور جب وہ اس کا کھیت واپس کر دیتے ہیں تو

وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ خیر و شر کا یہ تصور بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ پھول محمد تقریباً جوان ہوگا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کردار اہم اور دلچسپ ہونے کے باوجود اندرونی تضاد کا شکار ہو گیا ہے۔

جمعدار صاحب کی اصلاح اور انھیں اچھا انسان بنانے میں بی بی جان کا حصہ مستنصر باللہ اور ان کے پیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ جمعدار صاحب مختلف مرحلوں سے گزر کر نیک انسان بنتے ہیں انہیں چھوٹی موٹی بے ایمانیاں کرنے میں بھی تکلف نہیں ہوتا مگر بی بی جان تو ڈپٹی نذیر احمد کے حجۃ الاسلام کی طرح ہیں ان سے کبھی کوئی بدی سرزد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

بی بی جان کو اپنے میاں سے بڑی محبت ہے۔ وہ اتنی سیدھی سادی ہے کہ جمعدار صاحب کی شیخیوں پر یقین کر لیتی ہیں۔ جمعدار صاحب کی بوکھلاہٹ کی وجہ وہ یہ سمجھتی ہیں کہ دوران جنگ جمعدار صاحب میموں سے عشق لڑاتے پھرے ہیں اور اب تک ان کے دل میں میمیں بس رہی ہیں

جنگ چھڑ جانے کے بعد نگن بابو اور یونیر میاں لوگوں کو بہکاتے ہیں کہ وہ چاول بیچ دیں اس لیے کہ چاول سستا ہو جائے گا۔ جمعدار صاحب نے بھی بیچ دیے حالانکہ انھیں مولانا اور بی بی جان نے بہت سمجھایا تھا۔ ان کے کہنے سے صرف پانچ من روک لیے تھے۔

جمعدار صاحب نے جب ہری منڈل کا کھیت ہڑپ کر لیا تھا۔ بی بی جان کو یہ پسند نہ تھا۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کو حرام تصور کرتی ہیں۔ وہ الیکشن کے معاملات کو قطعی نہیں سمجھتیں مگر مسلم لیگ کی خاطر جمعدار صاحب کے بیٹھ جانے کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔

ویسے تو جمعدار صاحب میں بھی ایثار و قربانی کا جذبہ بہت

ہے مگر بی بی جان اس سلسلے میں ان سے بھی بڑھی ہوئی ہیں وہ آخر وقت تک گیندو کی ماں اور چاند کی بیوی کی مدد کرتی ہیں۔

جلودھر کے بہکاوے میں آکر جمعدار صاحب بھی سرت سہاہا کی دکان لٹوانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر بی بی جان انھیں منع کرتی ہیں۔ انھیں بڑے سے بڑا لالچ اور بڑی سے بڑی مصیبت بھی راہ راست سے نہیں ہٹا سکتی۔

چھالو کی موت پر تجہیز و تکفین کے لیے نگن بابو دغیرہ جمعدار صاحب کو روپیہ دیتے ہیں۔ جمعدار صاحب اسے قرض سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ مجید صاحب ان کی امداد کے لیے روپے بھیجتے ہیں حالانکہ انھیں روپیوں کی سخت ضرورت ہے مگر بی بی جان کہتی ہیں پہلے قرض ادا کر دو۔

چھالو سے بی بی جان کو بڑی محبت تھی۔ مگر وہ صبر سے کام لیتی ہیں جمعدار صاحب غم سے بدحواس ہو جاتے ہیں اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بی بی جان کہتی ہیں تم تو مرد آدمی ہو خدا نے اپنی امانت واپس لے لی اس میں ہمارا کیا بس۔

اس قدر استقامت ان حالات میں خلاف قیاس لگتی ہے دراصل مصنف نے اس کردار کو ضرورت سے زیادہ بلند کر دیا ہے نصوح کی بیوی تو نصوح کے وعظ و نصیحت کے بعد راہ راست پر آئی تھی۔ بی بی جان تو شروع سے ہی نیکی کا مجسمہ نظر آتی ہیں۔

ایسی ہی ماورائیت حاکم ضلع مجید صاحب کے کردار میں بھی آگئی ہے ان کے پردے میں دراصل فضلی نے اپنا کردار پیش کیا ہے۔ اس کردار کا بھی وہی حشر ہوا جو مرزا رسوا کے شریف زادہ کا ہوا۔ مجید صاحب اس ناول میں فرشتۂ رحمت کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ فضلی نے

جس درد مندی سے یہ ناول لکھا ہے اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بھی قحط کے زمانہ میں بنگال کے عوام کی یقیناً کافی خدمت کی ہو گی مگر جتنی خدمت مجید صاحب کرتے ہیں۔ مشکلات اور مخالفتوں کے باوجود کرتے ہیں وہ اس طبقہ کے افسر کے لیے قرین قیاس نہیں لگتی وہ جمعدار صاحب کی مدد اس لیے کرتے ہیں کہ وہ انھیں نیک اور مخلص انسان سمجھتے ہیں۔ ان کی سیدھی سادھی باتوں سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جمعدار صاحب بہ حیثیت انسان ان سے بہتر ہیں۔ اگر انھوں نے بر وقت مدد نہ کی ہوتی تو جمعدار صاحب درمیان میں ہی ڈھیر ہو جاتے مجید صاحب فاقہ زدہ لوگوں کے لیے لنگر خانہ کھولتے ہیں۔ بے روزگاروں کے لیے کارخانہ کھولتے ہیں۔ غرضیکہ وہ ایک مثالی افسر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ شاید اس کردار کے ذریعہ وہ افسران کو متوجہ کرنا چاہتے ہوں کہ ان پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اور انھیں عوام کی خدمت کس طرح کرنی چاہیے۔

ان کی لطافت کو مزید نمایاں کرنے کے لیے وہ ایک کثافت کا یعنی جاز ایلی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کا نام اعجاز علی تھا آئی سی ایس میں منتخب ہونے کے بعد انھوں نے اپنے نام کو بھی صاحبی شان دینے کے لیے جاز ایلی کر دیا تھا۔

وہ مغرب زدہ افسران کا بڑا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ مگر مصنف نے ان کی مغرب زدگی میں کافی مبالغہ برتا ہے۔ وہ "پانی" کو "پینی" کہتا ہے اور کرسمس سے تشبیہہ دینے کے بعد سمجھتا ہے کہ عید کسے کہتے ہیں وہ برطانوی حکومت کی مشین کا ایک پرزہ تھا۔ انتہائی وفادار۔ اسے ہندو مسلمان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کانگرس اور مسلم لیگ کو برطانوی حکومت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا مگر جب مسلم لیگ نے زور پکڑا

اور صدارت پر قبضہ کر لیا تو جاز ایلی صاحب مشکل میں پھنس گئے کہ مسلم لیگ سے وفاداری کریں یا انگریز سے انھوں نے غور وغوص کے بعد طے کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ بھی ظاہرداری برتی جائے چنانچہ انھوں نے ایک شیروانی بھی بنوالی۔ انگریزی لہجہ میں اردو بولنا کم کر دیا۔ یہاں تک کہ دیوان غالب کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔

مجید صاحب اور جاز ایلی ایک دوسرے کے متضاد تھے۔ مجید صاحب کا مقصد عوام کی خدمت کرنا تھا۔ وہ اسی کو حکومت سے وفاداری کے مترادف سمجھتے تھے۔ جاز ایلی کو عوام اور ان کی فلاح سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے دل میں عوام کے لیے محبت نہیں بلکہ حقارت تھی۔ مجید صاحب اس ہمدردانہ رویے کی بنا پر لوگوں میں ہر دل عزیز تھے۔ بلکہ سمجھ دار افسران بالا بھی انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے جاز ایلی اپنی زمانہ سازی کے باوجود ایک ناکام افسر ثابت ہوتے ہیں۔

اس ناول کا سب سے برا النسان غالباً مولوی بشیر الاسلام یعنی پونیر میاں ہیں۔ انھیں نہ بنگال عزیز ہے نہ مسلمان۔ نہ مسلم لیگ۔ وہ صرف اقتدار کے بھوکے ہیں۔ جمعدار جیسے ان پڑھ النسان کے مقابلے میں وہ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ پہلے یونین بورڈ کی ممبری میں وہ جمعدار سے شکست کھاتے ہیں مگر اپنے اثر رسوخ سے ممبر نامزد ہوتے ہیں صدارت کا الیکشن ہوا تو بھی جمعدار صاحب ان کے مقابلے پر تھے اس طرح مسلمانوں کے ووٹ بٹ گئے تو تیسرا یعنی ہندو امیدوار ناگن بابو منتخب ہو گئے۔ گویا انھوں نے اپنے لالچ کی بنا پر ہندو کا راستہ صاف کیا۔

پونیر میاں کی راہ میں جو بھی آیا ہے وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ جمعدار جیسے بے ضرر النسان سے وہ اتنی دشمنی رکھتے ہیں کہ آخر تک ان

کا پیچھا نہیں چھوڑتے - مجید صاحب جمعدار کے خلوص اور طبعی نیکی کی بنا پر ان کی مدد کرتے ہیں تو پونیر میاں ان کے خلاف بھی سازش کرتے ہیں - نگن بابو کے یہاں ڈاکہ پڑتا ہے تو وہ جانتے ہوئے بھی کہ جمعدار کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے رپورٹ میں ان کا نام شامل کروانا چاہتے ہیں نگن بابو بھی جمعدار سے خوش نہیں ہیں مگر وہ بھی کہتے ہیں کہ جمعدار جھوٹ تو ضرور بولتا ہے مگر چور ہرگز نہیں ہے - اس کے باوجود پونیر میاں اصرار کر کے جمعدار صاحب کا نام شامل کروا دیتے ہیں -

پونیر میاں اپنی غرض کے دیوانے ہیں - ان کا کوئی اصول نہیں - وہ کسی بھی حد تک گر سکتے ہیں - اسمبلی کے الیکشن کا وقت آتا ہے تو مسلم لیگ انہی کو ٹکٹ دیتی ہے - اس سے شاید مصنف نے یہ بھی دکھانا چاہا ہے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والوں میں پونیر میاں جیسے خود غرض اور مطلب پرست بھی کافی تعداد میں تھے -

جاز ایلی کے استفسار پر وہ یقین دلاتے ہیں کہ "ان کی وفاداری تمام و کمال حکومت وقت خاص طور سے حاکم ضلع کے ساتھ ہے - اس وقت چونکہ حکومت مسلم لیگ کی ہے اس لیے وہ مسلم لیگی ہیں اگر مسلم لیگ کی حکومت نہ رہی تو جس کی حکومت رہے گی وہ اس کے ساتھ ہو جائیں گے انھیں درحقیقت حکومت کی پارٹی کا ممبر سمجھنا چاہیے اور تاج برطانیہ کی وفادار رعایا "

اپنی بے ایمانیوں کے باوجود پونیر میاں عروج پر پہنچ جاتے ہیں انھیں خان صاحب کا خطاب بھی مل جاتا ہے - وہ وکیل ہیں اس کے باوجود بڑی حماقتیں کرتے ہیں - اس کی وجہ شاید ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود غرضی اور جاہ طلبی ہے - یہ کردار شاید مصنف نے اہل سیاست کی آنکھیں

کھولنے کے لیے پیش کیا ہے۔

مصنف نے اس میں ہندو کردار چند ہی پیش کیے ہیں۔ ہمارا عام تاثر یہی ہے کہ ہندو اقلیت میں ہونے کے باوجود بنگال کی زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ سرت ساہا تو خیر بنیا ہے اس کا کردار ویسا ہی ہے جیسا کہ اکثر بنیوں کا ہوتا ہے اسے صرف پیسے کمانے سے غرض ہے۔

زمیندار بابو۔ ان کے کارندے نگن بابو۔ دوا کے بجائے پانی بیچنے والا کمپاؤنڈر ابھیناش بابو ان میں سے کوئی بھی اچھا انسان نہیں ہے صرف نگن بابو میں کچھ انسانیت پائی جاتی ہے۔ اختلاف کے باوجود جمعدار صاحب سے اس کی ہمدردی برقرار رہتی ہے۔ قحط کے زمانے میں وہ انھیں چاول بھی دیتے ہیں۔ اور چھانو کی موت پر روپیہ بھی دیتے ہیں۔

نگن بابو کے گھر پر ڈاکہ پڑنے کے واقعہ کو بھی مصنف نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ ہندو بنگالیوں کی بہادری کا بڑا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔

مصنف نے اس ناول میں تبلیغی خدمت بھی انجام دی ہے۔ اس کی خاطر انھوں نے دو کمیونسٹ کردار پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک ہندو ہے دوسرا مسلمان۔ ان میں سے زیادہ سرگرم جلادھر ہے۔ وہ بھی اپنے علاقے میں ایک ایک کو گھیر کر اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ پھول محمد اور جمعدار صاحب کے ملازم قمیص کو اپنا ہم خیال بنا پایا ہے اور جمعدار صاحب کو مذہب اور موجودہ معاشی نظام سے بدظن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کی ساری کوشش بے کار جاتی ہے۔ وہ صرف جمعدار صاحب کے ملازم قمیص کو اپنا ہم خیال بنا پاتا ہے۔ قحط کے زمانہ میں وہ جمعدار صاحب کو تقریباً آمادہ کر لیتا ہے کہ سرت ساہا کی دکان لوٹ کر سامان غریبوں میں

تقسیم کر دیا جائے۔ جمعدار صاحب کو ان کی بیوی سختی کے ساتھ اس کام سے منع کر دیتی ہیں۔ البتہ بیچارہ عمرہ میاں جو اپنے قد کاٹھ سے زیادہ بہادری دکھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے گولی کا نشانہ بن جاتا ہے

دوسرے کیمونسٹ کا نام مکلیشور رمن ہے ان دونوں کی مدبھیڑ مولانا مستغفر باللہ سے اس لیے کروائی گئی ہے کہ وہ کیمونزم کی خامیاں اور اسلام کی برتری ثابت کر سکیں۔ جب مولانا کو بتایا جاتا ہے کہ مکلیشور رمن مسلمان ہے تو وہ بڑے پریشان ہوتے ہیں کہ یہ نام مسلمان کا تو نہیں۔ مکلیشور رمن انہیں بتاتا ہے کہ ایک پیر صاحب نے اس کا نام رکھا تھا۔ مولانا سوچتے ہیں کہ پیر صاحب غیر اسلامی نام کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یکایک ان کے ذہن میں آتا ہے کہ اس کا نام مخلص الرحمٰن ہو گا جو بنگالی تلفظ سے بگڑ کر مکلیشور رمن بن گیا ہے۔ وہ چونکہ خود بھی بگڑ گیا تھا اس لیے اپنے اصلی نام کو یاد بھی نہ رکھ سکا۔

مولانا کیمونزم کے کھوکھلے پن کو ثابت تو کر دیتے ہیں مگر جس طرح قحط کے زمانہ میں یہ دونوں دہریے لوگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ بیماروں کے گھر جا کر ان کی تیمارداری کرتے ہیں حتیٰ کہ پھول محمد اور پھانو کی بھی خبر گیری کرتے ہیں یہ ان کے کردار کو کافی بلندی عطا کر دیتا ہے۔ اس زمانے میں کوئی مسلمان اس طرح لوگوں کو خدمت نہیں کرتا چاہے انھوں نے یہ کام اپنی پارٹی کی شہرت کی خاطر ہی کیا ہو۔ بہرحال نیکی نیکی ہے چاہے اس کا انجام دینے والا مومن ہو یا دہریہ۔

پہلے جلودھر اور مخلص لوگوں سے مذہبی بحث کیا کرتے تھے۔ ایسی ہی بحث کے بعد مخلص نے مولانا کو "موچھن بلا" کہا تھا۔ جب کیمونسٹ پارٹی نے دیکھا کہ مذہبی بحث سے پارٹی کو نقصان پہنچ رہا ہے تو اس نے اپنے ممبروں کو منع کر دیا کہ مذہبی بحث نہ کریں جلودھر اس سے اجتناب برتتا ہے مگر مخلص پھر بھی باز نہیں آتا۔ اس سے یہ بات

سامنے آتی ہے کہ ہندو دہریہ ہو جاتا ہے تب بھی اسے وہ مذہب کے اتنا خلاف نہیں ہوتا۔ جتنا کہ مسلمان دہریہ بن جانے کے بعد ہو جاتا ہے۔

بنگال کے عوام بڑے خوش عقیدہ ہوتے ہیں۔ وہ مذہب سے زیادہ واقف نہیں ہوتے مگر ان کے دلوں میں مذہب اور مذہبی لوگوں کا بڑا احترام ہوتا ہے ان کی اس سادگی سے زمانہ ساز پیر بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس ناول میں ایسے ہی ایک پیر کو نذرانے وصول کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مجید صاحب بروقت آکر اس کی قلعی کھول دیتے ہیں اور وہ بھاگ نکلتا ہے۔

مولانا مستنصر باللہ اور ان کے پیر صاحب سچے پیروں اور باشعور... مولویوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔ مولانا مستنصر باللہ فاضل دیوبند اور حاجی ہیں۔ جمعدار صاحب کا قائم کیا ہوا مدرسہ انہی کی نگرانی میں چلتا ہے۔ ان کا کمیونزم کے بارے میں اتنا مطالعہ ہے کہ وہ جلودھر اور مخلص کو خود انہی کے لٹریچر کے حوالے دے کر خاموش کر دیتے ہیں۔ مخلص بھی ان کی قابلیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ کمیونزم کے مخالف ہونے کے باوجود مجید صاحب کی طرح وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جلودھر اور مخلص بہت سے مسلمانوں سے بہتر انسان ہیں۔

قصہ میں شگفتگی پیدا کرنے کے لیے مصنف نے ایک مزاحیہ کردار بھی پیش کیا ہے۔ ان کے عمدہ میاں میں خوجی کی ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے۔ انکا حلیہ ملاحظہ ہو: "جیسا ان کا نام عمدہ تھا ویسے ہی ان کا قد بھی تھا وہ تھے تو پھول محمد سے ۶۔۵ سال بڑے لیکن قد میں دو تین انگل چھوٹے ہی تھے۔ ان کے چہرے پر داڑھی مونچھ بھی کچھ اس طرح جلوہ نما تھی جیسے کسی بنجر زمین میں کہیں کہیں گھاس اگ آئی ہو مگر جتنا قد

چھوٹا تھا اتنا ہی مزاج تیز تھا اور جواں مردی کی نمائش کچھ اس سے بھی زیادہ ... پھول محمد کو موقع بے موقع ڈانٹ پھٹکار دیتے۔ کھیل کود میں اس کے ساتھ شریک تو ہوتے مگر ذرا بزرگ بن کے۔ لیکن کہاں پھول محمد کہاں عمدہ میاں۔ کبڈی میں عمدہ میاں ہمیشہ دھر لیے جاتے اور پھول محمد کتنوں کو مار کے صاف نکل آتا بالآخر عمدہ میاں نے اسی میں مصلحت دیکھی کہ وہ خود چچا بنے رہیں اور بھتیجے کو پیش پیش رکھیں۔!

عمدہ میاں ایک خوشحال بیوہ عمدہ بی بی سے شادی کر لیتے ہیں اتفاق سے ان کی بیوی اور بھاوج میں لڑائی ہو جاتی ہے وہ اپنی بیوی کی حمایت میں اپنے بڑے بھائی جیر باپ سے بھڑ جاتے ہیں اور ان کی اچھی خاصی پٹائی ہو جاتی ہے۔ اس لڑائی کے بیان کے سلسلے میں بعض بڑے خوبصورت طنزیہ جملے پیش کیے ہیں لکھتے ہیں "ایک دوسرے کی سات پشتوں کو وہ فرمائشی گالیاں دی گئیں کہ مرحوموں کی ہڈیاں بھی قبر میں کروٹیں لینے لگی ہوں گی" جھگڑے کے بعد دونوں میں بٹوارہ ہو گیا لکھتے ہیں "کھیت بٹ گیا۔ دل بٹ گئے۔ اور دل ٹھہرا خدا کا گھر اس لیے خدا کا گھر کیسے نہ بٹتا"

جلو دھر اور مخلص لوگوں کو مشتعل کر کے سرت ساہا کی دکان لٹوانے لے گئے تو بے چارے عمدہ میاں بہادری کا مظاہرہ کرنے کے لئے آگے آ گئے تھے۔ لہٰذا پولیس کی گولی کا نشانہ بن گئے شاید مصنف نے اس کردار کی اتنی ہی ضرورت محسوس کی ہو اس لیے اسے جلد ہی منظر سے ہٹا لیا۔

ممکن ہے آپ ڈاکٹر فاروقی کی اس رائے سے اتفاق نہ کریں کہ طرز ادا کے لحاظ سے اس دور کا کوئی ناول اس سے لگا نہیں کھاتا۔

خدا کی بستی

شوکت صدیقی

بیشتر ناولوں کی طرح اس ناول کو پڑھ کر بھی پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو پیش کرنے سے مصنف کی غایت کیا ہے۔

شروع میں تین گمراہ لڑکوں کا قصہ ہے۔ پھر کچھ بدمعاش سامنے لائے جاتے ہیں۔ مثلاً نیاز خان بہادر اور ڈاکٹر موٹو۔ کچھ جرائم پیشہ لوگ مثلاً شاہ جی اور استاد پیڈرو وغیرہ اس کے بعد اسکاؤٹ لڑکوں کا قصہ ان کی سماجی خدمت۔ ان کا خلوص۔ ایثار اور بے نفسی۔ ان میں سے کس چیز کی پیش کش کو مصنف کی غایت قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک جانب سماجی برائیاں اور جرائم ہیں۔ دوسری جانب اسکاؤٹ لڑکوں کی جماعت ہے۔ جنھوں نے عوام کی خدمت اور ان کی اصلاح کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ زندگی کے ان دو سروں میں ایک تعلق ہے۔ غور کرنے پر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاید مصنف کا منشا ایک ایسی جماعت کے کارنامے بیان کرنا ہے جو اپنے ایثار اور قربانی سے ان سماجی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابتدا میں تین آوارہ قسم کے لڑکے تاش کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی عمر تقریباً چودہ، پندرہ سال ہے۔ ان کا سرغنہ راجہ ہے۔ اس کے آوارہ اور گمراہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کوئی اس کے آگے پیچھے نہیں ہے۔ اس کا باپ اور بھائی فسادات میں مارے گئے۔ ماں نے لاہور میں رنڈی کا پیشہ اختیار کر لیا اور راجہ کو یتیم خانے میں داخل کروا دیا۔ جہاں اس نے بھیک مانگنا سیکھا۔ آخر کار وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس وقت وہ

ایک کوڑھی کی گاڑی دھکیلتا ہے وہ اسے اس کے عوض کچھ پیسے دے دیتا ہے۔ ان پیسوں میں جتنی بھی گنجائش نکل سکتی ہے وہ آوارگی کر لیتا ہے۔ تاش کھیل لیتا ہے۔ کبھی کبھار سینما اور تھیٹر دیکھ لیتا ہے اسے کوئی ٹوکنے والا نہیں اسے کسی کا خوف نہیں۔ اس کی ذہنی حالت اور اس کی بے کسی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے کوڑھی کا حلیہ ملاحظہ کیجیے "دھندلی دھندلی نیلگوں روشنی میں گداگر بھوتوں کی طرح کریہہ المنظر نظر آرہا تھا۔ اس کی گندھی داڑھی بکھری ہوئی تھی اور اس کے بال جھک کر آنکھوں پر آ گئے تھے۔ وہ اس کے سر پر کھڑا ہوا اپنے رستے ہوئے زخموں کو تیزی کے ساتھ کھجا رہا تھا"

دوسرا لڑکا نوشا ہے اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس ایک بڑی بہن ہے جو اکثر اس کی پردہ پوشی کرتی رہتی ہے۔ اس کی ماں ہے جو اسے تنبیہ کرتی رہتی ہے۔ مگر وہ اس کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ وہ ایک مکینک کے یہاں کام کرتا ہے۔ گھر آنے کے بعد اسے بھی راجہ کے ساتھ آوارگی کا وقت مل جاتا ہے۔ تیسرا لڑکا شامی ہے۔ اس کا باپ بہت سخت آدمی ہے۔ اس کی خوب پٹائی کرتا ہے۔ مارنے کا انداز یہ ہے کہ جو چیز ہاتھ میں آ جائے اٹھا کر دے مارتا ہے۔ شامی کا سر اور پیشانی کئی مرتبہ لہولہان ہو چکے تھے۔ باپ کے خوف سے وہ ان دونوں کے ساتھ زیادہ آوارگی نہیں کرتا۔ جب یہ تینوں گھر سے بھاگتے ہیں تو شامی راستہ ہی سے گھر لوٹ جاتا ہے اور وہ منظر سے ہٹ جاتا ہے۔

ان لڑکوں کے قصے کے ذریعہ شاید مصنف نے یہ بتایا ہے کہ اگر اس عمر کے لڑکے تعلیم سے محروم رہیں۔ انہیں ترتیب نہ ملے اور ان پر مناسب روک ٹوک نہ ہو تو ان کی آوارگی اور بے راہ روی کیا کیا رنگ اختیار کر سکتی ہے۔

ناول کی کہانی میں سب سے زیادہ حصہ نوشا لیتا ہے اس لیے اس کی شخصیت کی تشکیل اور اس کے نشیب و فراز پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس میں مجرمانہ ذہنیت نیاز پیدا کرتا ہے جو اسے ترغیب دیتا ہے کہ عبداللہ مستری کے کارخانہ سے پرزے چرا لایا کرے اور اس کے ہاتھ بیچ دیا کرے۔ شروع میں وہ جھجکتا ہے مگر بعد میں وہ عادی چور بن جاتا ہے ایک دن اس کی چوری پکڑی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ہو سکتا ہے کہ مستری سخت سزا دے۔ مارے پیٹے اور نوکری سے نکال دے مگر جس قسم کی سزا عبداللہ مستری دیتا ہے اس میں کچھ مبالغہ نظر آتا ہے۔ اس نے ایک کیل دیوار میں ٹھونکی۔" عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح آپس میں پھنسائیں کہ انگلیاں ہتھیلی کے اندر ہی رہیں اس کے بعد اس نے نوشا کو اٹھا کر کیل پر لٹکا دیا اور عین اس کے تلووں تلے فرش پر دو کیلیں گاڑ دیں جن کے نوکیلے سرے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔" اس کے بعد اس نے نوشا سے ڈانٹ کر کہا "دیکھ بے ہاتھ چھوڑے تو سمجھ لینا سالے دونوں پوری اندر اتر جائیں گی۔" ظاہر ہے نوشا تکلیف سے بلبلا کر رونے لگا تو مستری نے ڈانٹ کر کہا "سالے رات بھر لٹکاؤں گا تو نے مجھے سمجھا کیا ہے۔" اس دوران عبداللہ مستری اطمنان سے وسکی پیتا رہا۔ نشہ کی ترنگ میں گاتا رہا۔ نوشا کی ٹانگیں لوہے کی اسپرنگ کی طرح زور زور سے کانپ رہیں تھیں اور ذبح ہونے والے بکرے کی مانند گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کی کھال پھٹ گئی تھی اور ان سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ہاتھ لہولہان ہو چکے تھے اس نے پیشاب بھی کر دیا تھا آخر کار مستری نے اسے اتارا اور زور سے اس کے ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیے۔

نوشا کو عبداللہ مستری نے نوکری سے نکال دیا تھا۔ ادھر راجہ کے کوڑھی کو پولیس نے پکڑ کر محتاج خانے پہنچا دیا تھا۔ اس طرح راجہ بھی بے روزگار ہو گیا تھا۔ یہ دونوں ساتھ آوارہ گردی کرتے پھرتے تھے۔ اتفاق سے ان کی ملاقات ایک سائیکل والے مجید سے ہو گئی۔ اس کے مشورے سے ان دونوں نے راشن کے دفتر کے سامنے کھڑی ہوئی سائکلوں میں پنکچر کرنا شروع کر دیا۔ مجید کے پاس کام آنے لگا۔ وہ ان دونوں کو پیسے دیتا رہا۔ ایک دن ایک شخص نے راجہ کو پنکچر کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ اسے ان لوگوں نے اس قدر مارا کہ اس کی گردن اکڑ گئی۔ آنکھ سوج گئی اور ٹانگوں میں بھی چوٹ آئی۔ نوشا وہاں سے بھاگ نکلا تھا اس لیے بچ گیا۔ اس کے بعد یہ دونوں پھر بے روزگار ہو گئے۔ آخر کار دونوں نے کراچی روانہ ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اتفاق سے شامی کے باپ نے ڈاکٹر موٹو کی شکایت پر اس کی خوب پٹائی کی تھی اس لیے وہ بھی ان دونوں کے ساتھ کراچی جانے پر راضی ہو گیا۔

تینوں روانہ ہوئے مگر شامی راستے ہی میں سے چپ چاپ کھسک لیا اور گھر واپس آ گیا۔ یہ دونوں کراچی پہنچ گئے۔ گاڑی رات کو دیر سے پہنچی۔ اس لیے یہ دونوں پلیٹ فارم پر ہی پڑ گئے۔ وہاں ایک دبلے پتلے سے مریل آدمی کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ بردہ فروش تھا اس کا نام رحمان تھا۔ یہ انھیں بہلا پھسلا کر کام دلانے کے بہانے ایک بدمعاش شاہ جی کے اڈے پر لے گیا اور اس کے ہاتھ پندرہ سو پر بیچ دیا۔ شاہ جی نے ان کے لیے نئے کپڑے بنوائے ان کی خاطر مدارت کی۔ کچھ دن اسی طرح گزر گئے پھر شاہ جی نے انھیں نور خان کے سپرد کر دیا۔ نور خان انھیں لے کر پہلے جمشید روڈ کی کوٹھیوں کی طرف

لے گیا کہ انھیں کسی کوٹھی میں کام مل جائے انہیں ہدایت کی کہ جتنی تنخواہ دیں اسے قبول کر لیں یہاں کام نہیں بنا تو ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف لے گیا۔ وہاں راجہ کو ایک کوٹھی میں نوکری مل گئی۔ یہ ایک انجینئر کا مکان تھا۔ نور خان نے اسے ہدایات دیں کہ وہ ہر چیز کا پتہ لگائے کہ نقدی کہاں کہاں رکھی جاتی ہے۔ ان ٹرنکوں کو دیکھ لے جن میں قیمتی سامان رکھا جاتا ہے بیگم صاحبہ اس پر بڑی مہربان تھیں۔ راجہ کو اس خیال سے وحشت ہو رہی تھی کہ ایسے مہربان لوگوں کے گھر میں وہ چوری کرانے کا ذریعہ بنے۔

بہر حال اپنی مرضی کے خلاف راجہ نے مجبور ہو کر ایک منصوبے کے تحت اس مکان میں چوری کروادی۔ چوری میں شاہ جی خود بھی شریک تھا گھر آ کر شاہ جی نے راجہ اور نوشا کو گھر ہی میں چھپے رہنے کی تاکید کردی۔ ان کے لیے سگریٹ کے پیکٹ۔ تاش اور کیرم بورڈ کا بھی انتظام کر دیا۔

شاہ جی نے ان دونوں کا ایک اور بردہ فروش سے سودا کر لیا بیعانہ بھی لے لیا مگر یہ دونوں پائپ کے ذریعے گلی میں اتر کر بھاگ نکلے۔ چھپتے چھپاتے ایک خانقاہ میں جا کر پناہ لی۔ وہاں غلیظ چرسیوں کے درمیان خانقاہ کا لنگر کھایا۔ یہاں پولیس کے آدمی کسی کو تلاش کرتے ہوئے آگئے۔ اس لیے انھوں نے یہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا آخر کار راجہ کے مشورے سے یہ انجینئر کی کوٹھی پر پہنچے اور ساری روئیداد بیگم صاحبہ کو سنادی۔ شاہ جی اور ان کا گروہ ان کی مخبری سے گرفتار ہو گیا مگر ان دونوں کو ریمانڈ ہوم یعنی بچوں کی جیل بھیج دیا گیا۔

اس قسم کا ایک واقعہ شوکت صدیقی کی زندگی میں بھی پیش آیا تھا ان کے یہاں ایک لڑکا ملازم تھا اس نے اسی طرح اپنے گروہ کے

ذریعہ ان کے یہاں چوری کروائی تھی آخر کار چور "زندہ پیر" کے مزار سے پکڑا گیا تھا۔

راجہ کے اس رویہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ابھی مجرمانہ ذہنیت پختہ نہیں ہوئی ہے۔ وہ صرف گمراہ تھا اگر حالات سازگار ہوتے تو وہ ایک نارمل انسان بن سکتا تھا۔

ریمانڈ ہوم کا مقصد کم عمر بچوں کی اصلاح ہوتا ہے۔ مگر یہاں چھوٹے چھوٹے جرائم کا ارتکاب کرنے والے لڑکوں کو ایسے لڑکوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ جو چاہے عمر میں کم ہوں مگر ان میں مجرمانہ ذہنیت پختہ ہو چکی ہے۔ پوکر ایسا ہی لڑکا تھا اس کی عمر سولہ سال سے کچھ اوپر تھی۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اس نے ایک رکشا ڈرائیور کو چاقو مار کر زخمی کر دیا تھا۔ اسے اس جرم میں سزا ہوئی تھی۔ وہ اپنے مجرمانہ کارنامے فخریہ سنایا کرتا تھا۔ بات بات پر گالی دیتا تھا۔ ریمانڈ ہوم کے سارے لڑکے اس سے ڈرتے تھے اس نے نوشا کو جیب کاٹنے کا فن سکھایا۔ ایک اور لڑکے افلاطون نے اسے تالا توڑنا سکھایا۔

نوشا اور پوکر کو ایک ساتھ رہائی ملی تھی۔ گویا نوشا یہاں سے جیب کاٹنے اور تالا توڑنے کا فن سیکھ کر نکلا تھا۔ راجہ کو ریمانڈ ہوم ہی میں کوڑھ ہو چکی تھی۔ اس لیے اسے ہسپتال بھیج دیا گیا۔

پوکر کی معیت میں نوشا کی ملاقات استاد پیڈرو سے ہوئی جو پوکر اور اس جیسے بہت سے لڑکوں کا استاد اور سرغنہ تھا۔ استاد پیڈرو کے گروہ میں باجوہ، چکرم، کالیا، قادر اور پنچھی وغیرہ اور بھی کئی افراد تھے۔ استاد پیڈرو نے ایک رجسٹر بنا رکھا تھا۔ جس میں روزانہ ہر آدمی کی آمدنی درج ہوتی تھی۔

استاد پیڈرو اپنے آدمیوں کو اب بھی وقتاً فوقتاً جیب تراشی کا ہنر سکھاتا رہتا تھا۔ ان جیب تراشوں کے مختلف درجے تھے۔ ان میں سینئر بھی تھے اور جونیئر بھی۔ جیکرم استاد پیڈرو کا نائب تھا۔ ان لوگوں کو اپنی لائی ہوئی رقم میں سے اپنی حیثیت کے مطابق حصہ ملتا تھا۔

استاد پیڈرو نے نوشا کی شاگرد بنانے کی رسم باقاعدہ ادا کی دھلا ہوا جوڑا پہنا۔ مصلی بچھایا۔ بیس روپے کی مٹھائی منگوا کر اس پر نیاز دی۔ اس کے گلے میں ہار ڈالے اور اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھی گویا اس طرح اسے باقاعدہ شاگرد بنا کر اپنے گروہ میں داخل کر لیا۔

نوشا پوکر اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ جیب تراشی کیلئے جانے لگا۔ کچھ عرصہ بعد وہ اس فن میں خاصا منجھ گیا۔ استاد کے حکم کے برخلاف وہ کبھی کبھی اکیلا بھی ہاتھ صاف کر دیا کرتا تھا۔

ایک دن وہ شکار کی تلاش میں پھر رہا تھا کہ اسے ایک گداگر کی آواز سنائی دی۔ اس نے آواز پہچان لی۔ یہ راجہ تھا۔ اس کے جسم پر بے حد غلیظ لباس تھا۔ بڑے بڑے بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں جسم پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ نوشا کے اسے پکارنے پر اس نے بھی خوشی سے چیخ کر اس کا نام پکارا۔ نوشا کو اس کی حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اسے ہسپتال بھیجا گیا تھا۔ ہسپتال والوں نے اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی اور اسے کوڑھیوں کے ہسپتال بھیج دیا وہاں سے چوکیداروں نے زبردستی اٹھا کر اسے ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ اس نے نوشا سے التجا کی کہ وہ اسے ایک بیساکھی دلوا دے۔

نوشا نے وعدہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً راجہ کے پاس جاتا رہا اسے راجہ کی مدد کر کے بڑی خوشی ہوتی۔

نوشا راجہ کو علاج کے لیے ایک ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا مگر وہ علاج کرنے پر راضی نہ ہوا۔ پھر وہ اسے ایک حکیم کے پاس لے گیا۔ حکیم نے کہا اس کا علاج ہو سکتا ہے مگر اس کے علاج پر ڈھائی سو روپے صرف ہونگے۔

نوشا نے تھوڑی رقم استاد پیڈرو سے پوشیدہ رکھنی شروع کی ایک دن نوشا نے چاقو دکھا کر ایک آدمی سے پرس چھین لیا۔ آدمیوں کے قدموں کی چاپ سن کر نوشا نے اس آدمی کے سینے پر چاقو رکھ کر اسے خاموش رکھنا چاہا وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر "بچاؤ، بچاؤ" چیخنے لگا۔ نوشا اندھیری گلی میں بھاگنے لگا۔ وہ راہ گیر پولیس کے کانسٹیبل تھے۔ انھوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں لوگ اس کے تعاقب میں بھاگے۔ وہ ایک کھڑکی کے ذریعہ ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ یہ پروفیسر کلیم اللہ کا مکان تھا۔ پروفیسر نے اسے پناہ دے دی۔ خطرہ ٹل جانے کے بعد نوشا وہاں سے چل کر اپنے اڈے جا پہنچا۔ نوشا نے جو پرس مارا تھا اس میں ۱۸۰ روپے تھے نوشا یہ رقم راجہ کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے پتلون کی مہری میں چھپا لئے تھے۔ چکرم نے نوشا کی تلاشی لی تو اسے پتہ نہ چل سکا مگر استاد کی تیز نظروں نے بھانپ لیا کہ مال کہاں چھپا ہے۔ اس نے مہری پر ہاتھ ڈال کر نوٹ نکال لیے۔

استاد نے پہلے تو اپنے ایک شاگرد قادر سے ٹھڈے لگوائے قادر بڑا کڑیل جوان تھا۔ اس پٹائی سے نوشا مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ نوشا کی حالت دیکھ کر استاد نے قادر کو روک دیا۔ نوشا

نے بہت ہی معافی مانگی اور توبہ کی مگر استاد بر کوئی اثر نہ ہوا اس کے استاد نے نوشا کو بلانے کے لیے "زندہ طلسمات" یعنی قارورہ منگوایا۔ نوشا بہت ہی چیخا چلایا مگر ایک نہ سنی گئی۔ ایک جیب کترا اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور حکیم نے قارورے سے کئی قطرے اس کے حلق میں ڈال دیے۔ نوشا کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ وہ زور زور سے ابکائیاں لے رہا تھا استاد نے اس سے کہا اب ادھر کا رخ نہ کرنا۔ استاد کو پولیس کا ڈر اس لیے نہیں تھا کہ وہ دو ہزار روپے ماہانہ تھانے میں دیا کرتا تھا۔

نوشا کئی دن تک کام تلاش کرتا رہا۔ رات ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں گزار دیتا۔ آخر کار اسے ورکشاپ میں موٹروں کے کلینر کا کام مل گیا۔ ایک دن وہ پروفیسر کلیم اللہ سے ملنے گیا پروفیسر کو بڑی خوشی ہوئی کہ نوشا نے اپنا پرانا دھندہ چھوڑ دیا ہے اور اس نے ایک ورکشاپ میں نوکری کر لی ہے۔ نوشا نے اس سے کہا کہ اس کے رہنے کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لیے وہ مسافر خانے میں پڑا رہتا ہے۔ پروفیسر اسے اپنے ہاں رکھنے پر راضی ہو گیا۔

کلیم اللہ فلسفہ کا پروفیسر تھا۔ اس مضمون کے پروفیسروں کے بارے میں بڑے بڑے لطیفے مشہور ہیں۔ لہٰذا مصنف نے بھی پروفیسر کلیم اللہ کو اسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ ان کا نوشا کے ساتھ تمام تر رویہ خلاف قیاس ہے۔ نوشا کو پہلی مرتبہ پروفیسر نے جس حالت میں دیکھا تھا اس کے بعد اسے کوئی پڑھا لکھا اور معقول انسان تو کیا کوئی مزدور بھی اپنے ہاں جگہ دینے پر راضی نہ ہوتا۔ خصوصاً اس حالت میں جب اس کی جوان بیٹی بھی ہو۔

نوشا کو اپنے ہاں جگہ دینے کا وعدہ کرنے کے بعد وہ اپنی نوجوان

بیٹی نادرہ سے اس کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں "نادرہ ان سے ملو یہ نوشا ہیں میرے دوست۔ اگر تم کو دوست کے لفظ پر اعتراض ہے تو میں اس لفظ کو واپس لیے لیتا ہوں بہر حال یہ ہمارے مہمان قرار ہیں ہمارے ساتھ ہی ٹھہریں گے۔"

اس طرح اگر کسی عزیز کا یا ملنے والے کا نوجوان لڑکا گھر آئے تب بھی لوگ اسے ایسی جگہ ٹھہرائیں گے جہاں ان کی لڑکی سے کم سے کم سابقہ پڑے۔ وہ دونوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ پروفیسر کلیم اللہ اس کے برعکس نوشا جیسے جاہل اور عجیب تراشش، مجرمانہ انداز رکھنے والے کو اپنی تعلیم یافتہ لڑکی سے آزادانہ ملنے جلنے بلکہ عشق لڑانے کا موقع دے دیتا ہے۔ یہ رویہ قطعی خلاف قیاس ہے۔

نادرہ پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اسے نوشا میں جس طرح دلچسپی لیتے دکھایا گیا ہے وہ ناممکن تو نہیں لیکن کچھ خلاف قیاس سا لگتا ہے نوشا دیر سے آتا ہے تو نادرہ بے چین رہتی ہے۔ اس سے کھانے کے لیے پوچھتی ہے۔ نوشا خفا ہو جاتا ہے تو وہ اسے مناتی ہے اس کے کمرے میں کھانا لے کر آتی ہے۔ اس کی محبت بھری ڈانٹ پھٹکار کا یہ اثر ہوا کہ نوشا میں خاصی شائستگی پیدا ہو گئی تھی۔ پروفیسر سے نوشا کی ملاقات صرف ناشتہ کی میز پر ہوتی تھی باقی خبر گیری نادرہ ہی کرتی تھی۔

نوشا کو چھیڑنے کے بعد نادرہ اس سے کہتی "معاف کرنا نوشا مجھے تم سے ایسی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ میں اپنی غلطی کی تم سے معافی چاہتی ہوں۔" حالات ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے کہ نوشا کی قمیض کے بٹن ٹوٹ جاتے یا کوئی کپڑا پھٹ جاتا تو وہ نادرہ کے سر پر سوار

ہو ... سے ٹھیک کرواتا۔ کبھی خوشامد کرتا کبھی ناراض ہوتا اور اپنا کام کروائے بغیر نہ ٹلتا۔

نادرہ نوشا کو پڑھانے لگی۔ ایک دن ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کمرے کے اندر ہوا کے نرم نرم بھیگے ہوئے جھونکے آ رہے تھے نادرہ کے مزاج میں رومانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ نوشا سے پہلے تو یہ پوچھتی ہے کہ "نوشا کبھی تم نے کسی لڑکی سے محبت کی ہے" اس کے نفی میں جواب دینے کے باوجود اس سے پوچھتی ہے "تم نے کسی لڑکی کے ہونٹوں کو چوما ہے" اس کے بعد وہ نوشا کو ایسی نظروں سے دیکھتی ہے کہ نوشا بے اختیار ہو کر اس کے لبوں کو چوم لیتا ہے۔ پروفیسر نے یہ تمام منظر دیکھ لیا۔ اس نے نوشا سے کہا کہ وہ فوراً کمرہ خالی کر دے۔ اس وقت وہ جو گفتگو کرتا ہے وہ کس قدر خلاف قیاس اور احمقانہ ہے۔ کہتا ہے "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو۔ جیب کترے ہو، اٹھائی گیرے ہو۔ میں تم کو اس بات کا حق ہرگز نہیں دے سکتا کہ تم میری لڑکی کے ساتھ فلرٹ کرو۔ تم اور نادرہ مل کر کبھی ایک مکمل اکائی نہیں بن سکتے۔ وہ خط مستقیم ہے اور تم خط منحنی۔ دو غیر مساوی مقداریں۔ تم مسئلہ فی التناسب سمجھتے ہو" ایسے موقع پر انسان انتہائی غیض و غضب کی حالت میں ہوتا ہے اس قسم کی نیم فلسفیانہ اور حماقت آمیز باتیں نہیں کرتا۔

پروفیسر کے گھر سے نکلنے کے بعد نوشا نے طے کر لیا کہ اب وہ اپنے شہر چلا جائے گا اپنی ماں اور بھائی بہن کے پاس۔

جب انسان کسی چیز کو شدت سے پسند کرتا ہے یا ناپسند کرتا

ہے تو اکثر اس کے بیان میں مبالغہ آ ہی جاتا ہے "خدا کی بستی" میں دونوں قسم کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب ناول نگار قصہ میں INVOLVE ہو جائے۔

عبداللہ مستری کی سزا میں کافی مبالغہ نظر آتا ہے۔ کسی حد تک استاد پیڈرو کی سزا اور ریاپ کے ہاتھوں شامی کی پٹائی میں بھی مبالغہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح انو کی جس طرح قدر دانی کی جاتی ہے وہ جس قدر قیمت کے عوض خریدا جاتا ہے اس میں بھی کچھ مبالغہ نظر آتا ہے۔

اسی طرح اسکائی لارکوں کی جماعت کے تذکرے میں بھی کافی مبالغہ نظر آتا ہے۔ جس معاشرہ میں راجہ، نوشا اور شامی جیسے آوارہ اور گمراہ لڑکے ہوں۔ ڈاکٹر موٹو جیسا قاتل ڈاکٹر ہو۔ نیاز اور خان بہادر جیسے بدمعاش لوگ ہوں اور ان لوگوں کے آلہ کار بننے والے غریب ہوں اس معاشرے میں کوئی امید کی کرن بھی ہونی چاہیے۔ شوکت صدیقی نے "فلک پیما" کو اسی مقصد کی خاطر پیش کیا ہے۔

"فلک پیما" کا بانی صفدر بشیر کیمبرج میں معاشیات کا طالب علم تھا۔ باپ کی موت کی خبر سن کر وہ پاکستان آ گیا۔ اس کے باپ کی جائیداد اس کے بھائی بہنوں میں تقسیم ہو کر اس کے حصہ میں ایک کوٹھی اور ۸۰ ہزار روپے آئے۔ صفدر بشیر ۱۹۴۲ کی تحریک سول نافرمانی میں شریک ہو کر جیل بھی جا چکا تھا۔ وہ کٹر قسم کا نیشنلسٹ تھا۔ اس نے اپنے ہم خیال دوستوں سے مل کر عوام کی خدمت کے لیے ایک انجمن قائم کی جس کا نام "فلک پیما" رکھا گیا۔ اس کا ہر رکن اسکائی لارک کہلانے لگا۔ صفدر بشیر نے

اپنا تمام روپیہ فلک پیما کے لیے وقف کر دیا تھا۔

صفدر بشیر کے ۸ ہزار روپے کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی۔ قومی کاموں کے لیے ساری جائدادیں وقف کر ڈالنے کی اکاد کا مثالیں مسلمانوں میں مل جاتی ہیں۔ ویسے یہ جذبہ ہماری قوم میں کم ہی ہوتا ہے۔ شاید شوکت صدیقی کے ذہن میں بہار کی ایک مثال ہو۔ پٹنہ میں ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا سیشن ہوا تھا۔ اس کے اخراجات کے لیے بہار کے ایک بیرسٹر عبدالعزیز نے اپنی جائداد بیچ ڈالی تھی۔ ایسی جذباتی مثالیں تو پھر بھی مل جاتی ہیں۔ مگر منصوبہ بندی کے تحت کسی بڑی رقم کو وقف کر کے مستقل صورت پیدا کرنے کی مثال شاید ہی ملے۔

بحرحال صفدر بشیر جس طرح تن تنہا اپنا پیسہ خرچ کرتے ہیں اور جس بے لوثی سے خدمت کرتے ہیں وہ قرین قیاس نظر نہیں آتا۔

فلک پیما سمجھتے ہیں کہ لوگوں کے نیاز اور خان بہادر جیسے لوگوں کے آلہ کار بن جانے کی ایک اہم وجہ تعلیم کی کمی بھی ہے۔ فلک پیما اس کمی کو دور کرنے کے لیے تعلیم بالغاں کے مرکز کھولتے ہیں۔ اسی طرح کے چند مرکز حیات اللہ انصاری نے لکھنؤ میں کھولے تھے ان میں سے ایک مرکز میں شوکت صدیقی پڑھاتے تھے۔

لکھنؤ میں بیماری پھیل جانے کے زمانہ میں ان لوگوں نے غریب بستیوں میں مفت دوا کا بھی انتظام کیا تھا۔ بستی میں ملیریا پھیل جاتا ہے تو اسکائی لارک بھی اسی طرح لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ ریلیف کیمپ کھولتے ہیں مفت دوائی دیتے ہیں۔ طبی امداد کے نگران ڈاکٹر زیدی ہیں۔ ان کے کیمپ میں ہر وقت مریضوں کا ہجوم رہتا تھا سرکاری ہسپتال کے بجائے لوگ اس کیمپ میں آتے تھے۔

آخر کار ملیریا کی وبا ختم ہو گئی۔ فلک پیما نے محسوس کیا کہ غریبوں کے لیے ایک مستقل ہسپتال قائم کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے دوڑ دھوپ کر کے اس مقصد کے لیے ایک پلاٹ بھی الاٹ کروا لیا۔ یہاں چند خاندان ناجائز طور پر قابض تھے۔ وہ کسی طرح جگہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس علاقہ کے تعلیم بالغاں کے مرکز کا نگران سلمان تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں سے اس کا ذکر کیا۔ بستی کے لوگوں کی کوشش سے ناجائز قابضین نے یہ جگہ چھوڑ دی۔

اسکائی لارک ہسپتال تعمیر کرنے کے منصوبے بنا ہی رہے تھے کہ اس دوران خان بہادر فرزند علی صفدر بشیر کی کوٹھی پر آئے ہسپتال کی تعمیر کے لیے بیس ہزار کا چیک پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ ہسپتال کے اخراجات کے لیے دواؤں کے لائسنس حاصل کیے جائیں۔ یہ لائسنس ضرورت سے دگنے ہوں تاکہ نصف کام میں لیں اور نصف بلیک میں بیچ دیں۔ صفدر بشیر نے اس تجویز پر غور کرنے کی مہلت چاہی۔ خان بہادر نے خواہش ظاہر کی کہ اسے بھی گفتگو کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کی تقریر سے سب سے زیادہ متاثر سلمان ہوا۔ وہ ایسے نیک مقصد کی خاطر بینک لوٹنے اور سرمایہ داروں کی تجوریاں توڑنے تک کو جائز سمجھتا تھا علی احمد اس تجویز کی تہہ تک پہنچ گیا اس نے مدلل اور موثر تقریر کے ذریعہ خان بہادر کی تقریر کے اثر کو زائل کر دیا۔ اس نے کہا کہ خان بہادر اور اسکائی لارکوں کی راہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح خان بہادر کا چیک واپس کر دیا گیا۔

خان بہادر خاموش بیٹھنے والا آدمی نہ تھا اس نے راتوں رات اس پلاٹ پر مسجد کی قدِ آدم دیواریں بنوادیں اور اپنے آدمیوں سے فجر کی نماز پڑھوادی۔

اسکائی لارکوں نے مسجد سے متعلق تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ اس سلسلہ میں حکومت سے رجوع کرنا چاہیے وہ علی احمد کی سربراہی میں کلکٹر سے ملے۔ کلکٹر نے انھیں بتایا کہ خان بہادر بھی ایک وفد لے کر اس سے مل چکے ہیں۔ کلکٹر نے اس معاملے کی تحقیقات کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اسکائی لارکوں نے گڑبڑ کی تو وہ سب کو بند کر دے گا

خان بہادر نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جس کے تمام اراکین اسی کے آدمی تھے۔ مسجد کے ساتھ دکانیں بھی بنادی گئیں اور ان دکانوں کی پگڑی بھی وصول کر لی گئی۔

مسجد والے واقعہ سے اسکائی لارک اتنے بددل ہو گئے کہ فلک پیما کا شیرازہ بکھرتا نظر آنے لگا۔ مگر علی احمد کی تجویز سے اسٹڈی سرکل قائم ہوا اور رفتہ رفتہ ان میں پھر وہی جوش و خروش نظر آنے لگا۔ اسکائی لارکوں نے طے کیا کہ بستی ہی میں فلک پیما کا ہیڈ کوارٹر بنوایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی داغ بیل ڈالی۔ بنیادیں کھودیں اور دیواریں کھڑی کرنی شروع کر دیں۔ یہ بات بظاہر بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ مگر آپ نے کسی مکان کی تعمیر کا مشاہدہ کیا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اناڑی آدمی نہ داغ بیل ڈال سکتا ہے نہ بنیاد کھود سکتا ہے نہ دیوار اٹھا سکتا ہے۔ راج کے ساتھ مدتوں کام کرنے کے بعد مزدور ۲-۳ اینٹ بھی سیدھی نہیں لگا سکتا۔

مصنف یہاں مثالیت پسندی اور سبق آموزی کا شکار ہو

گئے ہیں۔

فلک پیما کے کارنامے۔ ان کی خدمات بلکہ ان کا پورے کا پورا بیان مثالیت پسندی میں ڈوبا ہوا ہے۔ صفدر بشیر کا ایثار ڈاکٹر زیدی کی خدمات اسکائی لارکوں کے مشنری جذبات مثالیت پسندی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انڈسٹریل ہوم تک تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر صفدر بشیر کے دیے ہوئے بیس ہزار سے بینک قائم کرنے کا تصوّر اس زمانہ کو سامنے رکھتے ہوئے بھی مضحکہ خیز لگتا ہے جب کہ یہ ناول شائع ہوا تھا اور روپے کی قیمت اتنی نہیں گری تھی۔ اتنی مثالیت تو پریم چند کے سیاسی کرداروں میں بھی نظر نہیں آتی۔

مصنف کو اشتراکی تحریک سے جو غیر معمولی لگاؤ ہے اس کی محبت میں انھوں نے خیالی جنت تعمیر کی ہے۔

اسکائی لارکوں کی خدمات میں اشتراکی کارکنوں کے بجائے جماعت اسلامی کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ الیکشن کے زمانے میں اسکائی لارکوں کی حالت یہ تھی: "اسکائی لارکوں کا طریقۂ کار بہت سیدھا سادھا تھا دیسی کپڑے کا موٹا جھوٹا لباس پہنتے ہاتھوں میں پٹ سن کے تھیلے ہوتے۔ جن میں پوسٹروں۔ ہینڈ بلوں اور پمفلٹوں کے علاوہ گڑ اور چنے بھی ہوتے"

اس قدر ایثار اور ایسی خدمت کی توقع ہم کسی جماعت سے نہیں کر سکتے۔ اگر اشتراکی تحریک کے کارکنوں میں اس قسم کا ایثار۔ بے لوثی اور نفس کشی ہوتی تو برصغیر کی سیاسی صورت حال کچھ اور ہوتی۔

صفدر بشیر فلک پیما کا بانی بلکہ روح رواں تھا۔

الیکشن کے لیے اس کے بجائے ڈاکٹر زیدی کا انتخاب کرنے سے اس میں بددلی پیدا ہو جانا تو قدرتی بات ہے رفتہ رفتہ اس کے رویہ میں بے نیازی آنے لگی۔ وہ بڑا جوشیلا اور اور کامیاب خطیب تھا انتخابی جلسہ میں شراب پی کر وہ جیسی بے تکی تقریر کرتا ہے وہ خلاف قیاس ہے اس کے خلاف اسکائی لارکوں نے جو تادیبی کارروائی کی اس میں بھی صرف مثالیت پسندی نظر آتی ہے۔ ایسا انسان اپنی ہی قائم کی ہوئی تنظیم کو توڑنے کی حرکت کرے یا اسے زک پہنچانے والے خان بہادر سے ساز باز کرے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

صفدر بشیر کی طرح سلمان کا کردار بھی اندرونی تضاد کا شکار ہے یہ جواز ناکافی ہوگا کہ سلمان جذباتی انسان تھا۔ جذباتی انسان کی قربانی اور نفس کشی زیادہ عرصہ نہیں چلتی۔ اس جماعت میں شریک ہونے سے پہلے وہ بہت ہی بے قاعدہ اور آوارہ انسان تھا۔ تحریک میں شامل ہونے کے بعد اس کی قربانی معاملہ فہمی اور جدوجہد کسی سے کم نظر نہیں آتی اتنے عرصے تحریک سے اس قدر ثابت قدمی کے ساتھ وابستہ رہنے کے بعد ملازمت کے زمانہ میں وہ جس قدر بزدلی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ اس سابقہ تربیت کے بالکل منافی ہے۔ جو شخص اپنی جماعت کی خاطر بینک لوٹنے اور ڈاکہ ڈالنے تک کے لیے تیار تھا۔ ایسا بے غیرت ہو جائے کہ جیفرے کی حرکتوں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتا رہے دیوث کا کردار ادا کرنے لگے۔

جب پہلی مرتبہ جعفری یعنی جیفرے سلمان کے گھر آیا تو اس نے اپنی بیوی رخشندہ کا تعارف اس سے کرایا۔ اس وقت رخشندہ پردہ کرنے والی اور سیدھی سادی گھریلو خاتون تھی وہ نظریں جھکائے

خاموش بیٹھی رہی۔

دوسری ملاقات میں جیفرے دونوں کو سینما لے گیا۔ کھانا ان کے گھر ہی کھایا۔ ہوتے ہوتے وہ سلمان سے پہلے ہی اس کے گھر پہنچنے لگا۔ رخشندہ کو تحفے تحائف دینا شروع کر دیے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے رخشندہ کی کلائی پر گھڑی باندھی۔ گھنٹوں اس سے باتیں کرتا رہتا۔ پھر رخشندہ کو لے کر اس نے گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ رخشندہ رات کو دیر سے گھر آتی مگر اس کی ہمت نہیں تھی کہ کچھ کہے۔

ایک مرتبہ" اس کا جی چاہا کہ جعفری کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کرے اور اس کو دھکے دے کر باہر نکال دے مگر یہ تھپڑ اس کو بہت مہنگا پڑتا۔ اس میں چار سو روپے ماہانہ کا نقصان تھا اور اتنا بڑا نقصان جھیلنے کے لیے فی الحال وہ آمادہ نہیں تھا۔"

سلمان نے آخر کار رخشندہ کو منع کیا کہ وہ جعفری سے نہ ملا کرے۔ چنانچہ رخشندہ نے جعفری سے بے رخی برتنی شروع کر دی۔ سلمان نے اس سے کہا کہ وہ اتنی بے رخی نہ برتا کرے۔ رخشندہ نے پھر جعفری کے ساتھ گھومنا شروع کر دیا۔

رخشندہ کو جعفری نے اپنے پروموشن کے لئے اپنے امریکن ڈائریکٹر کو پیش کر دیا۔ رخشندہ شراب بھی پینے لگی۔ یہ سب کچھ سلمان کی موجودگی میں ہوتا رہا۔ رخشندہ نے رات امریکن کے ساتھ گزاری اور فجر کی اذان کے وقت گھر آئی۔ سلمان نے بار بار چاقو کھول کر وار کرنا چاہا مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

جو شیلا اسکائی لارک جو دن بھر میں ایک وقت کا کھانا کھانے کا

عادی رہ چکا ہے۔ بڑی سے بڑی سختی جھیل سکتا تھا۔ اتنا بھڑوا بن اس کے کردار سے میل نہیں کھاتا۔

سلمان کا کردار دراصل اندرونی تضاد کا شکار ہے۔ شروع میں دکھایا گیا ہے کہ اسے سلطانہ سے بڑی محبت تھی۔ سلطانہ کو بھی اس سے محبت تھی سلطانہ کی ماں نے نکاح کی تاریخ بھی مقرر کر دی مگر سلمان نہ پہنچ سکا۔ وجہ؟ فلک پیما سے اس کا تعلق۔ اس نے فلک پیما کی خاطر اپنی محبت قربان کر دی۔ یہ کام بہت مضبوط قوت ارادی والا انسان ہی کر سکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر میں احمد علی سلطانہ سے نکاح کر لیتا ہے۔ وہ تو سلمان سے بھی زیادہ سرگرم رکن تھا۔ مگر فلک پیما کا کام اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکا۔ پھر سلمان کی راہ میں رکاوٹ کیوں بن گیا۔ سلمان کے رویہ کی تبدیلیاں خلاف قیاس ہیں۔ اسے غیر حقیقی کردار کہنا مناسب ہوگا۔

اس ناول کے سب سے زیادہ حقیقی کردار خان بہادر فرزند علی اور نیاز ہیں۔ یہ دونوں ایسے انسانوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو دولت کی خاطر سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ایسے خان بہادر اور ایسے نیاز آپ کو پاکستانی معاشرے میں قدم قدم پر مل جائیں گے۔

نیاز ایک معمولی کباڑیا تھا۔ اس نے نوشا کو چوری کرنے کی ترغیب دی نوشا کی ساری تکلیفوں اور پریشانیوں کا دراصل وہی ذمہ دار ہے۔ اسی کی وجہ سے اس نے اپنا شہر چھوڑا۔ بھائی بہن اور ماں کو چھوڑا۔ اس کے جانے کے بعد نیاز کا راستہ صاف ہو گیا۔ اس نے نوشا کی ماں سے نکاح اس لیے کیا کہ پہلے تو اس کا بھاری رقم کا بیمہ کرائے اور پھر اسے ٹھکانے لگا دے اس کے بعد سلطانہ

پر ہاتھ صاف کرے۔

بیوی کو ختم کرنے کا منصوبہ اس نے ڈاکٹر موٹو کی مدد سے بنایا وہ سند یافتہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ ایسی حرکتیں کرنے والے اور ہر قسم کا سرٹیفکیٹ دے دینے والے ڈاکٹر آپ کو کراچی اور لاہور میں بہت مل جائیں گے۔

بیوی کے ختم ہونے کے بعد اسے بیمہ کی رقم مل گئی اور وہ معمولی کباڑی سے دولت مند انسان اور باعزت شہری بن گیا اس نے مضافات میں ایک کوٹھی خرید لی۔ ایک ٹو سیٹر گاڑی بھی خرید لی اس نے کباڑی کی دکان ختم کر دی اور ٹھیکیدار بن گیا۔

نیاز کی خان بہادر سے ملاقات ہو گئی۔ خان بہادر میونسپلٹی کا الیکشن جیت کر چیئرمین بن گیا تھا۔ اس نے میونسپلٹی کے نئے مارکیٹ کا سات لاکھ کا ٹھیکہ نیاز کو دلوا دیا۔ منافع کا ۳۳٪ خان بہادر نے وصول کر لیا۔

نیاز نے یہ ٹھیکہ دوسرے ٹھیکیداروں کو دے دیا۔ اس نے سیمنٹ اور لوہے کا جو زائد کوٹہ مقرر کروا لیا تھا اسے بلیک مارکیٹ میں فروخت کر کے کافی پیسے بنائے۔

اس ٹھیکہ کی وجہ سے خان بہادر کے ساتھ نیاز کے تعلقات اور بھی گہرے ہو گئے۔ اس کا زیادہ تر وقت خان بہادر کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ خان بہادر کی وجہ سے اس کی اعلیٰ افسروں تک بھی رسائی ہو گئی۔ خان بہادر کی صحبت میں، اس نے شراب پینا بھی شروع کر دیا۔

سلطانہ کے ساتھ نیاز کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا مگر اللو کے ساتھ اتنا ہی ظالمانہ۔ آخر کار اس نے خوب مار پیٹ کر اللو کو گھر سے نکال

دیا۔ رفتہ رفتہ وہ سلطانہ پر بھی قابض ہو گیا۔ شادی کرنے کی اس نے ضرورت محسوس نہ کی۔ ویسے ہی میاں بیوی کی طرح رہنے لگے۔ سلطانہ کے ایک بچہ بھی پیدا ہو گیا۔

تیز بارش اور آندھی میں میونسپلٹی کا نیا مارکیٹ گر گیا۔ اوپر کی منزل میں رہائشی فلیٹ بھی تھے۔ اٹھارہ افراد اسی وقت ہلاک ہو گئے۔ ۵۵ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ اخبارات میں اس کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ میونسپلٹی میں خان بہادر کے مخالفین بھی تھے۔ وہ نیاز اور خان بہادر کو جیل بھجوانا چاہتے تھے۔ مگر خان بہادر صاف بچ نکلا۔ اس نے ساری ذمہ داری نیاز پر ڈال دی۔ تحقیقات ہوئی۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ اس کی تعمیر میں ناقص مال استعمال ہوا ہے۔

نیاز گرفتار ہو گیا۔ خان بہادر ڈر رہا تھا کہ نیاز سب کچھ اگل نہ دے۔ ٹھیکہ کے منافع میں سے اسی ہزار اس کے حصہ میں بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے شیشہ کے کارخانے میں سیمنٹ اور لوہا مارکیٹ کے کوٹہ میں سے ہی لیا گیا تھا۔ خان بہادر نیاز کا کوئی اور بندوبست کرنے کی فکر میں تھا کہ قدرت نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ نوشہ جب کراچی سے گھر آیا اور شامی کی زبانی اسے اپنے گھر کی تباہی کا حال معلوم ہوا۔ تو اس نے اس ساری تباہی کے ذمہ دار نیاز کو قتل کر ڈالا۔

خان بہادر نے اس کا پیچھا پھر بھی نہ چھوڑا۔ اپنے ایک آدمی فیاض کو نیاز کا بھائی ظاہر کر کے نیاز کی کوٹھی پر لے آیا۔ پھر اس کے ساتھ ایک اور جوان آدمی کرم الٰہی کو بھی اسی کوٹھی پر ٹھہرا دیا۔ فیاض نے سلطانہ کا جینا حرام کر دیا۔ ایک رات اس نے اور کرم الٰہی نے سلطانہ کا لباس تار تار کر ڈالا اور جبراً اس کی آبرو ریزی

کی۔ اس دوران میں خان بہادر سلطانہ کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہا سلطانہ کو خان بہادر پر بڑا بھروسہ تھا مگر خالنساماں نے اسے بتایا کہ یہ سب کچھ خان بہادر ہی نے کروایا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ فیاض اور کرم الٰہی بچے کو جان سے مارنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ تنگ آکر سلطانہ وہاں سے بھاگ نکلی اور فلک پیما کے انڈسٹریل ہوم میں جا پہنچی۔ وہاں اس پر ترس کھا کر علی احمد نے اس سے نکاح کر لیا۔

راستہ صاف ہو جانے پر خان بہادر نیاز کی تمام جائداد پر قابض ہو گیا۔ اس کا اثر ورسوخ اتنا بڑھ گیا کہ اس نے کئی کارخانے لگائے اور اسمبلی کی ممبری کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس ملک میں اس قسم کے خان بہادروں نے اسی طرح ترقی کی اور کوئی ان کا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ اس لیے کہ وہ ہر قسم کا بندوبست کر کے رکھتے ہیں۔ کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ قوم اور ملک کے جاں نثار لوگ، یہی قرار پاتے ہیں۔

سلطانہ اور اس کی ماں کے کردار ایسی مظلوم عورتوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو بغیر کسی قصور کے مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلتی رہتی ہیں اور اسی بے کسی کی حالت میں دم توڑ دیتی ہیں۔ ان پر ظلم کرنے والے انصاف کی راہیں بھی مسدود کر دیتے ہیں۔

ویسے تو مصنف شاید مقدر کے قائل نہ ہوں مگر آپ غور کریں تو سلطانہ کا کردار تمنا اور مقدر کی کشمکش کی داستان نظر آتا ہے۔

سلمان سے ملاقات کے بعد اسے کس قدر خوشی ہوئی ہو گی۔ اس کی ماں نے سلمان سے اس کے نکاح کی تاریخ بھی

طے کر دی مگر سلمان وقت پر نہ پہنچ سکا۔ سلطانہ کی ماں نیاز کی طرف سے فکر مند تھی۔ اس نے بہت چاہا کہ سلطانہ کو اپنے گھر کی کر دے مگر اسے کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر کار وہی ہوا جو اس کے مقدر میں تھا۔ اسے نیاز کی داشتہ بن کر رہنا پڑا۔ اس نے اس صورت حال کو بھی قبول کر لیا تھا مگر اس کے مقدر میں یہ خوشی بھی نہ تھی۔ نوشا نے نیاز کو قتل کر دیا۔ خان بہادر اور اس کے آدمیوں کے ہاتھوں اس نے انتہائی تکلیف اور ذلت اٹھائی۔ اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ ہر معاملہ میں اس کے شومئی نصیب کی جیت ہوئی آخر کار اس نے "فلک پیما" میں جا کر پناہ حاصل کی۔

اس ناول پر اچھے اور برے سب ہی طرح کے تبصرے ہوئے ڈاکٹر حیدر رضوی نے اس میں زبان کی پچاس غلطیاں نکالیں مگر زبان کے اس پرانے نظریے کو اب کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس ناول کی زبان افسانوی ادب کے تقاضوں پر پوری اترتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس میں انشاء پردازی کے نمونے بہت ہی کم ہیں اور میں اسے اس ناول کی خوبی سمجھتا ہوں۔

حسرت کاسگنجوی اس کے متعلق لکھتے ہیں "غور سے دیکھنے پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کی تخلیق نہیں ہوئی اور اسے تخلیقی ادب میں جگہ دینا محض طرف داری ہے ...... اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ "خدا کی بستی" ایک معمولی، سنسنی خیز، اور انتہائی سطحی ناول ہے تو غلط نہ ہوگا۔"

یہ عبارت حسرت صاحب کے تحقیقی مقالہ سے لی گئی ہے۔ اس میں ان کے خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے مقالہ کے سپروائزر کی رائے بھی پوشیدہ نظر آتی ہے۔ اس میں خامیاں بھی ہیں اور کمزوریاں

بھی۔ یہ بہت بڑا ناول نہ سہی پھر بھی ایک کامیاب ناول ہے اور اس عہد کے اچھے ناولوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اسے پلاٹ کی تنظیم اور واقعات کے درو بست کے اعتبار سے بھی ایک کامیاب ناول کہا جا سکتا ہے۔ مصنف نے ناول کا نام اقبال کے ایک مصرعے سے لیا ہے۔ ع

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

علامہ کے مخاطب دیارِ مغرب کے رہنے والے تھے۔ اس لیے کہ اس وقت سب سے بڑے استحصال کنندہ وہی تھے۔ شوکت صدیقی کے مخاطب ہمارے ملک کے استحصالی طبقے۔ استحصال کے آلہ کار اور اس کے شکار بننے والے لوگ ہیں۔ وہ زیادہ تر اس تیسرے طبقہ کو متوجہ اور باخبر کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اہم مسائل کی طرف ہماری توجہ مناسب انداز میں دلوائی ہے۔

ان کے نزدیک ناول لکھنے کی غایت شاید یہ ہو "نوشا جیل میں تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزند ارجمند غیر ممالک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے

..... عوام نوشا، راجہ، شامی اور الو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل کر کے جیل چلا جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرتا ہے اور خون تھوکتا ہے اور رکشہ چلاتا ہے اور کوئی ہجڑوں کے ساتھ رہ کر کولہے مٹکاتا ہے۔"

علی پور کا ایلی

ممتاز مفتی

اگر آپ فسانۂ آزاد کو ناول تسلیم نہ کریں اور درحقیقت وہ ناول ہے بھی نہیں تو پھر علی پور کا ایلی اردو کا طویل ترین ناول قرار پاتا ہے۔

سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس قسم کا ناول ہے اس کا نام اس طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ اس کتاب کا زیادہ تر واسطہ ایلی سے ہوگا جو علی پور کا رہنے والا ہے۔ مصنف نے پیش لفظ میں خود واضح کر دیا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے سے ان کا منشا یہ ہے کہ وہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کریں۔ اس ضخیم کتاب کے صرف چند صفحات ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح ایلی کا ذکر نہیں ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد ہم یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ ایک کرداری ناول ہے

اس میں عنوانات اس طرح دیے گئے ہیں اور واقعات کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ نہایت آسانی کے ساتھ اسے بالاقساط شائع کیا جا سکتا تھا۔ شاید شروع میں مصنف کا منشا یہی رہا ہو۔ اس طرح بہ اعتبار صورت یہ سیریل ناول نظر آتا ہے۔

جس طرح ایلی ایک مخصوص اور منفرد قسم کا انسان ہے۔ اسی طرح علی پور بھی پنجاب کا ایک مخصوص قسم کا قصبہ یا شہر ہے۔ ایلی کی فطرت کے انوکھے پن کی تعمیر میں علی پور اور اس کا ماحول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

مصنف نے ایلی کی شخصیت کے پھیلاؤ کو نمایاں کرنے کے لیے کسی حد تک داستان کی تکنیک استعمال کی ہے۔ داستان کے

ہیرو کی طرح وہ بھی کبھی علی احمد کی معیت میں کبھی حصول تعلیم کے سلسلے میں اور کبھی ملازمت کے بہانے جگہ جگہ گھومتا پھرتا ہے۔ مگر داستان کا ہیرو ایک کامل انسان ہوتا ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے ہر مہم سے کامران اور بامراد لوٹتا ہے۔ ایلی اس کے مقابلے میں ایک مضحک ہیرو نظر آتا ہے۔

داستان کے ہیرو کی شان کسی حد تک علی احمد میں نظر آتی ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے ہر ویلی سبز کی طرح جنسی مہمات سر کرتا جاتا ہے۔ ایلی محض ہیرو کا دم چھلا نظر آتا ہے۔ جس کی زندگی کا منشا صرف یہ نظر آتا ہے کہ ہیرو کے احکامات بجا لاتا رہے۔ اس کے لیے حقہ گرم کرتا رہے۔ اس کے محبوباؤں تک اس کے پیغام لے کر جائے یا اس سیاہ فام عورت کے لیے بوتل میں پانی بھر کر لائے جس کا عقیدہ ہے کہ مسلمان کے گھر کے پانی سے اس کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا مگر اسی مسلمان کو جسم فروشی کر کے بھی اس کا جسم اسی طرح پوتر رہے گا۔

اس ہیرو سے ایلی کو حسن خدمات کے صلے میں جو انعام ملتا ہے اس سے وہ اور بھی حقیر اور کم مایہ نظر آنے لگتا۔ یہ انعام ہے گوشت کی ایک بوٹی جسے علی احمد دو انگلیوں سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیتا ہے۔

مصنف نے ایلی کو یہ حیثیت بھی دراصل ایک منصوبے کے تحت دی ہے۔ وہ خود اپنے پیش لفظ میں کہتے ہیں "مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کر دوں"۔ یہ شخصیت انھوں نے پورے پھیلاؤ کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس ناول کے تمام کرداروں اور اس کہانی کے تمام واقعات کی غایت صرف یہ ہے کہ ایلی کی شخصیت کے

کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کیا جائے یا اس پر روشنی ڈالی جائے۔ اس قدر تفصیل کے ساتھ اردو میں کسی کردار کو پیش نہیں کیا گیا۔

جس طرح حیاتیاتی اعتبار سے ایلی علی احمد اور ہاجرہ کی پیداوار ہے۔ اسی طرح فنی اعتبار سے بھی اس کی تعمیر میں سب سے زیادہ انہی کرداروں کا حصہ ہے۔ مگر یہاں اس کی نوعیت مختلف ہے۔ اس کا کردار ہاجرہ اور علی احمد کے عمل اور ردعمل کی پیداوار ہے۔ اس لیے ایلی کے کردار کو سمجھنے کے لیے علی احمد کے کردار سے بحث کرنا ضروری ہے۔

علی احمد کے کردار کا اہم ترین عنصر ان کا جنسی پہلو ہے۔ ان کی جنسی زندگی کی ابتدا تاج محمدؐ کی بیوی چاننا سے بہت کم عمری ہی میں ہو گئی تھی"۔ اس کی محبت بھری گود میں وہ لڑکے سے جوان اور جوان سے نوجوان بن گئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی نفسیت میں بچے کا عنصر تقویت پا کر دوام حاصل کر گیا۔ ممکن ہے کو ہٹے کی لڑائی" کا انداز بھی انھوں نے وہیں سے سیکھا ہو"۔ وہ گویا علی احمد کے جنسی زندگی کی معلمہ ثابت ہوئی۔

عورت ان کی زندگی کا سب سے عزیز مشغلہ تھی۔ انھیں صرف عمل تسخیر سے عشق تھا۔ عورت کی نوعیت سے انھیں چنداں بحث نہ تھی۔ اس لیے ان کی زندگی میں صرف ایک حسین عورت صفیہ نظر آتی ہے۔ کشمیر کے سیب کو بھی زیادہ سے زیادہ غنیمت کہا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی میں ایسی عورتیں آتی ہیں جن کو دیکھ کر ایلی کو گھن آتی تھی۔ آخری بار جب وہ راجو کو لے کر آتے ہیں تو محلہ کی ایک عورت کہتی ہے"۔ نہ جانے کیا جادو ہے اس کو گلی سڑی اٹھا لاتا ہے"۔ ایک عورت کہتی ہے۔ "یہ تو نٹنی معلوم ہوتی ہے"۔

علی احمد کو صرف عورت چاہیے تھی اور وہ بھی ایسی جس سے دھینگا مشتی کی جا سکے اور یہ بات تسلیم و رضا سے بھیگی ہوئی ہاجرہ کے ساتھ ممکن نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے "ہاجرہ کو ہمیشہ کے لیے آلو چھیلنے اور آٹا گوندنے پر مامور کر دیا اور خود کمر ہمت باندھ کر اپنے جذبۂ تسخیر کو مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی ایستادہ چال، ابھری ہوئی چھاتی، فراخ پیشانی اور رنگین متبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے۔ پھر تخیلے میں ڈان کو ہٹے کی سی پرجوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدانِ کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح گر پڑتے کہ انھیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک کر سُلا دے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت جنگجو سورماؤں کا سپاہی اور دودھ پیتے بچے کی دلچسپ آمیزش سے بنی تھی۔"

علی احمد کے صرف دو مشغلے تھے یا تو وہ کمرہ بند کرکے ٹین کے سپاہی بن جاتے اور اگر باہر ہوتے تو چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں حساب کتاب لکھنے میں مصروف رہتے۔ وہ قمیص اتار کر بیٹھا کرتے تھے۔ کسی اجنبی کی آہٹ سن کر وہ فوراً قمیص پہن لیا کرتے تھے۔ ان کی دھوتی میلی ہونے کے علاوہ پھٹی ہوتی تھی اور اس کے پلوؤں کو ادھر اُدھر سرکنے کی عادت تھی۔ یہ بات ایلی پر بے حد گراں گزرتی تھی۔ مگر علی احمد نے اس کی بدنمائی کو کبھی محسوس تک نہ کیا۔ وہ بہت کفایت شعار آدمی تھے۔ ایک ایک پیسے کا حساب لکھا کرتے تھے۔ اس قسم کے کئی رجسٹر بھر چکے تھے۔ ان سے کوئی دس سال پہلے کی کسی بھی دن کی تفصیلات پوچھے تو وہ بتا سکتے تھے۔ انھوں نے ہر فرد کا ایک رجسٹر کھول رکھا تھا۔ اپنے رجسٹر کو دیکھ کر وہ بتا سکتے تھے کہ انھوں نے فلاں فلاں تاریخ تک ایلی یا ہاجرہ پر یا اپنے اوپر کل کتنا خرچ کیا یا فلاں دن ان کے پاس کیا پکا

تھا۔ عورت انھیں اس قدر عزیز تھی اس کے باوجود وہ عورت پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ عورت پر خرچ کرنے کی مثالیں ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لیے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں روپیہ نہیں۔

علی احمد کی شخصیت کا اہم ترین پہلو "چراؤں ٹھک" کے بعد شروع ہوتا۔ کمرہ بند ہو جاتا اور ٹین کا سپاہی میدان میں آ جاتا۔ یہی ان کی قوت بھی تھی اور کمزوری بھی۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ صفیہ کی ناراضگی کو مسکراہٹ میں تبدیل کر سکتے تھے۔ اور اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آسا کے بجائے کور ملازمت کا ایک مخصوص قسم کا امتحان دے کر اسے پاس کروا سکتی تھی۔

اس ٹین کے سپاہی کی تشبیب ان کی "ہی ہی ہی ہی" تھا جس کا مظاہرہ کمرے کے باہر ہوا کرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "ہی ہی ہی ہی" طلسماتی الفاظ ہیں اس کے بعد وہ جسے بھی آواز دیتے قصۂ حاتم طائی کے کوہ ندا کی آواز کی طرح اسے سننے والی فوراً کمرے کا رخ کر لیتی ہے۔ اس کے بعد "چراؤں ٹھک" اور پھر ٹین کا سپاہی میدان میں آ جاتا۔

علی احمد کے شادی شدہ ہونے کے باوجود دوسری عورتیں اگر بخوشی ان کے دام میں آ جاتی ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ علی احمد کھاتے پیتے آدمی تھے۔ مستقبل کے تحفظ کا خیال غریب عورتوں کو اس کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ لہٰذا صفیہ کشمیر کے سبب اور لاجو کا ان کے حرم میں داخل ہو جانا قرین قیاس ہے مگر سارہ صبورہ جیسی کم عمر لڑکیوں کا آواز پڑتے ہی علی احمد کے کمرے کی طرف چل دینا قطعی خلاف قیاس ہے۔ بڑی یعنی سارہ فرحت کی ہم جماعت اور

ہم عمر ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ نوجوان کہہ سکتے ہیں اور صبورہ کی عمر کا یہ حال ہے کہ اسے آواز پڑنے پر ہاجرہ کا ردعمل یہ ہے "صبورہ!" ہاجرہ کے ہونٹ ہلے۔ اس نے حیرت سے چھوٹی سی بچی کی طرف دیکھا جس نے ابھی غفوان شباب میں قدم رکھا ہی ہو۔

دوسری آوارہ عورتیں جس طرح علی احمد کے کمرے میں آتی ہیں وہ قرین قیاس ہے۔ یہ سب پیسے کی خاطر آتی ہیں مگر سادہ صبورہ کو کون سی چیز لے گئی تھی۔ ان میں اتنا شعور بھی نہیں تھا۔ کہ وہ علی احمد کی جنسی پہلوانی کی شہرت سن کر ان سے فیضیاب ہونے کی طرف مائل ہوں۔ پیسے کا سوال بھی نظر نہیں آتا۔ نہ علی احمد کی عمر ایسی ہے کہ اس عمر کی لڑکیاں ان کی طرف مائل ہوں۔ پھر اس عمر کی لڑکیوں کا پہلا سابقہ ہے شرم وحیا اس قدر ہوتی ہے کہ ان کے لیے ایسا رویہ اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر وہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ لہٰذا یہ بات اور بھی خلاف قیاس ہو جاتی ہے۔ یہ بھی دیکھئے کہ وہ بھرا پرا گھر ہے۔ جس طرح سے اس واقعہ کو پیش کیا گیا ہے اس سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ علی احمد کا گھر نہ ہو چکلہ ہو اور ہاجرہ نائکہ ہو۔ دادی اماں بھی طوائف رہ چکی ہو۔ فرحت بھی ایک طوائف زادی ہو جسے خود کسی گاہک کے لیے تیار کیا جا رہا ہو جو یہ جانتی ہو کہ اس گھر میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ کوئی انسان کتنا ہی آوارہ اور بے حیا کیوں نہ ہو اپنی بیٹی اور ماں کے سامنے اور ان کے علم میں ایسا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔

کوئی شخص اپنی غیر شادی شدہ نوجوان لڑکی سے اس طرح کیسے کہہ سکتا ہے "بھئی فرحت تمہارے کہنے کے بغیر نہیں آئیں گی اور بھئی فرحت تو ان کی میزبان ٹھہری۔ کیوں بھئی فرحت یہی بات

سہے نا۔"

سارہ علی احمد کے کمرے کی طرف اس طرح چل دیتی ہے جیسے اس کے باپ نے اسے علی احمد کے ہاتھ بیچ دیا ہو۔ پھر اس واقعہ کے بعد بھی وہ اسی گھر میں رہتی ہے اور یہ واقعہ روز دہرایا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ جب وہ علی احمد کے کمرے میں گئی اور اس کے کمرے سے ہی ہی ہی ہی" اور "ہائے اللہ" کی آوازیں آنے لگیں گھر کے دیگر افراد کا ردعمل یہ تھا۔ "جائے نماز پر بیٹھے ہوئے دعا مانگتے دادی اماں کے ہاتھ لرزے جیسے دفعتاً اسے تشنج کا عارضہ ہو گیا ہو پھر وہ دھپ سے سجدے میں گر گئی۔ فرحت نے آہ بھر کر رضائی منہ پر لے لی۔ مشین پر کپڑے سیتے سیتے ہاجرہ کا ہاتھ کانپا اور دستہ مشین کی چرخی سے باہر نکل آیا اور ہاجرہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے صبورہ اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔ فرحت نے ماں طرف دیکھا اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔"

اس کے بعد روزانہ رات کو چپ چاپ سارہ اپنی چارپائی پر چلی جاتی مگر وہ لیٹتی نہ تھی۔ چپ چاپ ایک طرف بیٹھی رہتی۔ علی احمد کی آواز سن کر سارہ کن اکھیوں سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی۔ ہاجرہ اٹھ بیٹھتی اور چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑتی، یہ سارا واقعہ بالکل خلاف قیاس لگتا ہے۔ سارہ کے اس طرح علی احمد کے منتظر رہنے سے شاید آپ یہ سوچیں کہ اس انتظار کی وجہ علی احمد کی غیر معمولی جنسی قوت ہو گی مگر بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ مصنف نے علی احمد کو ٹین کے سپاہی اور ڈان کو ہیٹے سے تشبیہہ دے کر ان کی جنسی قوت کو واضح کر دیا ہے۔ شروع میں یہ بھی کہا ہے کہ علی احمد نے یہ ٹین کے سپاہی کی لڑائی شاید چاننا سے اس وقت سیکھی تھی جب وہ پورے طور پر جوان بھی نہیں ہوئے تھے۔

علی احمد کی جنسی حیثیت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ایلی علی احمد اور جمال کا مقابلہ کرتا ہے لکھا ہے: "نہ جانے کیوں مگر ایلی کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ عورت صرف مرد سے محبت کرتی ہے اور صرف اس کی عزت کرتی ہے جس میں جھپٹنے کی صلاحیت ہو۔ ایسا جھپٹنا جس میں بے رحمی اور تشدد کی جھلک ہو۔ اسے علی احمد پر بھی یہی گلہ تھا کہ ان میں جھپٹنے کی صلاحیت نہ تھی اور وہ صرف ٹین کا سپاہی بننا جانتے تھے اور جھوٹ موٹ کی لڑائی لڑ کر اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے تھے اور اس سعی لاحاصل سے اپنا رہا سہا وقار بھی کھو دیتے تھے!!"

ایلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مخصوص قسم کی عورتیں علی احمد کی طرف کھنچ آتی تھیں ...... اس کا خیال تھا کہ علی احمد میں کشش تو ہے لیکن وہ اسے اپنے اثر میں رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کا اندازہ تھا کہ ان کے کردار میں مردانگی کو دخل نہ تھا۔ ان میں وہ جھپٹ نہ تھی۔ ایلی کے نزدیک اس قسم کی جھپٹ جمال میں تھی۔

مخصوص قسم کی عورتیں جو علی احمد کی طرف آتی تھیں وہ غریب یا پیسے کی محتاج ہوتی تھیں۔ لہٰذا سارا سبورہ جیسی لڑکیوں کا اس کی طرف مائل ہونا قطعی خلاف قیاس ہے۔

علی احمد اپنی دانست میں ٹین کا سپاہی بن کر عورتوں کی ناراضگی ختم کر سکتے تھے۔ صفیہ کی ناراضگی بھی اسی طرح مسکراہٹ میں بدل جاتی تھی مگر یہ اسی وقت ہوتا تھا جب وہاں علی احمد واحد مرد ہوتے تھے۔ جب علی احمد کے یہاں خوبرو اور خوش پوش اجمل آ کر رہا تو صفیہ کی توجہ اس کی طرف مائل ہوئی علی احمد اپنا پرانا حربہ آزمانے کی کوشش کرتے۔ علی احمد کے آنے پر ٹین کا سپاہی حرکت

میں نہ آتا بلکہ اس کی جگہ کٹھ پتلیوں کا کھیل شروع ہو جاتا۔ ایک منتیں کرتی دوسری منہ چڑاتی۔ ایک سیٹیاں بجا کر پرماتی دوسری ناک چڑاتی۔ ایک ہنسی ہنستے جاتی دوسری گھورتی اور پھر جب دروازہ کھلتا تو شام کوٹ کا قلعہ یوں طمطراق سے قائم ہوتا جیسے وہ ناقابل تسخیر ہو...... پھر ایک رات کٹھ پتلیوں کا تماشہ شرارت اختیار کر لیا۔ شام کوٹ کے قلعے سے طبل جنگ بجنے لگا اور ٹین کے سپاہی نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیے اور بند کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔"

علی احمد اپنی شکست کا بدلہ اجمل سے نکالتے آخر کار وہ گھر سے نکل بھاگا۔ کچھ اسی قسم کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب سیاہ فام کور جسے کہ مصنف نے گوشت کا لوتھڑا کہہ کر پکارا ہے۔ علی احمد کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس دن بھی ٹین کے سپاہی کی ہی ہی سنائی دینے کی بجائے ربڑ کی گڑیا کی چیں چیں سنائی دے رہی تھی۔

دوسرا کردار جس نے ایلی کی شخصیت کی تعمیر میں اہم حصہ لیا ہے وہ ہاجرہ ہے۔ ہاجرہ کی شخصیت میں جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ ایک عورت کی فطرت کے منافی ہیں۔ وہ اپنا فرحت اور ایلی کا کھانا الگ پکاتی ہے۔ مگر پہلے علی احمد اور صفیہ کا کھانا پکاتی ہے۔ عورت ظالم شوہر کے خوف سے سوت کو برداشت کر سکتی ہے مگر اس کی خدمت ہرگز نہیں کر سکتی۔ اس کے اکلوتے بیٹے کو بھوک لگے تب بھی وہ یہ کہے کہ پہلے صفیہ کا کھانا پکا لے پھر چولہا جلائے گی۔ ہاجرہ کا یہ رویہ خلاف قیاس ہے۔ شوہر ظالم ہو تب بھی وہ چاہے پٹ لے گی۔ لات گھونسے کھائے گی۔ مگر سوت کا کام ہرگز نہیں کرے گی "صفیہ

گردن اٹھا کر چھاتی ابھار کر ہاجرہ کے سر پر آ کھڑی ہوتی۔ ہاجرہ یہ کرو۔ ہاجرہ وہ کرو۔ اور یہ تو تم نے ابھی تک کیا ہی نہیں۔ اور وہ کام جو میں نے کل تمھیں دیا تھا" ایسی باتیں سن کر تو ہاجرہ کو آگ بگولا ہو جانا چاہیے تھا مگر اس وقت اس کی نگاہیں صفیہ کے چہرے پر لگی ہوتیں اور اسے کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اس پر قربان ہوئی جا رہی ہو اور وہ صفیہ کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو یوں اٹھاتی ہے جیسے قرآن شریف کا ورق ہو۔

ہاجرہ غالباً خاصی بد صورت تھی۔ علی احمد کی آوارگی کی جہاں اور وجوہات ہیں وہاں یہ بھی ایک اہم وجہ ہے۔ ایسی صورت میں علی احمد کا صفیہ جیسی حسین عورت کو لانا قرین قیاس ہے۔ اس کی خاطر ہاجرہ کو بالکل نظر انداز کر دینا اور ہر وقت اس کی پرستش کرتے رہنا بھی قرین قیاس ہے مگر یہ کسی طور ممکن نہیں ہے کہ ہاجرہ بھی اس سے عشق کرنے لگے۔ مصنف نے ہاجرہ کے اس رویے کو انوکھا انتقام کہہ کر پکارا ہے ان کے نزدیک ہاجرہ نے یہ رویہ اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ اس طرح علی احمد کی حریف بن سکتی تھی اور اسے رقابت کی آگ میں جلا سکتی تھی۔ عورت دکھاوے کے لیے تو یہ رویہ اختیار کر سکتی ہے۔ مگر مصنف نے تو اسے سچ مچ کا عشق ثابت کیا ہے۔ وہ صبح و شام صفیہ کی خوشنودی کے لیے معروف کار رہنے لگی۔ صفیہ نے اس سے صرف اتنا کہا "دیکھو تو میری بانہوں میں سونے کے کڑے ہوں تو کیسا رہے گا" اسی دن اس نے صفیہ کے کڑوں کے لیے روپیہ بچانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صفیہ کے لیے ریشمی کپڑے بھی مہیا کرتی رہی علی احمد اسے تینوں کے خرچ کے لیے صرف بارہ روپے ماہوار

دیا کرتا تھا۔ وہ اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے سلائی کیا کرتی تھی مگر اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر وہ صفیہ کی ناز برداریاں کیا کرتی تھی بدرستی ہوش و حواس ایک عورت کا اپنی سوت کے ساتھ یہ رویہ کسی طرح ممکن نہیں۔

صفیہ کے مرنے کے بعد وہ بہت عرصہ تک اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ جب علی احمد کشمیر کے سیب کو بیاہ کر لانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہاجرہ اپنے بچے کی موت کا غم بھول کر اس کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اگر ہاجرہ اس قسم کی بے نفس عورت تھی تو شاید وہ اپنی قسم کی واحد عورت تھی۔

ایلی نے شکل و صورت بھی ماں کی سی پائی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو گھر میں نوکرانیوں کی طرح کام کرتے دیکھا تھا اس لیے وہ خود کو بھی نوکرانی کی اولاد سمجھتا تھا۔ جب ہاجرہ کے بچہ ہوا تو اسے بڑا تعجب ہوا کیوں کہ اس نے ہاجرہ کے لیے کبھی علی احمد کے کمرے سے چراؤں ٹھک کی آواز نہیں سنی تھی۔ ہاجرہ انتہائی احساس کمتری کی ماری ہوئی تھی۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ علی احمد کی کسی بات پر اعتراض کر سکے۔ ہاجرہ کی زندگی اور اس کے رویہ کے اثر سے ایلی میں بھی احساس کمتری پیدا ہو گیا۔ اپنی بدصورتی کے احساس نے اس کے احساس کمتری کو اور بھی شدید کر دیا تھا۔ ویسے بھی تو ایلی طبعاً بے حد شرمیلا واقع ہوا تھا۔ کسی سے بات کرنے کی اس کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی۔ خواہ مخواہ ہی جھینپ جاتا۔ جی چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ لے اور پھر اپنی کوٹھڑی کی تنہائی میں جا کر چھپ جائے۔ وہ احساس کمتری کا شدت سے شکار تھا اسے اپنے دبلے پتلے پن سے نہ جانے

کیوں شرم محسوس ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اپنے گھر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جہاں اس کی اپنی ماں برتن مانجھ کر روٹی کھاتی تھی اور جہاں پلنگ پر بیٹھی ہوئی صفیہ جب چاہے بلاوجہ اسے گھور سکتی تھی۔ جہاں اس کے اپنے ابّا سے یا تو کسی کام کے لیے بلاتے تھے اور یا گھورنے کے لیے۔ اس کے علاوہ وہ اس کے وجود سے ہی بے خبر رہتے تھے۔"

وہ احساس کمتری کا شکار ساری عمر رہا۔ سن شعور کو پہنچنے کے بعد اس میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا مگر اس احساس کمتری کی بنا پر وہ اس کے اظہار کی جرأت نہیں کر سکا۔ اس سے اس کی شخصیت میں گھٹن سی پیدا ہو جاتی ہے۔

محلہ والے اسے علی احمد کا وارث سمجھتے تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھنے والی صفیہ کو گھر کی مالکہ نہیں مانتے تھے بلکہ ان کے نزدیک اصل مالکہ ہاجرہ ہی تھی اس کے اپنے محلہ میں آنے پر چچی جان نے اسے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "اچھا ہوا تم آ گئے تمھیں کیا ضرورت ہے کہ جگہ جگہ علی احمد کے ساتھ جوتے چٹخاؤ۔ تم اپنے گھر میں رہو۔ یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ جو تم ہو وہ کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ صفیہ کالے منہ والی چڑیل اسے کون جانتا ہے۔ اچھا کھیلو بیٹا"۔ بوڑھی جاناں، برکتے اور محلہ کی دوسری عورتوں کا نقطہ نظر یہی ہے۔

اس کے باوجود ایلی میں خود اعتمادی اور حالات کیخلاف بغاوت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس۔ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا احساس کمتری کس قدر شدید تھا

پہلی مرتبہ اس میں بغاوت کا جذبہ اس وقت پیدا ہوتا

ہے جب صفیہ نے سوتے میں اس کے ایک ہاتھ پر مہندی مل کر اسے باندھ دیا۔ اسے مہندی سے بے انتہا چڑ ہے جاگنے پر اسے بے انتہا غصہ آیا۔ اس وقت صفیہ ململ کی باریک کرتی پہنے بال بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی"۔ اس کی نظر میں وہ سفید کرتی سرخ دکھائی دینے لگی۔ سرخ خونی سرخ۔ جیسے وہ قمیض مہندی سے رنگی ہو۔ وہ بھاگا لپکا اور آن کی آن میں اس قمیض پر پل پڑا اس کے ناخن سفید ململ میں دھنس گئے اور قمیض کی دھجیاں صحن میں اڑنے لگیں۔ مجھے بڑا ہو لینے دے۔ مجھے دسویں پاس کر لینے دے۔ پھر پھر"

دراصل یہ مرکب رویہ ہے اس کی تہہ میں بغاوت کے ساتھ ساتھ جنسی ہیجان بھی پوشیدہ ہے۔ مہندی لگے ہاتھوں سے چڑھی دراصل اسی جذبہ پر مبنی ہے۔

ایلی میں جنسی جذبہ سب سے پہلے صفیہ کو اس کے مہندی لگے ہاتھوں اور اس کے ابھری ہوئی قمیض کو دیکھ کر ہی بیدار ہوتا ہے۔ اسے دراصل صفیہ کے مہندی لگے ہاتھوں سے نفرت نہیں تھی انہیں دیکھ کر اس میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے "صفیہ کا اس قدر گورا چٹا اور چوڑا چہرہ دیکھ کر وہ پھر نگاہیں جھکا لینے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر اس کی نگاہیں صفیہ کی ململ کی قمیض پر پھیل جاتیں۔ ململ کی سفید قمیض دیکھ کر دفعتاً اسے خیال آتا کہ کہیں قریب ہی سے قمیض ابھری ہوئی ہے۔ شرم سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک آتے۔ توبہ ہے توبہ ہے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا"

ایک اور جگہ لکھا گیا ہے "وہ اس صفیہ سے ڈرتا تھا۔ اس

خونیں ہاتھوں سے ڈرتا تھا۔ اس کے بالوں کے جونڈے سے ڈرتا تھا۔ اس کی مہین قمیص سے ڈرتا تھا۔ چوری چوری اس کی طرف دیکھتا۔ اس کی بے نام طاقت کو محسوس کرتا۔ جسم کے بال کھڑے ہو جاتے کانوں کی لویں گرم ہو جاتیں تنفس تیز ہو جاتا پھر اس کی روح کی گہرائیوں سے ایک طوفان اٹھتا۔"

یہ دراصل جنس مخالف کے لیے ایلی کے دل میں اولین کشش ہے۔ علی احمد کے رویہ کو دیکھ کر۔ ان کے کمرے میں داخل ہونے والی لاتعداد عورتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی تمنا ہوتی ہو گی کہ وہ بھی ٹین کا سپاہی بنے اس کے کمرے کا دروازہ بھی اسی طرح "چراؤں ٹھک" کی آواز پیدا کرے۔ مگر اس کے لیے تو علی احمد کی بے باکی اور حاکمانہ شان درکار تھی۔ اور ایلی میں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس لیے اس زمانہ میں صرف ایک مرتبہ یہ جذبہ باغیانہ اظہار کی جرأت کر پاتا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایلی کے دل میں بقول مصنف محبت کے اولین جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں مگر جنس مخالف کے لیے نہیں بلکہ اپنے ہم جنسوں کے لیے۔ یہاں اس کے مقابل میں کوئی علی احمد نہیں تھا اس لیے وہ گھٹن بھی نظر نہیں آتی ہے جو کہ وہ علی احمد کے گھر میں محسوس کیا کرتا تھا۔ اس کی توجہ کا اولین مرکز اس کے تین ہم جماعت لڑکے۔ ایشور لال پرکاش اور گھن شام تھے۔ وہ ڈھونڈ کر ان سے ملنے کے موقعے نکالتا اور شام کو اس طرف ٹہلنے نکل جاتا جس طرف گھن شام کا گھر تھا۔ اس کے گھر کے قریب ہی زاہدہ اور عابدہ رہتی تھیں۔ ان کی سریلی آوازیں اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ جاتیں۔ مگر وہ ان سے کتراتا

تھا۔ وہ الیشور لال پرکاش اور گھن شام سے اس قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ شاید مصنف بھی بعض ماہرین نفسیات کے ہم خیال ہوں اور ہم جنسی محبت کو زندگی کی ابتدائی منزل سمجھتے ہوں۔

ہم جنسی محبت میں اولین کامیابی اسے بالا کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ بالا میں دلچسپی لینے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا جسم سفید اور ملائم تھا۔ جیسے کہ عورتوں کا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ بالوں سے خالی تھا۔ ایلی کو بالا کا ہاتھ انتہائی شفاف اور مخلیں لگتا تھا۔ ایلی شاید ہمت نہ کر پاتا مگر پہل خود بالا کی طرف سے ہوئی۔ اس جنسی آنکھ مچولی کا نقشہ مصنف نے نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے نہایت خوبصورت استعاروں میں پورے جنسی عمل کی تصویر اتار کر رکھ دی ہے لکھا ہے "پھر دفعتاً ایک گرداب اٹھا وہ ہلکی ہلکی لہریں ایک عجیب سے طوفان میں بدل گئیں۔ ایک آتشیں میزائل فضا میں بلند ہوا اور پھر ایٹم بم کی طرح پھٹ گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ ایک طویل و عریض سمندر پر ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں بہے جا رہا ہو اور چاروں طرف تھکی ہاری لہریں رینگ رہی ہوں"۔

اس کی ابتدائی منزل کی تفصیلات مصنف نے جس طرح پیش کی ہیں۔ اس میں وہ عصمت چغتائی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جس طرح بالا کے ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتے ہیں اور جسم سے لمس کرتے ہیں۔ اس کا نقشہ تقریباً اسی طرح پیش کیا گیا ہے جس طرح عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر میں رسول فاطمہ اور شمن کا واقعہ پیش کیا ہے۔

بالا اور ایلی کے درمیان یہ معاملہ کئی دن تک چلتا رہا۔ ایلی کو آخر میں نفرت ہی ہوتی مگر رات کے وقت وہ اس کشش پر قابو نہ رکھ سکتا تھا۔ دفعتاً وہ مخملیں لہریں بڑھ کر طوفان کی شکل اختیار کر لیتیں اور افق پر خونی چھینٹے اڑتے اور ایک میز ایل شوں کر کے آسمان کی طرف لپکتا اور پھر دیر تک طوفان زدہ سمندر کی ویرانی میں وہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں پر ڈبکیاں کھاتا اور نہ جانے کیوں کسی انجانے احساس سے شرابور ہو جاتا ہے"!

جس زمانہ میں وہ امرتسر کالج میں پڑھتا تھا اسے ربابیوں کے لڑکے نور سے دلچسپی ہو گئی۔ جس وقت نور "کیسی شبھ لگن سے بہار آئی" گاتا تو ایلی اس کے گانے میں اس قدر محو ہو جاتا کہ وہ نور اور اس کے گانے کے علاوہ سب کچھ بھول جاتا۔ وہ بڑی بیتابی سے ریہرسل کا انتظار کرتا رہتا کہ کب نور آئے اور کب اس کی شبھ لگن شروع ہو مگر نور میں دو متضاد شخصیتیں تھی۔ ایک نور تو گاتے وقت اس میں بیدار ہوتا۔ اس وقت اس کے گرد ھالا بڑھ جاتا تھا وہ نور جس کی حرکات میں حسن کی جھلک دکھائی دیتی جس کے گلے میں گویا پگھلی ہوئی چاندی کا ایک فوارہ سا چھوٹتا تھا لیکن جونہی وہ گانا ختم کرتا تو اس کی آنکھوں میں عریانی بھرا پیمانہ چھلکتا اور اس کی حرکات سے غلاظت اور سستے پن کا مظاہرہ ہوتا۔ نور کی چال تو بالکل ان عورتوں کی طرح تھی جو کٹڑا نگین میں دوسرے درجے کے چوباروں میں بیٹھتی تھیں"!

ایلی کو پہلے نور سے دلچسپی تھی اور دوسرے نور سے نفرت مگر اس کے لیے محبت کا جذبہ غالب تھا۔ ایلی اور آصف کو نور کے گانے سے اس قدر دلچسپی ہوئی کہ وہ "فارغ وقت میں نور کو لے

کر آموں والی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے چلے جاتے۔ ایلی کسی پیڑ تلے بیٹھ جاتا۔ آصف ندی میں پاؤں لٹکا لیتا اور نور گاتا اور اس شبھ لگن میں ایلی کی نگاہوں تلے گھنگھریالی لٹ لہراتی اور آصف کی آنکھیں جھیلوں میں تیرتیں اور سوکھے ہوئے درختوں پر ہریاول یورش کرتی اور ندی کا پانی ناچتا اور آسمان پر پرندے رقص کرتے۔

گانے کے اختتام پر نور کی آنکھ میں وہ نورانی چمک بجھ جاتی اور اور ایک رنڈی کپڑے اتار ننگی ہو کر ان کے روبرو آ کر کھڑی ہو تی اور نمائش کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ وہ ہونٹ جونکوں کی طرح ان کی طرف بڑھتے اور وہ دونوں گھبرا کر وہاں سے چل دیتے۔"

وہ اسی طرح نور سے ملتے رہے ایک دن شیخ ہمدم کو بھی انھوں نے نور کا گانا سنوایا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ نور جیسے کمسن لڑکے سے اس طرح ملنا خطرناک ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود وہ اس سے ملتے رہے ایک دن جب ایلی سعید چوک میں کھڑا نور کا انتظار کر رہا تھا ایک پہلوان قسم کا شخص جو نور کا عاشق تھا اس کے قریب آیا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "دیکھ بالو تو نور کا پیچھا کرنا چھوڑ دے ورنہ خون بہہ جائے گا اور تیری کھلڑی، اتر جائے گی۔"

ایلی نے اس کا پیچھا تو چھوڑ دیا مگر اسے اس قدر رنج ہوا کہ امرتسر سے بھی اس کا جی اکتا گیا۔ اس قسم کی ہم جنسی دلچسپی ہمیں ایلی کے دوسرے ہم عمروں میں بھی نظر آتی ہے یہاں تک کہ آصف میں بھی۔ یہ دلچسپی اس حد تک پہنچی ہوئی ہے ہے کہ اسے جنسی کجروی کا نام دیا جائے۔

بالا سے جنسی کامیابی اور دوسرے لڑکوں میں دلچسپی لینا یہ الفاظ

دیگر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں عشق کے جذبات بیدار ہو چکے تھے اور ان میں کسی حد تک بیقراری کا رنگ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ مگر اس محبت میں جمال کی سی لپک تو کیا ٹین کے سپاہی کی سی جرأت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

عورت سے بامراد قرب اسے پہلی مرتبہ ساجو سے حاصل ہوا مگر ساجو کے لیے اس کے دل میں کشش تو کیا ہوتا بلکہ سخت نفرت تھی۔ جب ایلی کو علی احمد کی معیت میں راجو ساجو کے گھر رات گزارنا پڑی" بدقسمتی سے اس کی چارپائی ساجو کے قریب بچھائی گئی۔ ساجو نے گنگنانا شروع کر دیا مگر اس دھن سے ایلی کو جسم کی بو آ رہی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایسی دھن تھی جو لالٹین جلا کر بیٹھنے والی عورتیں ہی گنگنا سکتی ہیں مگر ساجو کہاں ماننے والی تھی۔ اس نے اپنی چارپائی ایلی کی چارپائی سے بالکل ملا لی اور ایک حریص تھوتھنی اس کی طرف بڑھ رہی تھی گھبرا کر پیچھے ہٹنے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا۔ اور گرم غلیظ جسم کے ایک بھبکے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھے اور اس نایٹ میٹر سے اپنے آپ کو محفوظ کرے لیکن اس کے برعکس نہ جانے کیوں اس دیوانگی کے تحت جو اس پر مسلط ہو چکی تھی اس نے اس غلاظت بھرے جوہڑ میں چھلانگ لگا دی۔ ایک لمس ایک ڈبکی آتش فشاں سے لاوے کا ایک ریلا نکلا۔ جس نے ایلی کو تنکے کی طرح بہا کر نہ جانے کہاں سے کہاں پھینک دیا۔"

ایلی نے شاید یہ جرأت ہاتھ صاف کرنے کے لیے کی ہو۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے اور پھر وہ شہزاد کے سامنے "لپک" کا مظاہرہ کر سکے مگر اس نے اور الٹا اثر ڈالا۔ اس کا رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا۔ جلنسی عمل کے بعد سا جو کا ردعمل ملاحظہ ہو"۔ قریب ہی سے تمسخر بھری آواز سنائی دی "بس"۔ اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ وہ ایک کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا۔ پھر سیاہ ہمدرد اندھیرے نے اپنا دامن پھیلا کر اسے چھپا لیا"۔

اس انجام کے بعد ایلی کا یہ سوچنا کہ وہ عورت کے قرب کے قابل نہیں بالکل فطری تھا۔

ایلی میں یہ احساس کمتری صرف جلنسی ہی نہیں تھا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں وہ اس کا شکار نظر آتا ہے۔ ایک تو اس کی صورت اس کی رنگت اور پھر اس کی صحت اور پھر ان سب کے ساتھ وہ حلیہ بھی ملاحظہ ہو جس میں کہ علی احمد نے اسے کالج بھیجا "ایلی کا چھوٹا اور پرانا کوٹ جو علی احمد کے کوٹ کو الٹا کر بنایا گیا تھا اس کی سستی اور مختصر سی پتلون اور معمولی سا جوتا یہ تمام چیزیں صاف مانگے کی معلوم ہوتی تھیں اور ایلی کا چھوٹا قد اور پندرہ سال کی عمر شاید انہی باتوں پر کالج کے لڑکے اسے دیکھ کر ہنستے تھے"۔

اس صورت، صحت اور لباس کے ساتھ ساتھ وہ پڑھنے میں بھی نالائق تھا۔ نہ تو وہ ذہین تھا اور نہ اسے پڑھنے کا شوق تھا لہٰذا جماعت کے لڑکے اس کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے اور استاد اس کے جوابات پر قہقہے لگایا کرتے تھے۔ ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ اس کے لیے ہاسٹل میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ

لمبے تڑنگے لڑکوں سے بات کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا وہ ٹہلنے کے لیے نکلتا تو فیشن ایبل علاقے میں جانے کی اس کی ہمت بھی نہ ہوتی۔ اس نے کئی ایک مرتبہ بڑی دکان میں داخل ہونے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پیشانی پسینے میں بھیگ گئی تھی اور وہ چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلا آیا تھا۔"

اسے عورت کی تمنا ضرور تھی۔ پہلی لڑکی جس نے بے باکی سے اس کی طرف قدم بڑھائے وہ نذیراں تھی۔ شادی بیاہ کے موقع پر ایلی کے لیے گھر جانا مشکل ہو جاتا۔ اندھیرے میں سے نکل کر نذیراں اس کا راستہ روک لیتی۔ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی مگر اس میں اس قرب کی ہمت نہ تھی اس لیے وہ نذیراں سے ڈرتا تھا۔ ایلی کو ان تمام لڑکیوں سے ڈر لگتا تھا جو اسے دیکھ کر آگے بڑھتی تھیں۔ اسے وہ لڑکیاں پیاری لگتی تھیں جو اسے دیکھ کر فوراً منہ موڑ لیا کرتی تھیں اسے ہلتی ہوئی چکوں سے دلچسپی تھی۔ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دلچسپی تھی۔ وہ عورت کی عزت کرتا تھا۔ اسے ارجمند کی طرح اینکر اینڈی ماماباؤں کا کھیل نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسے پاکیزہ ہستی سمجھتا تھا۔ مگر خاموشی سے اس کی پرستش کرنا چاہتا تھا وہ عشق کو ایک بلند و بالا چیز سمجھتا تھا ایک ایسا تعلق جسے جسم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ شاید عشق کا یہ تصور اس میں شریعت کے اثر سے پیدا ہوا ہو۔ وہ شریف کے عشق کو بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

ایلی کے دوست ارجمند کو کم عمر لڑکیاں پسند تھیں۔ سارہ

صبورہ میں اسے دلچسپی چھوٹی بہن صبورہ سے ہوئی۔ اسے کیپ کیپ سے دلچسپی تھی۔ ایلی کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کے برخلاف اسے بھرے بھرے جسم اور گول گول رنگین ہاتھوں والی عورتوں سے دلچسپی تھی وہ چوری چوری ان کی طرف دیکھتا بھی تھا مگر انھیں کام کاج سے فرصت ہی نہ ہوتی کہ اس کی نگاہوں یا اس کی موجودگی کو محسوس کریں بقول مصنف "ایلی کو والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی نہیں عشق تھا۔ عورت درحقیقت اس کے ذہن میں بھرے جسم کی ایک گود تھی جس کے پہلوؤں پر بازو اور ہاتھ لٹکتے تھے۔ جو سہلانے اور تھپکنے کے لیے بے قرار تھے"۔

دراصل ایلی نے ہوش سنبھالتے ہی جن عورتوں کو دیکھا یعنی صفیہ اور خانم کو وہی سب سے پہلے اس کی دلچسپی کا مرکز بنیں۔ لہذا اس کا اپنی محبوبہ کا معیار متعین کرنے میں ان دو عورتوں کو جو خاصی دلکش تھیں پیش نظر رکھنا قرین قیاس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عشق ایلی کی نگاہوں میں ایک جسمانی قرب کے بجائے ایک رومانی تصور بن گیا۔

ایلی کو شہزاد سے جو شدید دلچسپی ہو گئی تھی اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ حسین شوخ و چنچل تھی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ عورت اور لڑکی کا مجموعہ تھی۔ شہزاد کا رویہ اس کے لیے کافی ہمت افزا تھا۔ پھر اس کے شوہر شریف کی مجہولیت بھی اسے جرأت رندانہ دینے کے لیے کافی تھی۔ مگر اس کی جنسی جھجک نے اسے کافی عرصے تک کامیاب نہ ہونے دیا۔

بعض جنسی کامیابیاں حاصل ہو جانے کے باوجود اس میں جنسی لپک پیدا نہ ہو سکی۔ مثلاً وہ بالا اور ساجو سے کامیاب ہو چکا

تھا۔ نور سے والہانہ محبت کر چکا تھا۔ اسے تیم سے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔ وہ روزانہ آغا صاحب کے یہاں ایسے وقت پر جایا کرتا تھا جب کہ وہ گھر پر نہ ہوں اور نیم کے توسط سے اشاروں کنایوں میں تیم سے باتیں ہوتی رہیں ایک دن نیم کے مشورے سے ایلی اپنی سائیکل آغا صاحب کے یہاں چھوڑ گیا۔ دوسرے دن جب وہ سائیکل لینے پہنچا تو اس سے کہا گیا کہ سائیکل ساتھ والے مکان میں رکھی ہوئی ہے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو وہاں کئی نوجوان لڑکیوں نے اس کا استقبال کیا۔ انھوں نے تیم کو گھسیٹ کر ایلی کے قریب لا ڈالا اور کہا "پکڑ لو اسے۔ سنبھالو اپنی پیاری کو اب پکڑ بھی لو نا" کئی ایک گوری باہیں اس کی طرف لپکیں اور بالآخر دو بازو اسے تھما دیے گئے۔ ایک قہقہہ گونجا اور پھر وہ سب ہنستی ہوئی ایک زینے کی طرف بھاگیں جو صحن کے ایک کونے سے کوٹھے کی طرف چلا گیا تھا۔ ایلی نے دیکھا کہ وہ سفید سفید بازو تھامے تنہا کھڑا ہے اور فرش پر رنگین کپڑوں کی ایک گٹھڑی پڑی ہے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان سفید بازوؤں کا کیا کرے اور اس گٹھڑی کو کس طرح کھولے۔

اس نے بازوؤں کو جھنجوڑا "ادھر دیکھو" اس نے گٹھڑی کو کھولنے کی کوشش کی مگر گٹھڑی اور بھی سمٹ گئی۔ وہ اس بند گٹھڑی سے گویا کشتی لڑنے میں مصروف ہو گیا مگر اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ گٹھڑی کے پلو اور بھی لپٹ گئے حتیٰ کہ بازو بھی کہیں گم ہو گیا اور وہ گٹھڑی اس کے قدموں میں کپڑوں کا ایک ڈھیر سا بن کر رہ گئی۔"

اس واقعہ سے اس کے احساس کمتری میں اور بھی اضافہ ہو گیا مگر وہ اس دیوار کو گرا دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے جو وسیلہ مہیا ہو سکتا تھا وہ صرف شہزاد تھی۔ شہزاد سے آنکھ مچولی مدت سے چل رہی تھی ایک دن موقع پا کر ایلی شہزاد پر جھپٹ پڑا اور اسے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ شہزاد چارپائی پر گر گئی اور گٹھڑی میں تبدیل ہو گئی۔ شاید ایلی کے حوصلے اور بلند ہو جاتے مگر اسی وقت ملحقہ کوٹھے سے پاؤں کی چاپ اور ساتھ ہی فرحت کی آواز سنائی دی اور اس طرح یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایلی پھر علی پور آیا۔ ایک دن موقع دیکھ کر وہ شہزاد کے چوبارے پر جا پہنچا۔ شہزاد اس وقت کچھ سی رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ شہزاد کی طرف بڑھا اور چپکے سے آنکھ بچا کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا اور پھر دیوانہ وار اس کے لٹکتے ہوئے بازو کو گرفت میں لے کر چومنے لگا کچھ دیر تک دونوں میں محبت آمیز باتیں ہوتی رہیں مگر جانو کی آمد نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔

اس طرح شہزاد پر جھپٹ کر وہ اپنی مردانگی کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔ شہزاد سے قرب اور تخلیہ حاصل ہونے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی محبت کافی بدنام ہو چکی تھی مگر اس بدنامی کی نہ شہزاد کو پرواہ تھی نہ ایلی کو۔ ایلی میں جنسی خود اعتمادی رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی مگر جھجک پھر بھی اس کا راستہ روک لیتی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ "مرد وہ ہوتا ہے جس میں وحشت اور بربریت ہو۔ وحشت اور بربریت عورتوں کو

محبوب ہوتی ہے۔" وہ اسی بات کو ثابت کرنے کے لیے بے قرار تھا۔

ایک دن اس نے شہزاد کی کاٹھ کباڑ رکھنے والی بیٹھک کی ایک کھڑکی کی اندر سے چٹخنی کھول دی اور بہانے سے آرام کرسی لانے کے لیے شہزاد کو بھیجا۔ اس سے پہلے ہی وہ بیٹھک میں بچھی ہوئی چارپائی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ شہزاد کے داخل ہوتے ہی اس نے لپک کر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ شہزاد نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر......

"ایک رنگین دھندلکا ایلی کے قریب آ گیا اور قریب اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لیے دیوانہ وار جونک کی طرح آگے بڑھے۔ ہاتھ، منہ، بازو، جسم وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چومنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تھک ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گر پڑی۔ اس کے بعد بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھٹی میں نیا ایندھن دھکیلنے کی کوشش کی چرر چرر ریشمی کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

"ایلی پاگل نہ بنو"، ایک بار پھر مرمریں جسم کے اس تودے میں حرکت ہوئی۔

"پاگل نہ بنو"، مدھم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بپھر گیا۔

دھپ ایک ہوائی سی چھوٹ گئی اور معاً گرد و پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ خفت ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منفی اثرات کا ریلا اڑا آ رہا تھا۔"

آخر کار وہ تھک کر بچے کی طرح شہزاد کے قدموں میں گر پڑا۔ اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

ایلی دراصل ایسی ہی محبوبہ چاہتا تھا۔ اس کا معیار ایسی ہی عورت تھی جو اسے مادرانہ شفقت دے سکے۔ مگر ایسی عورت مل جانے کے باوجود اس کی اصل پریشانی یہ تھی کہ وحشت اور بربریت کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود وہ ناکام رہا تھا۔ اس کا احساس کمتری اور بھی شدید ہو گیا۔ اس کے دل میں جسم کی نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ عورت کا ڈر اس کی روح پر خوفناک پراسرار سائے کی طرح مسلط ہو گیا اور ایلی کی محبت کے تخیل میں جھوٹی روحانیت کی ایک اور کلی لگ گئی۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایلی کی ایک اور داستان محبت شروع ہوتی ہے۔ یہ ہے سفید منزل والی بہنوں سادی اور باجی کا قصہ۔ یہ حصہ داستانوں کا ایک ضمنی قصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ خلاف قیاس ہے۔ پتہ نہیں مصنف نے اس ضمنی قصہ کو کیوں داخل کیا۔ شاید کچھ ——— "انٹلیکچول ٹچ"

دینے کے لیے یا اس خیال سے کہ قرۃ العین کے سے نستعلیق کرداروں کی بھی اس قصہ میں کمی نہ رہ جائے۔ اس سے پہلے ایلی میں جن عورتوں نے دلچسپی لی اس کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ مثلاً نذیراں نے ایلی میں شاید اس لیئے دلچسپی لی ہو گی کہ اسے ایک نوجوان کی ضرورت تھی اور ایلی آسانی سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ اور پھر ایلی کا گھرانہ اس ماحول میں ایک کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ تقریباً یہی حال شہزاد کا ہے۔ شریف کی مجہولیت اس کی جنسی کم مائیگی۔ ایلی کا بے روک ٹوک گھر میں آنا جانا۔ دونوں میں آسانی سے قرب حاصل ہو جانا۔ اس طرح ان حالات میں شہزاد کے لیے جنسی تشنگی بجھانے کا آسان ترین ذریعہ ایلی ہی تھا۔ اس قسم کی شادی شدہ... عورتیں ایسے نوجوانوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ جو شریف اور بدھو ہوں اس کی نظر میں ایلی شاید موزوں ترین انسان تھا مگر سفید منزل والیوں کے ساتھ معاملہ اس طرح نہیں تھا۔ وہ جمال کے ساتھ وہاں جاتا ہے اور اسے "کال کلوٹے" کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ جمال کی موجودگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اس میں صرف ایک خوبی پیدا ہو گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے باتیں کرنا سیکھ لیا ہے۔ اور جمال اس سلسلے میں بالکل کورا ہے۔ وہ صرف بے تابی سے لپکا جاتا ہے۔ ایلی کو جب پہلی مرتبہ جمال لے کر جاتا ہے تو وہ بہت ناگواری کا اظہار کرتی ہیں پھر محض اس کی باتوں پر اس قدر فریفتہ ہو جانا کہ وہ جمال کو بھی بھول جائیں کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ پھر جس طرح وہ ملتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ملاقات کے لیے پہلے سے محلہ خالی

کروالیا جاتا ہے۔ جس طرح رومی ٹوپی والا پھلوں کا ٹوکرا لے کر جاتا ہے وہ بالکل خلاف قیاس ہے۔ کیا وہ ان کا کوئی مخبر ملازم ہے یا گھر کا کوئی کارندہ ہے۔ اس طرح پھل لے کر جانے سے یہ خیال گزرتا ہے کہ اس معاملہ میں گھر کا کوئی فرد کم از کم ان لڑکیوں کی والدہ ضرور شریک ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

ناول میں جس طرح ان کا تعارف کروایا جاتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑا مہذب گھرانا ہے۔ جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ ایلی نے ایسی ویسی جگہ نہیں بلکہ انصار منصر کے گھرانے میں ہاتھ مارا ہے تو ہر شخص تعجب کرتا ہے۔ اس خاندان کی شہرت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ بہت دولت مند لوگ ہیں۔ اس لیے انصار منصر صرف موٹر سائیکل استعمال کرتا ہے۔ کار ان کے یہاں غالباً نہیں ہے۔ شہرت کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ بہت مہذب تعلیم یافتہ اور باعزت لوگ ہیں۔ جس وقت محبت کی ابتدا ہوتی ہے اور خط و کتابت شروع ہوتی ہے وہ لڑکیاں بھی بڑی مہذب اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہیں۔ خط میں فارسی کے شعر لکھتی ہیں۔ نظم لکھتی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ شعر بھی کہہ لیتی ہیں شروع شروع میں ایلی کو دیکھ کر چڑ گئی تھیں پھر اسے صرف گوارا کر لیا گیا پھر اس سے نام بھی چھٹی آنے لگی پہلے وہ ملاقات سے کتراتی ہیں۔ جب ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو وہ ایک دم نہایت بے تکلف ہو جاتی ہیں سگریٹ پلاتی ہیں۔ پان کھلاتی ہیں۔ اور تقریباً بازار حسن والیوں کی سطح پر اتر آتی ہیں۔ ایلی سے پہلی ہی ملاقات میں جو تیزی اور طراری دکھاتی ہیں

وہ خلاف قیاس ہے۔ شروع میں وہ قرب سے بہت بھڑکتی ہیں بعد میں ان میں سے ایک خود پہل کر کے ایلی کے بالوں کو تھپکنا اور منہ کو سہلانا شروع کر دیتی ہے اور دوسری کے بارے میں جمال کہتا ہے "یہ باجی بھی خاموش لڑکی ہے اور نہ نہ کرتے ہوئے بھی بہت کچھ برداشت کر لیتی ہے"۔ اس کے بعد جمال اپنے گاؤں چلا جاتا ہے اور جب ایلی ان سے ملنے جاتا ہے تو دونوں اس کے اس قدر قریب ہو جاتی ہیں کہ ایلی کو کہنا پڑا "آپ نے بندوقیں جو اٹھا رکھی ہیں کھڑا ہوں تو زد میں رہتا ہوں"۔ اس کے بعد چھوٹی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس پر ایلی کو پھر کہنا پڑا ــــ "مجھے تو ایسے معلوم ہو رہا ہے جیسے اپنا ہولڈ اپ ہو گیا ہو لیکن میری کمر میں دو پستول کی نالیاں رکھنے کا مطلب"! جب ایلی جانے لگتا ہے تو وہ پھر اسے زور سے بھینچ لیتی ہے۔ ایلی ازراہ مذاق یہ کہتا ہے کہ وہ ملاقات کے لیے نہیں آئے گا تو وہ جواب دیتی ہے کہ وہ خود ناد گھر آ جائے گی۔

اس کے بعد جب ایلی ان سے ملنے کے لیے جاتا تو اس طرح پیش آتا جیسے وہاں دونوں بہنوں کے درمیان سانجھے کی چیز ہو۔ دو بہنوں کا ایک ساتھ عشق لڑانا تو قرین قیاس ہے مگر یہ رویہ قطعی خلاف قیاس ہے۔

"رات کو جب باجی اور سادی دونوں موجود ہوتیں تو وہ باجی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا اور باجی سے مخاطب ہو کر کنایہ کی حد سے سادی سے باتیں کرتا ...... اور سادی اس کی ہر بات کو پا جاتی اور اس کے قریب ہوتے ہوئے تڑپتی ماہی بے آب کی طرح تڑپتی ... وہ محسوس کرتا کہ اس کے ہاتھوں

سے تلے باجی پگھل کر چھلک رہی ہے اس کی اس چھلکن کی وجہ سے ایلی پر چھینٹے پڑتے جو اس کے لیے مشکلات پیدا کر دیتے ۔ آسانیاں نہیں ۔ باجی چھلک کر ہار جاتی اور اس پر جھاگ آجاتا اور پھر وہ محروم نگاہوں ۔ سے دونوں کی طرف دیکھتی اور اس کی نگاہیں اور بھی اداس ہو جاتیں"۔

باجی کی یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہے کہ سادی کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے ۔

"آپ میری باجی کو تنگ کر رہے ہیں"۔ سادی قریب تر آ جاتی ۔ چھوڑ دیجیے باجی کو، یہ بہت برے ہیں باجی ان کی باتوں میں نہ آؤ ۔ ان کی باتیں نہ سنو ورنہ تم پانی ہو کر بہہ جاؤ گی ۔ یہ وہ تیراک ہیں پھر اس پانی میں تیر کر اسے پار کر جائیں گے"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس علاقے میں دور دور تک کوئی مرد مہیا نہیں ۔ ہے اس لیے یہ دونوں بے چاریاں ایک ہی مرد سے کام چلانے پر مجبور ہیں ۔

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مصنف نے جو بندوق اٹھانا اور پستول کی نالیاں چھونے کے استعارے استعمال کیے ہیں وہ کس قدر عریاں ہیں ۔

سادی کے گھر والوں کو ان ملاقاتوں کا علم ہو گیا اس کے بعد ایلی کو سادی کا خط ملا جس میں اس سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ اسے بھگا لے جائے عین وقت پر اسے پکڑ لیا جاتا ہے آخر کار لڑکیوں کا بھائی اس پر مہربان ہو کر اس سے ملنا شروع کر دیتا ہے ۔ ایلی آزادانہ ان کے گھر میں آنے جانے لگتا ہے ۔ اس دوران میں دو ایک مرتبہ سادی جس بے باکی کا مظاہرہ کرتی ہے

وہ بھی خلاف قیاس ہے۔ ماں کے سامنے سادی جس بے تکلفی سے ایلی سے باتیں کرتی ہے وہ بھی عجیب سا لگتا ہے۔ اس خاندان کے بارے میں ہر شخص یہی کہتا ہے کہ بڑا مہذب گھرانا ہے۔ انصار منصر کی علمیت کے بڑے چرچے ہیں ذرا اس تہذیب کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

"جب وہ منصر کے علی پور جانے کے متعلق بات کر رہی تھی تو سادی پھر درمیان میں آدھمکی"

اور معلوم ہے اماں علی پور میں الیاس صاحب کبوتروں کے ڈربے میں رہتے ہیں۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی" بھائی کہتے تھے ویسے تو وہ مکانات محلوں کی طرح ہیں لیکن پرانی وضع کے محلات آج کل ڈربے معلوم ہوتے ہیں اور "اماں" وہ بولی "مجھے ڈربوں میں رہنے والے کبوتر بہت پسند ہیں۔ بشرطیکہ اصیل ہوں اور اصیل تو سفید رنگ کے ہوتے ہیں نا ماں" آگے چل کر وہ پھر فقرہ چست کرتی ہے۔

"ویسے الیاس صاحب کی خصلت تو کوّے کی سی ہے چھین کر کھاتے ہیں ویسے نہیں، کیوں الیاس صاحب"

شادی کی بات اٹھی اور مختلف وجوہات کی بنا پر بات بگڑ بھی گئی۔ آخر کار سادی نے ایلی کو خط لکھا اور متعینہ مقام پر یعنی بوڑھے دریا کے پل پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا سارا منظر انتہائی خلاف قیاس اور مضحکہ خیز ہے۔ جو رویہ سادی اختیار کرتی ہے وہ شاید طوائف بھی نہ کرتی ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی پاگل عورت ہے۔

مصنف نے خود لکھا ہے کہ "اس زمانے میں کسی

لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر چلنا آسان کام نہ تھا۔ سائیکل پر آگے بٹھانے کی بات چھوڑیے ان دنوں اگر کوئی اینگلو انڈین لڑکی سائیکل پر سوار دکھائی دیتی تو لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے اور راہ گیروں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں۔

آپ خود اندازہ لگایئے کہ کس قدر مضحکہ خیز منظر ہوگا کہ سادی پھدک کر ایلی کی سائیکل کے آگے بیٹھ گئی۔ تانگے والے راہ گیر ہنسنے لگے ایک تانگے والے نے ترس کھا کر کہا۔ چلیے بابو جی میں پہنچا آؤں مگر سادی نے بارعب آواز میں کہا "ہم سائیکل پر جائیں گے"۔ لوگ ہنس رہے تھے پولیس والا مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ سادی چیخیں مار رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔

"ایلی کو اس وقت قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ سادی کا جسم گویا اس کی آغوش میں تھا اس کے بازو سادی کے گرد حائل تھے۔ سادی کی پیٹھ اس کی چھاتی سے مس ہو رہی تھی اور سادی سے سینٹ کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کی تمام تر توجہ راہ گیروں پر مرکوز تھی۔ اسے اتنی فرصت نہ تھی۔ سادی کو بھی یہ احساس نہیں تھا کہ اس کا جسم ایلی سے مس ہو رہا تھا اور وہ اس کی آغوش میں بیٹھی ہے"۔

اس کے بعد وہ باغ میں چلے جاتے ہیں جہاں چاروں طرف لڑکے بیٹھے ہوئے امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں۔ سب ان دونوں کو طرف دیکھتے ہیں اور ان پر فقرے کستے ہیں۔ سادی اکیلی چونکی لڑتی ہے اور ہر ایک پر فقرے چست کرتی ہے۔ ان کی باتیں سن کر چار پانچ آدمی قوالی کے انداز میں گانے لگتے ہیں۔

"ہمیں لڈو کھلاؤ، ہمیں لڈو کھلاؤ"، ایلی گھبرا جاتا ہے مگر سادی کہتی ہے

"اپنی اماں سے مانگو اپنی اماں سے مانگو" اس برجستہ جواب پر قوال چپ ہو گئے۔ پھر ایک صاحب نے آم پیش کیے اس وقت کی گفتگو ملاحظہ فرمایئے۔

"جب ایلی قریب پہنچا تو وہ کہنے لگی" یہ بھائی آم دے رہے ہیں تحفتہً۔ کھائیں گے آپ" آم دے رہے ہیں

لڈو مانگنے سے بات شروع ہوئی تھی آم کھلانے پر ختم ہو رہی ہے اچھی رہی" وہ ہنسی۔

"معاف کیجیے وہ تو ویسے مذاق تھا" ایک نوجوان نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"کہیں یہ آم والی بات بھی مذاق نہ ہو۔ سادی بولی۔

وہ سب ہنسنے لگے۔

اس کے بعد وہ دونوں آم چوستے ہوئے باغ میں گھومتے رہے۔ سادی بات بات پر ہنستی قہقہے لگاتی اور تالی بجا بجا کر ہنستی رہی۔ بالآخر وہ بڑے سے پلاٹ میں بیٹھ گئے۔ اس منظر کو دیکھ کر دور دور سے طلبہ آ کر اس پلاٹ کے گرد جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد بیس پچیس تک پہنچ گئی۔ پھر وہ چپکے سے پودوں کی اوٹ سے نکل آئے اور انھوں نے سادی اور ایلی کے چاروں طرف حلقہ بنا لیا اور گانے لگے۔

"پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت"

ایلی سخت پریشان تھا۔ وہ لوگ جھوم جھوم کر گا رہے تھے تالی پیٹ رہے تھے اور آنکھیں مٹکا رہے تھے۔ سادی پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اس نے ان سے پوچھا کہ حور کون ہے اور لنگور کون؟ لڑکے سادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حور

حور، چلائے اور ایلی کی طرف اشارہ کر کے لنگور لنگور، لنگور چلائے۔

" لڑکے یونہی شور مچاتے رہے اور سادی قہقہے لگاتی رہی پھر سادی ان کے ساتھ مل گئی اور ان کے پاس سے ذرا ہٹ کر ایلی کی طرف اشارہ کر کے گانے لگی " پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت،، اس کے بعد وہ اطمینان سے ایلی کو ساتھ لے کر چل دی اور پھر تانگے میں سوار ہو کر گھر روانہ ہو گئی۔

اس قسم کا منظر نظم میں لوگ نہ صرف گوارا کر لیتے ہیں بلکہ اس سے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔ مگر ناول میں یہ قطعی خلاف قیاس ہے۔ اس میں کوئی تک نظر نہیں آتی۔ خصوصاً اس حالت میں جبکہ مصنف نے سادی کے خاندان کو پابندی عطا کرنے میں بڑا اہتمام برتا ہے۔ خود انصار منصر کو بہت پڑھا لکھا اور انتہائی مہذب نوجوان ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ اپنے خاندان کو دوستو وسکی کے کیرامینروف خاندان سے تشبیہہ دیتا ہے۔ وہ ایلی سے پوچھتا ہے۔

" آپ نے دوستو وسکی کا ناول برادرز کیرامیزوف پڑھا ہے "

"جی نہیں" ایلی نے کہا، میں نے صرف ایڈیٹ کرائم اینڈ پنشمنٹ پڑھے ہیں "

" ضرور پڑھیے " وہ بولا " اسے پڑھے بغیر آپ ہم کو نہیں سمجھ پائیں گے "

اس خاندان کے تذکرہ کے ساتھ برادرز کیرامینروف کا حوالہ کئی جگہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً صفحہ نمبر ۶۵ ، ۶۵۶ ، ۶۹۰ اور ۵۰۔۷

پڑا۔ میں نے اس حوالہ کے بعد برادرز کیرامیزوف کو دوبارہ پڑھا کہ شاید کوئی مشابہت نظر آئے مگر انصار منصر کے گھرانے اور برادرز کیرا میزوف گھرانے میں کوئی مشابہت نظر نہیں آئی اوّل تو کیرامیزوف گھرانے میں کوئی لڑکی نظر نہیں آتی۔ وہ خاندان چار افراد پر مشتمل ہے۔ بوڑھے کیرامیزوف اور اس کے تین لڑکے۔ یہ چاروں ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور عجیب وغریب قسم کے لوگ ہیں۔ پڑھا لکھا ان میں سے صرف سب سے چھوٹا الیوشا ہے۔ وہ فرشتہ صفت انسان ہے گرجا سے باہر رہتے ہوئے بھی پکا پادری ہے صرف اس میں اپنے بھائیوں کے لیے خصوصاً کے لیے محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ محبت نام کی کوئی چیز اس خاندان میں نظر نہیں آتی۔ مبھلا لڑکا شیطان کا نمونہ پیش کرتا ہے اور ایسے دنیا دار انسان کا نمونہ پیش کرتا ہے جس میں ویسے تو بہت سی برائیاں اور کمزوریاں ہیں مگر کچھ خوبیاں بھی ہیں۔

ان میں سے انصار منصر سے کوئی بھی مشابہت نہیں رکھتا نہ اس کی بہنوں سے اور نہ ماں سے۔ برادرز کیرامیزوف میں رکیٹین الیوشا کی فطرت اور عام کیراموف کی فطرت پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے۔

"You're a sensualist from your father, a crazy saint from your mother.... What is at the root of all you Karamazove is that you are all sensual grasping and crazy."

یہ خصوصیات بھی انصار منغر کے گھرانے کے کسی فرد میں نظر نہیں آتیں۔ انصار منغر کے گھرانے اور کیرامیزوف خاندان میں کوئی مشابہت تو نظر نہیں آتی مگر اس ناول کا اثر "علی پور کا ایلی،، پر ضرور نظر آتا ہے۔ بوڑھے کیرامیزوف کی جھلک علی احمد میں نظر آتی ہے۔ اپنی بیویوں کے ساتھ اس کا رویہ کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔ کیرامیزوف کی طرح علی احمد بھی عورتوں کا دیوانہ ہے۔ جس طرح بوڑھا کیرامیزوف اپنے ہی لڑکے کا رقیب تھا اس طرح علی احمد کو بھی اگر موقع ملتا تو وہ ایلی کے رقیب بن بیٹھتے۔

اس ناول کا ایک اور نمایاں اثر "حاجھا،، کے قصہ میں نظر آتا ہے۔ اس کی داستان اور برادرز کیرامیزوف کی
کی داستان میں بڑی مشابہت نظر آتی ہے۔ وہ ایک ہٹی کٹی پاگل عورت تھی اور شہر میں ماری ماری پھرتی تھی۔ وہ اس لائق نہیں تھی کہ کوئی اس میں جنسی دلچسپی لیتا۔ تقریباً یہی حال حاجھا کا ہے بلکہ وہ تو بے انتہا گندی تھی اس قدر گندی کہ کوئی اس میں دلچسپی لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا ایک دن لوگوں کو پتہ چلا کہ LIZAVETA حاملہ ہو گئی ہے۔ سب تعجب کرنے لگے کہ ایک پاگل عورت کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی۔ اسی طرح علی پور کے لوگوں کو بھی ایک دن پتہ چلا کہ حاجھا حاملہ ہو گئی ہے۔ لوگوں کو اس تصور ہی سے نفرت ہو رہی کہ کس نے ایسی غلیظ عورت کے ساتھ یہ حرکت کی۔ دوستو اسکی اور ممتاز مفتی دونوں نے آخر تک ان عورتوں کے ساتھ حرکت کرنے والے اشخاص کے نام پردۂ راز میں رکھے ہیں مگر دوستوسکی کے یہاں اس کا اخفا بڑی اہمیت رکھتا ہے اس میں ایسے اشارے

ضرور ہیں جس سے شہر کے لوگوں کا خیال بوڑھے کیرامیزوف کی طرف جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس نے تردید کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ LIZAVETA نے لڑکے کو جنم دیا تو کیرامیزوف کے باغ میں۔ اس ناول کے قصہ میں یہ لڑکا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آخر میں وہی بوڑھے کیرامیزوف کو قتل کرتا ہے "علی پور کا ایلی" میں ماجھا کے قصہ کی صرف یہی اہمیت ہے کہ یہ مرد کی ایک نہایت ہی گھناؤنی تصویر پیش کرتا ہے۔ دونوں قصوں میں اس قدر مشابہت ہے کہ ایسی مشابہت کو محض اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔

اس ناول کا ایک اور اہم کردار شہزاد ہے اس ناول پر جتنے بھی تبصرے لکھے گئے سب ہی نے شہزاد کے کردار کی تعریف کی ہے۔ یہ تمام تعریفیں تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ تقریباً یکساں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس صبر آزما ناول کو تفصیل اور توجہ کے ساتھ پڑھا ہو گا۔ لوگوں کے نزدیک شہزاد کی سب سے بڑی وجہ اس کا چھم سے موجود ہونا ہے۔ شہزاد اگر چھم سے نہ آتی تب بھی شہزاد تھی۔ یہ انداز اس کی فطرت کے صرف ایک پہلو یعنی شوخی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

شہزاد عجیب و غریب قسم کی عورت تھی۔ وہ تضادات کا مجموعہ تھی۔ وہ علی پور میں "مونگیا گٹھڑی" کی شکل میں آئی تھی آتے ہی لوگوں کو پتہ چل گیا کہ وہ محلہ کی دوسری عورتوں سے مختلف تھی۔ اس کی ہر بات نرالی معلوم ہوتی تھی اس کا انداز بے حد انوکھا تھا۔ چق کی آڑ میں کھڑی ہونے کے بجائے وہ چق

کو لپیٹ دیتی اور چھپ کر دیکھنے کے بجائے اطمنان سے کھڑکی کے زیریں سہارے پر پاؤں رکھ کر بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتی وہ محلے والیوں کی طرح میلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننا پسند نہ کرتی تھی۔ اس کا دوپٹہ علانیہ شانوں پر گرا رہتا۔ جیسے وہ سر کی جگہ شانوں سے متعلقہ لباس ہو۔ اس کے بال نیم کھلے رہتے اور اس کی آنکھوں کے کونوں میں دور کنپٹیوں تک سرمے کی دھار صاف دکھائی دیتی (بقول مصنف۔ شہزاد کی ہر بات میں عورت اور لڑکی کی آمیزش تھی۔ ایسی آمیزش جو محلے کی کسی عورت یا لڑکی میں نہ تھی۔ شہزاد میں بچپن کی ایک ایسی جھلک تھی جو دوسروں کو کھیلنے پر اکساتی تھی۔"

شہزاد کے حسن شوخی اور بے باکی کی وجہ سے آصفی محلہ کا ہر نوجوان اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر کسی کو گیت یاد آتا کسی کی آنکھوں میں بوندا باندی شروع ہو جاتی ایلی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس سے پچھلے اوراق میں بحث کی جا چکی ہے کہ شہزاد ایلی کو کیوں پسند تھی۔ اسے دیکھتے ہی ایلی میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ شہزاد اس میں دلچسپی لے۔ بہت روز تک وہ شہزاد کا قرب حاصل کرنے کے لیے تڑپتا رہا۔ آخر کار اسے رفتہ رفتہ اس کا قرب حاصل ہو گیا۔

شہزاد بظاہر ہر انسان سے بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اس سے ہر نوجوان کو یہ شبہ ہوتا کہ شہزاد اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ مگر وہ ایک دم بے نیاز ہو جاتی تھی اور اجنبیت اختیار کر لیتی تھی۔ ایلی کے ساتھ بھی یہ توجہ اور بے نیازی کا ملا جلا کھیل مدتوں ہوتا رہا۔

شہزادے کے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی سب سے بڑی وجہ شریف تھا جو اپنی حسین نوبیاہتا بیوی کے سامنے ہر وقت اپنی محبوبہ کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ شریف کو الوز سے اس قدر محبت تھی کہ اس کی جدائی کے بعد وہ حسین سے حسین عورت میں بھی دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ بلکہ اس کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ وہ شہزاد کا مدمقابل نہیں تھا۔ اس نے اپنی مجہولیت پر پردہ ڈالنے کے لیے اس "حقیقی محبت کا پردہ ڈال رکھا تھا"۔ شریف نے سرِ تسلیم خم کرنے کا ایک انوکھا بہانہ ایجاد کر رکھا تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ عشق حقیقی میں ڈوب کر اسے کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی۔ اسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ دنیاوی باتوں پر غور کر سکے۔ اگرچہ شہزاد کا حسن دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہراتی تھی اور ہونٹوں سے لعاب ٹپکنے لگتا تھا۔ لیکن وہ تو قطعی طور پر اور بات تھی۔ اگرچہ بظاہر وہ یہ ظاہر کیا کرتے کہ وہ الوز کے ہو چکے ہیں مگر وہ تو محض ایک دل بہلاوا تھا۔ درحقیقت وہ طبعاً سر جھکا دینے کے عادی تھے اور عرصۂ دراز سے عملی طور پر شہزاد کے سامنے بھی سر جھکا [illegible] تھے۔

شریف کے منہ [illegible] تی اور اس کی کبوتر کی سی آنکھیں چھت پر لگی رہتیں۔ [illegible] ایسی شوخ عورت اس پر کس طرح اور کب تک قناعت کر سکتی تھی۔ وہ کھلم کھلا اس کی نااہلی کا ذکر کر دیتی تھی۔ محلہ والے بھی اس بات سے آگاہ تھے محمد اعظم جو سوداسلف لا کر عورتوں سے قرب حاصل کرتے کے عادی تھے۔ شہزاد سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔

"ہائیں بینگن کھائے گی۔ آج پھر بینگن۔ اوں ہوں بینگن نہیں

کھایا کرتے گرمی ہو جاتی ہے۔ اچھا شریف کو کھلائے گی بیگن
لیکن اس طرح کب تک گزارا ہوگا؟"

خود شہزاد بھی اس کا ذکر اکثر تحقیر کے ساتھ کرتی ہے۔ ایلی نے شریف کا ذکر ہوتے ہوئے شہزاد سے کہا "رات بھر محفل گرم رہتی ہے"

شہزاد نے جواب دیا "وہ بے چارہ کیا محفل گرم کرے گا" آگے چل کر کہا "کسی کو مجال نہیں ہے جو مجھے ہاتھ لگائے تم تو ناحق جلتے ہو"

ایک مرتبہ اس نے شریف کا ذکر کرتے ہوئے ایلی سے کہا "بکرے کی جان گئی پر کھانے والے کو مزا نہ آیا"

جس وقت شریف شہزاد کو بیاہنے جا رہا تھا کسی نے فقرہ کسا تھا "دیکھو تو بھئی یہ دولھا میاں ہیں۔ یوں اپنی برات لیے جا رہے ہیں جیسے کوئی دار پر چڑھ رہا ہو"

محلہ کی عورتیں شہزاد کی بے تکلفی سے چڑتی تھیں۔ مگر اسے تیز اور تیکھے فقروں کو الٹ کر کندن کر دینے میں کمال حاصل تھا ارجمند انگرا ینڈی کا تمام سامان لے کر چوک میں کھڑا ہو جاتا اور بہانے بہانے شہزاد کی کھڑکی کی طرف دیکھتا مگر وہ ارجمند سے اس طرح مخاطب ہوئی کہ آئندہ کے لیے اسکی ہمت جواب دے گئی۔ کہنے لگی "کس داؤ پر کھڑا ہے تو کچھ کامیابی کی امید ہے کہ ایسے ہی؟"

ارجمند اس کے حسن کا بہت قائل تھا۔ ایک دن اس کا ذکر کرتے ہوئے ایلی سے کہتا ہے "سانپ تو اندھا ہے۔ بدنصیب ہے۔ گدھا ہے۔ قسم ہے اگر وہ ایک بار اپنا منہ بہلا

دے تو دنیا تیاگ کر یوگی بن جاؤں۔ ارے دیوی سی دیوی ہے اس کے روبرو سب ہیچ ہیں۔ ایسا چاند ہے جو چمک کر سب ستاروں کو ماند کر دیتا ہے واہ واہ کیا چیز ہے۔"

ایلی کا دوسرا دوست رضا بھی اس کے حسن کا قائل ہے مگر اس کی وفا کا نہیں کہتا ہے "وہ اس محلے کے جوہڑ میں یہ اکیلی ایک ہی راج ہنس ہے۔ چلتی ہے تو جیسے پانی کی لہر اٹھ رہی ہو۔ بولتی ہے تو جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں مگر" ایلی "رضا بولا" میرا دل کہتا ہے یا تو یہ مہارانی ہے اور یا مہترانی ... بس یا تو بہت ہی اونچی چیز ہے اور یا پھر ہے بے حد نیچ یا تو واقعی پرستش کے لائق ہے یا ہر کسی کے ہاتھ کا کھلونا سمجھ لو۔"

اس کے ہر ایک کے ساتھ قہقہے لگاتے اور مذاق کرنے کے بارے میں کہتا ہے " یا تو بڑے صاف دل والی ہے اور یا بڑی چالاک عورت ہے۔ اللہ کرے رانی ہی ثابت ہو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

مصنف جس طرح آہستہ آہستہ شہزاد اور ایلی کو قریب لائے ہیں وہ سب منطقی اور قرین قیاس ہے۔ اس سے پچھلے اوراق میں بحث ہو چکی ہے۔ مگر اس کردار کو دلکش بنانے کے شوق میں انھوں نے کافی مبالغہ برتا ہے۔ جس طرح کی بے تکلفی اور بے حیائی اس سے منسوب کی گئی ہے وہ خلاف قیاس ہے۔ کہیں کہیں تو وہ بازاری عورتوں اور کسبیوں تک کو مات کر جاتی ہے۔ مثلاً جس طرح وہ ارجمند سے مخاطب ہوتی ہے وہ بھی ان حالات میں خلاف قیاس ہے۔

شہزاد اور ایلی کی محبت کا چرچا شہر میں اس قدر ہو چکا تھا کہ تقریباً ہر شخص اس سے واقف ہو چکا تھا۔ عورتیں جب بھی موقع ملتا طنز کے ایک آدھ تیر اس پر چھوڑ دیتیں مگر وہ بڑی خوش اسلوبی سے ان فقروں کو بے اثر بنا دیتی۔ سب سے گہرا وار فرحت کا ہوتا تھا وہ صاف فقرے کستی۔ ایک مرتبہ شہزاد چائے کے لیے ایلی کو بلا نے آئی تو فرحت نے کہا ''معلوم ہوتا ہے شریف جاتے ہوئے ایلی کو تمھیں سونپ گیا ہے'' ایسے فقرے بھی عورت کے لیے عموماً ناقابل برداشت ہوتے ہیں مگر شہزاد نے اسے سن کر کہا ''وہ کہہ گئے ہیں ایلی کو چائے پر ضرور بلایا کرنا''۔

یہ تو شروع کی بات ہے بعد میں یہ حملے اور بھی شدید ہو گئے تھے۔ اس کے طنز کے نشتر وقتاً فوقتاً ایلی پر بھی چلتے ہی رہتے تھے۔

شہزاد کی ملازمہ چانو بھی کبھی نصیحت کے پیرایہ میں کبھی تنبیہہ کے پیرایہ میں اسے سمجھاتی رہتی مگر وہ ان سب باتوں کو ہنسی میں ٹال دیتی ہے۔ اتنا ظرف اور ضبط عورتوں کی فطرت کے منافی ہے۔

میاں کیسا ہی ہو مگر عورت اس کے سامنے پارسا بنی رہتی ہے۔ مگر شہزاد شریف کے سامنے ہی ایسے اشارے کنائیوں میں ایلی سے محبت کا اظہار کرتی ہے کہ وہ حقیقت پر پردہ ڈالے رکھنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ شریف ایلی کے معاشقے کے بارے میں شہزاد سے رائے لیتا ہے۔ اس وقت کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

''سارے محلے میں چرچا ہے'' شہزاد بولی ''سنا ہے حسن میں جواب نہیں اس کا جبھی تو اس کی یہ حالت ہو رہی ہے دیکھو تو

اس کی طرف مجھ سے کہتا تھا وہنسی بے تحاشا ہنستی چلی گئی مجھ سے کہتا تھا میں زہر کھالوں گا۔"

ایلی نے غصہ سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

"اب دیکھ بیچے کیسے دیکھ رہا ہے میری طرف۔ پرا تھان سے کہنا تم نے کہا نہیں تھا مجھ سے کہ میں زہر کھالوں گا۔"

ایلی شہزاد کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شوخی اور بے باکی دیکھ کر گویا وہ سکتے میں آگیا تھا۔

"اوہوں،، شریف مسکرایا۔" زہر کھانا مردوں کا کام نہیں،،

"یہی میں نے اس سے کہا تھا۔" شہزاد قہقہہ مار کر ہنسی "لیکن یہ کہتا ہے میں مرد نہیں۔ کوئی پوچھے کیسے نہیں میں تو مرد سمجھتی ہوں اسے۔"

"زہر کھا کر مر جانا مرد کا کام نہیں۔" شریف بولا۔" میری طرف دیکھو جی رہا ہوں۔ اتنا کچھ جھیل کر بھی جی رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ اس کو بھی تمہارا خیال ہے یا نہیں۔"

شہزاد نے پھر قہقہہ لگایا۔" وہ تو مرتی ہے "وہ بولی۔ اس کو یقین نہیں آتا سمجھتا ہے اسے ذرا بھی پرواہ نہیں۔ اب وہ بے چاری کیا کرے۔"

ایلی شہزاد کی دو دھاری باتوں سے طیش میں آرہا تھا لیکن ان باتوں میں جو کنایہ کی مدد سے ایلی سے کی جا رہی تھیں ایک عجیب سی لذت تھی۔

"کیوں مذاق کر رہی ہیں۔" ایلی نے شہزاد کو گھورا۔

"مذاق وہ بولی۔" میں تمہیں کیسے یقین لاؤں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی اس قدر سنجیدگی سے بات نہیں کی مشکل تو یہ ہے

کہ تمھیں یقین نہیں آتا اب میں کیا کروں" شہزاد کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایلی گھبرا گیا۔ وہ شریف کی موجودگی میں براہ راست اس سے باتیں کر رہی تھی جو اس نے ایلی سے کبھی تخلیے میں بھی نہ کی تھیں۔ اور بھولا بھالا شریف مسکرا رہا تھا"

یہ اشارے اس قدر واضح تھے کہ انھیں سن کر شریف کا مسکرانا ناممکن تھا۔ یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ اپنی نا اہلی کی بناء پر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی شریف انجان بن رہا تھا کیوں کہ اسی شریف نے بعد میں ایلی کے خلاف اغوا کا مقدمہ بھی دائر کر دیا تھا۔

اس واقعہ کے اگلے روز ہی ایلی کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ وہ بھی شریف کو درمیان میں لاکر استعاروں میں شہزاد سے باتیں کر رہا تھا۔ ذرا اس گفتگو کو ملاحظہ فرمائیے کس قدر خلاف قیاس ہے۔

شریف نے ایلی کو مشورہ دیا کہ دنیا والوں کی پرواہ نہ کرے اور اپنے اندر جرأت پیدا کرے۔ اس پر شہزاد بولی اس کا تو ڈر ڈر کر برا حال ہو رہا ہے۔ اس سے دلیری کی امید رکھنا لا حاصل ہے شہزاد نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی۔

"کیوں ایلی یہ ٹھیک کہتی ہے تم ڈر جاؤ گے کیا" شریف نے پوچھا۔

"میں، میں" ایلی گھبرا گیا۔

"لو دیکھ لو" شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تو اتنی سی بات پر گھبرا جاتا ہے"

شریف نے شہزاد کی بات کو نظر انداز کر دیا "لیکن یہ بتاؤ ایلی کیا اسے تمھاری پرواہ ہے۔ کیسی ہے وہ"

"وہ" ایلی نے دہرایا اور پہلی مرتبہ اس نے جرأت سے کہا "اتنی رنگین ہے کہ" وہ معنی خیز نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اتنی رنگین ہے اتنی شوخ ہے اتنی پیاری ہے کہ میں کیا بتاؤں"

"لیکن کیا وفادار بھی ہے یا نہیں" شریف نے پوچھا۔

"وفادار" ایلی نے پھر شرارت سے شہزاد کی طرف دیکھا اور پھر آہ بھر کر بولا "پیاریوں میں وفا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے بلند بالا جو ہوئی وہ بے چاری وفا کیا جانے"

"جھوٹ اتنی وفا ہے اس میں" شہزاد نے مشین چلاتے ہوئے کہا "کہ کیا بتاؤں"

"تم کیسے جانتی ہو اسے" شریف بولا "خواہ مخواہ"

"واہ میں نہیں جانتی تو کون جانتا ہے" وہ قہقہہ مار کر بولی۔ "وہ تو"

"لیکن ایلی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ایلی کے لیے وہ سلسلہ گفتگو ناقابل برداشت اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ براہ راست محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ عہد و پیمان کر رہے تھے اور وہ پردہ جس کے تلے انھوں نے اپنے جذبات کو چھپایا ہوا تھا۔ ہر ساعت باریک سے باریک ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن بات کاٹنے کے بعد وہ گھبرا گیا اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔

پھر گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکل گیا کہ مجھ میں کون سی خوبی ہے کہ وہ مجھ سے وفا کرے۔ میری شکل و صورت ملاحظہ

ہو۔"

شہزاد ہنس پڑی "سبھی عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں" وہ بولی۔ وہ شکل صورت نہیں جانچتیں۔ خوبیاں نہیں تلاش کرتیں۔ سمجھ لو پھنس جاتی ہیں اور بس پھنس گئی تو پھر ڈکن کیسا" وہ ہنسی اور پھر بولی" اور پھنس جائیں تو ایک بار تو پھر باہر نکلنا پسند نہیں کرتیں۔ عورتوں کا کیا ہے" شہزاد نے آہ بھر کر کہا" ڈٹ جائیں تو دنیا کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں کو کو چیر دیتی ہیں اور عاجز ہونے لگیں تو نالی کے کنارے بیٹھ کر رو دیتی ہیں۔"

یہ اقتباسات بہت طویل ہو گئے ہیں مگر اس صورت حال کی مکمل تصویر پیش کرنے کے لیے ان کو درج کرنا ضروری تھا۔

شہزاد کی شخصیت کو دلکش بنانے میں مصنف نے اس قدر محنت صرف کی ہے کہ اس کے کردار میں کچھ ماورائیت سی آگئی ہے۔ اسے اس ضخیم ناول کے شایان شان ہیروئین بنانے کے لیے بعض عجیب و غریب باتیں بھی اس سے منسوب کی گئی ہیں۔

ایک مرتبہ حاجرہ کو بہت خطرناک سانپ نے کاٹ کھایا ڈاکٹر نے لوگوں کو متنبہ کر دیا کہ جو اس کے جسم کو چھوئے گا اس کے بھی زہر چڑھ جائے گا۔ اتنے میں ایک سپیرا آ گیا اور اس نے اس کا زہر اتار دیا وہ بہت خوش ہوا کہ اسے اس بہانے سندر کیڑے کے درشن ہو گئے وہ اس سانپ کو ڈبیا میں بند کر کے لے گیا۔ اسی دوران اس کی نگاہ شہزاد کے ماتھے کے تل پر پڑی۔ وہ بولا تیرے تو ماتھے پر بندی ہے تو آپ ناگ دیوی ہے" سپیرے نے اسے چند سیاہ مرچیں دیں اور کہا کہ وہ انہیں کھا لے۔ ایک مرتبہ شہزاد کی انگلی میں بھڑ نے کاٹ لیا۔ جو نہی شہزاد نے انگلی منہ میں

رکھی درد غائب ہو گیا۔ گویا مصنف نے شہزادو میں ایک روحانی قوت بھی پیدا کر دی۔

اس سپیرے کے قصے کے ساتھ ساتھ سانپوں کے اور بھی عجیب و غریب قصوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک ایسے سرمے کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس کی سلائی لگائی جائے تو سانپ کے زہر کا اثر دور ہو جائے۔ ایلی نے خود اس کی تاثیر کا مظاہرہ کیا۔ عقیدے کی بات تو الگ ہے ورنہ یہ ساری باتیں محض توہم پرستی ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی پراسرار قصے ہیں۔ پہنچے ہوئے لوگوں اور مرشدوں کے بھی قصے ہیں ہو سکتا ہے کہ مصنف کو اس طرح کے کرشمے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو اور وہ ان پر عقیدہ بھی رکھتے ہوں مگر ناول میں یہ عجیب سے لگتے ہیں۔ ناول میں قرین قیاس ناممکنات کے لیے تو گنجائش نکل سکتی ہے مگر خلاف قیاس امکانات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

ہاجرہ کے مرشد حاجی صاحب جو ایک عجیب و غریب پیر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انھیں ایسے مرہم کا نسخہ حاصل ہو گیا تھا جس کی تاثیر یہ تھی کہ اس کی ایک سلائی آنکھ میں لگا کر جس عورت سے آنکھیں ملائی جائیں پیچھے چل پڑے۔ اس طرح کئی عورتیں جب حاجی صاحب کی گرویدہ ہو گئیں تو انھوں نے تنگ آ کر مرہم کی شیشی سمندر میں پھینک دی۔

ایلی میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ حاجی صاحب اور پاگ بابا اور دوسرے بزرگ ایلی پر توجہ دیں اور اس پر مہربان ہو جائیں۔ پاگ بابا بڑے غیب داں تھے۔ انھوں نے ایلی کو وہ سارے واقعات یاد دلائے جب بزرگوں نے اس کی مدد کی

ذرا اس وقت کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

"کیا نہیں کیا۔" بابا چلایا" کیا نہیں کیا ؟ جب تم نے ڈیرہ میں ڈیرا لگایا تو حضرت شاہ عوز نے تم پر ترس کھایا اور تم کو حفاظت میں لے لیا۔ نہیں لیا تھا؟"

ایلی نے ڈیرہ کا نام بابا کے منہ سے سن کر حیرت سے بابا کی طرف دیکھا۔

کیا نہیں کیا اس نے" بابا چلایا" کیا نہیں کیا" وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔ واپس وہ پھر ایلی کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

اور تم کو وقت پر وہاں سے نکال دیا اور تمھیں چلے کٹڑے میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا ؟ اس کے اور بھی مواقع کا ذکر کیا جہاں جہاں کہ قدرت نے ایلی کی مدد کی۔

حاجی صاحب ایلی کو ملانے کے لیے ایک عالم کے پاس لے جاتے ہیں۔ انہیں ایلی نے محض عربی ماسٹر سمجھا تھا۔ ان کی علمیت کا ثبوت نہائت بھونڈے طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کی علمیت صرف اس مثال کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے کہ انھوں نے گوڑ کا ذائقہ بتا دیا تھا۔ حالانکہ ان کی روحانیت کا یہ عالم تھا کہ وہ بیک وقت دو مقامات پر موجود ہو سکتے تھے۔ اس مثال کے ذریعہ ان کی عالمانہ شان اور ان کی روحانیت کی حقیقی تصویر سامنے نہیں آسکی۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی قصے ایسے ہیں جن میں روحانیت کا رنگ نظر آتا ہے مثلاً غلام اورنگی کے قصے۔ یہ مضمون بہت طویل ہو چکا ہے اس لیے ان کا بیان ترک کیا جاتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر ہاشم کا مختصر سا تذکرہ ضروری ہے۔

پیشہ کے اعتبار سے یہ ہومیو پیتھ تھے مگر حلیہ بالکل مجذوب

جیسا تھا اور علاج میں ہومیو پیتھی سے زیادہ روحانی علاج کی شان نظر آتی تھی۔ ذرا ان کے مطب کا حال ملاحظہ ہو۔

"صحن میں ایک درخت کے نیچے ایک تخت پڑا تھا جس پر ایک پرانا سا تکیہ لگا تھا نیچے ایک سادہ سا گدا بچھا ہوا تھا۔ ایک چھوٹے سے ڈسک کے گرد بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ پاندان.... محدب شیشہ۔ ربڑ کی تھیلیاں۔ ڈیسک پر ایک پرانا قلم دان پڑا تھا"

اب ذرا ڈاکٹر صاحب کے برآمد ہونے کا منظر دیکھیے۔

"دفعتاً زنان خانے کا دروازہ کھلا۔ ایک لڑکا ایک حقہ اٹھائے باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے اس کے پیچھے پیچھے ایک دیوانہ سا آدمی یوں لڑھکتا ہوا آ رہا تھا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر متحرک کر دیا ہو۔ اس نے ایک لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ نیچے سیاہ جرابیں تھیں ایک پھٹی ہوئی گرگابی۔"

وہ آتے ہی ہر مریض سے جذباتی انداز سے باتیں کرتا ہے۔ ایک تپ دق کے مریض سے کہتا ہے کہ تمھارے لیے میرے پاس دوا نہیں تم اللہ کے پاس جاؤ۔

شہزاد کے لیے ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن جیئے گی۔ وہ کیا خدا ہیں؟" اس مریض کے لیے ڈاکٹر نے صرف ایک پڑیا شہزاد کے منہ میں ڈال دی اور کہا "جاؤ چلے جاؤ اور اچھے ہوتے جاؤ" اسی ایک پڑیا سے اس کا مرض جاتا رہا اور قیمت اس پڑیا کی صرف دو آنے۔

چھ مہینے کے بعد وہ پھر بیمار پڑ گئی۔ اس مرتبہ بھی اس کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اس مرتبہ کی گفتگو ملاحظہ کیجیے۔

"میاں" وہ پھر بولا "ہم کیا خدا ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ ہے"

جسے صحت دینی مطلوب ہوتی ہے ہمارے ہاتھ سے صحیح دوا لکھوا دیتے ہیں ورنہ یوں ہی اناپ شناپ دوائی مل جاتی ہے ۔سب اللہ کی شعبدہ بازی ہے کون حکیم ہے اور کون ڈاکٹر۔ سب ڈھونگ ہے ڈھونگ ۔"

اس کے بعد ایلی سے کہتا ہے کہ وہ بچے پڑھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ یہ کام چھوڑ دے اسے مشورہ دیا "اگر ادھر نہ پہنچے تو مینٹل ہسپتال پہنچ جاؤ گے اور وہیں مرو گے ۔ -ایلی نے جواب دیا کہ وہ ادھر سے واقف ہی نہیں ہے اس پر ڈاکٹر نے ہنس کر کہا " وہی پہنچتے ہیں جو واقف نہیں ہوتے ۔ بلائے جاتے ہیں۔ اللہ نے بڑے بڑے پاکھنڈ مچا رکھے ہیں "

ڈاکٹر اس کا حلیہ۔ اس کا مطب ۔ اس کا انداز گفتگو۔ اس کی خداقت ان ساری باتوں سے وہ ہومیو پیتھ کے بجائے درویش یا جوگی نظر آتا ہے ۔ اس ڈاکٹر کا قصہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مصنف روحانیت پر کافی عقیدہ رکھتے ہیں

آخر میں ایلی میں بھی کسی طرح ایسی روحانی بلندی پیدا ہو جاتی ہے کہ پاگ بابا۔ حاجی صاحب رومی ٹوپی والے ۔ دلی کے عالم ان سب کے نزدیک وہ وقت آگیا ہے ۔جبکی یہ مختلف اوقات میں پیشینگوئی کرتے رہے ہیں ۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا اس ناول میں خلاف قیاس واقعات بھی بہت ہیں ان میں سے کئی کا ذکر گزشتہ سطور میں آ چکا ہے اس کے علاوہ محمود اور میم کا قصہ ان کی باتیں اور میم کا مضحکہ خیز رویہ بھی خلاف قیاس ہے ۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف نے کسی میم کو اور اس کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہی نہیں ہو گا

ایک اور خلاف قیاس قصہ آصف کی محبوبہ کا ہے جس قسم کا رویہ وہ آصف کی زندگی کے دوران اور اس کی موت کے بعد اختیار کرتی ہے وہ قطعی خلاف قیاس ہے۔

اس قسم کا ایک خلاف قیاس قصہ نورانی کا ہے۔ اس نے ایلی سے کہا "الیاس صاحب اگر میں عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لوں۔ نگاہیں ایک بار چار ہو جائیں تو میری تلاش میں تمہارا دروازہ نہ کھٹکھٹائے تو میرا ذمہ" لطف یہ ہے کہ نورانی حسین وجمیل نہیں بلکہ خاصا بدصورت انسان تھا۔ اس دعوے کی آزمائش کے لیے دونوں میں شرط ہو گئی۔ البتہ نورانی نے یہ شرط رکھی "کسی معصوم بچی کو نہ منتخب کرنا اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی"۔ ایلی اسے طوائف کے یہاں لے گیا دونوں وہاں سے چلے آئے ایلی شرط وغیرہ کے بارے میں بھول گیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے پتہ چلا کہ وہ طوائف اس دن سے نورانی کی مالا جپ رہی ہے۔ محض نگاہ بھر کر دیکھ لینے سے عورت کا اس قدر گرویدہ ہو جانا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ دیکھنے والے میں کوئی خوبی نہ ہو خلاف قیاس ہے۔ یہ تاثیر بالکل اسی قسم کی ہے جیسی کہ دلی کے حاجی صاحب کے مرہم میں تھی۔

ایلی کی شخصیت میں کچھ حصہ مصنف کا بھی ہے۔ ایلی کی طرح وہ بھی محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے ہیں۔ ایلی ٹریننگ کے دوران اور ملازمت کے ابتدائی دنوں میں جن منزلوں سے گزرا ہو سکتا ہے کہ وہ مصنف کا مشاہدہ ہو یا آپ بیتی۔ ٹریننگ کے دوران اور ملازمت کے زمانہ میں جیسے جیسے رفقائے کار اور جس جس قسم کے ہیڈ ماسٹر ملتے

ہیں۔ ایسے ہیڈ ماسٹر بھی جو کسی کو زندہ درگور کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور ایسے شریف النفس بھی جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ ان سب کا تذکرہ کافی حقیقت آگیں ہے ایسی ملازمتوں میں سرکاری انکوائری کس قسم کی ہوتی ہے اور انکوائری کرنے والے افسر کا رویہ عموماً کیا ہوتا ہے۔ یہ بھی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مضمون کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ان تمام واقعات سے بھی بحث کی جاتی مگر یہ مضمون پہلے ہی گرنتھ صاحب کی سی نوعیت اختیار کر چکا ہے۔

علی پور میں اور اس کے باہر ایلی کے بہت سے دوستوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہت سے کردار تھوڑی دیر کے لیے سامنے آتے ہیں مگر اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ آصف، اللہ داد۔ جمال۔ ایم کے چاہ۔ بھا۔ شام۔ ارجمند۔ جی کے وغیرہ ان میں سے کئی کردار نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں مگر ایلی کے تمام دوستوں میں دوستی اور وفا کا جو نمونہ رضا پیش کرتا ہے۔ وہ کسی کے یہاں نظر نہیں آتا ہے اس لیے صرف اسی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

"دیکھ ایلی" وہ بولا۔ میں تیرا دوست ہوں بول کیا چاہتا ہے تو۔ چاہے جائز ہو یا ناجائز ہو۔ روپیہ چاہیے تو مجھ سے لے لے۔ چاہے چوری کر کے لاؤں لیکن تیرے سامنے ڈھیر کر دوں گا کسی سے دشمنی ہے تو بلا خوف کہہ دے اسے ایک ایسی ہاکی سٹک نہ دلادوں تو میرا ذمہ۔ کسی سے محبت ہو گئی ہے تجھے تو بتا کیسے نہیں آئے گی وہ۔ کس کی جان ہے جو تمھارے یار کی

بات رد کر دے جینا مشکل کر دوں گا اور نہ مانے گی تو اور طریقے بھی ہیں تو کسی طرح خوش رہ اپنا تو صرف یہی ایک مقصد ہے کہ تجھے تکلیف نہ ہو۔"

اس ناول میں بعض جگہ عریاں مقامات بھی ہیں۔ اتنے طویل ناول میں جہاں کہ مصنف نے بہت سے کردار، واقعات اور مختلف قسم صورتحال پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہاں دو چار مقامات پر عریانی کا رنگ پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں مگر دو چار جگہ عریانی کے ساتھ ساتھ بھونڈا پن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً مصنف نے صفحہ ۳۵۵ سے لے کر ۳۶۰ تک ایک طوائف کے گھر کا منظر بیان کیا ہے اور اس کے ایک ربر کی تھیلی کو نکال کر اسے صابن سے دھونے اور پھر اسے استعمال کرنے کا منظر جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ نہائت ہی بھدا ہے اگر وہ اس ربر کی تھیلی کا صرف نام استعمال کر دیتے تو ہر شخص اسے بہ آسانی سمجھ جاتا۔

اس ناول کو پڑھ کر ایک اور احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ ناول تقسیم سے پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

تلاشِ بہاراں

جمیلہ ہاشمی

ہمارا اردو ناول

"تلاشِ بہاراں" اس جدید عہد کا قدیم ترین ناول ہے۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے شرر اور پریم چند کے فن کی چھاپ اس ناول کے تقریباً ہر صفحہ پر نظر آتی ہے اس کے کئی اہم کردار درصل کردار کے بجائے مثالی ہستیاں ہیں۔

پہلے ہی صفحے پر سب سے پہلے جو نام سامنے آتا ہے۔ وہ کنول کماری ٹھاکر کا ہے۔ یہ پورا ناول دراصل اسی کنول کماری ٹھاکر کا قصیدہ ہے۔ مثالی انسان تو آپ کو بہت سے ناولوں میں ملیں گے۔ شرر اور پریم چند کے ناول ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں مگر وہ انسان ضرور ہوتے ہیں۔ کنول تو ایک عجیب وغریب ہستی نظر آتی ہے۔ آپ ویسی عورت کا تصور بھی نہیں کر سکتے ایسی عورت نہ کبھی ہندوستان میں ہوئی ہے اور نہ کسی اور جگہ۔ اس میں اس قدر صفات جمع کی گئی ہیں کہ ان کا کسی انسان میں تو کیا دیوی دیوتا میں بھی جمع ہونا ناممکن ہے۔ ہندو دیومالا میں دیوی اور دیوتاؤں کے جو قصے ملتے ہیں ان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان فوق فطری ہستیوں میں بعض کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ نہیں تو رقابت، رشک اور حسد کے جذبات ان میں اکثر بیان کیے گئے ہیں مگر کنول میں تو کسی کمزوری کا نام ونشان بھی نہیں ہے پھر لطف یہ ہے کہ اس میں ہر صفت کمال کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے۔

پہلے ان صفات کو لیجیے جو عورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں۔ پہلی صفت

جس کی بنا پر کوئی عورت کسی مرد کی توجہ کا مرکز بنتی ہے وہ اس کا حسن ہے اور اس خصوصیت میں کنول لاجواب ہے حسن کی انتہا یہ ہے کہ اس میں رعب حسن کی شان پیدا ہو جائے۔ کنول کا حسن اس سے کچھ آگے ہی ہے راوی نے جس کے لیے واحد متکلم استعمال کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے کنول کو غیر ملکی وفد سے ملاقات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس وفد سے عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے مل رہی تھی۔ راوی کا تاثر یہ تھا "اس کی پیشانی پر وہ نور تھا جس کو لفظ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور گہری پر وقار آواز اس کم عمری کے باوجود مؤثر تھی۔" لفظ "کم عمری" سے آپ کسی مغالطہ میں نہ پڑیں ظاہر ہے غیر ملکی وفد سے ملاقات کرنے والوں کا انتخاب اور پھر نمائندہ حیثیت سے ذرا سوچ سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے۔ کسی پندرہ سالہ چھوکری کو یہ موقع دیا جانا خلاف قیاس ہے۔ اس وقت بھی وہ خاصی پڑھی لکھی، باشعور اور اچھی خاصی عمر کی رہی ہو گی جسے لڑکی کے بجائے عورت کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد راوی اسے وکیل کی حیثیت سے کرشنا بوس کے مقدمہ کی پیروی کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وکالت کے فن میں اسے کس قدر کمال حاصل ہو گا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا مدِ مقابل ایک مشہور وکیل ترون کمار بنیرجی تھا اور مقدمہ کا فیصلہ کنول کے حق میں ہوا تھا۔ بھلا دیوی کے مقابلے میں انسان کو کیسے کامیابی ہو سکتی ہے۔ کنول کی اس زمانہ کی عمر کا اندازہ لگانے میں اس واقعہ سے بھی مدد مل سکتی ہے۔

کرشنا بوس کے شوہر رویندر کے والد ایک صاحب ثروت اور با اثر آدمی تھے۔ راوی نے رویندر کے باپ کی زبان سے سنا تھا کہ اگر کنول نے کرشنا کی حمایت ترک نہ کی تو اسے اغوا کروا دیں گے۔ راوی

نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں کنول کی جان خطرے میں ہے۔ لہذا وہ اسے مطلع کرنے اس کے گھر گیا۔ اس وقت بارش کافی تیز ہو رہی تھی۔ دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو راوی نے نظریں جھکا لیں "ان آنکھوں کی چمک ناقابل برداشت تھی"۔ راوی نے اسے خطرے سے آگاہ کیا تب بھی کنول کی طمانیت میں کوئی فرق نہیں آیا اس نے نہایت اطمنان سے کہا۔ "روبندر کمار اور اس کے باوا میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں"۔ حالانکہ اتنے بااثر لوگوں کی دھمکی کا ذکر سن کر باہمت مرد بھی اگر گھبرائے گا نہیں تب بھی فکر مند ضرور ہو جائے گا۔ مگر ایک اکیلی عورت کا جس کے یہاں کوئی محافظ بھی نہیں ہو اغوا کی دھمکی پر اس قدر مطمئن اور پر سکون رہنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ مگر قصیدہ گو کا تو کام ہے اپنے ممدوح کی تعریف کیے جانا چنانچہ راوی اس کے اطمنان پر کہتا ہے: "جو اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہ سکے وہ عورت نہیں ہے کوئی دیوی ہے"۔

روبندر کے باپ نے چار آدمیوں کو کنول پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا اس کا ذکر وہ راوی سے کرتی ہے "آدھی رات کو چار آدمیوں کا اکیلی عورت کے گھر حملہ کرنے کی غرض سے کود کر چوری سے آ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک عورت کے ذہن سے وہ خائف ضرور ہیں۔ روبندر کے پتا کو معلوم نہیں تھا کہ میں کنول ہوں اور زندہ رہنے اور نظام کو بدلنے کی جن راہوں پر چل رہی ہوں وہ ان کی راہوں سے بہت دور ہیں"۔ آگے چل کر کہتی ہے "مجھے چار آدمیوں کا گھر میں گھسنا ایسے ہی لگا تھا۔ جیسے چار شریر اور گستاخ بچے اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کی خاطر مارے مارے پھرتے میرے گھر میں پناہ لینے آ گئے ہوں"۔

کتاب میں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ شریر اور گستاخ بچے کنول کے

ساتھ کس طرح پیش آئے اور کنول نے ان کا مقابلہ کس طرح کیا۔ ہو سکتا ہے کہ راوی کی طرح وہ بھی کنول کو دیکھتے ہی اس کے حسن سے مرعوب ہو گئے ہوں اور اسے قتل کرنے کے بجائے اس کے حسن کی داد دیتے ہوئے بھاگ گئے ہوں۔ شاید انھوں نے بھی راوی کے ہم زباں ہو کر کہا ہو "ہمارے تصورات میں حسن کا جو مقام ہو سکتا وہ سارا کنول کے چہرے پر تھا۔"

راوی کنول سے پندرہ سال بعد ملتا ہے۔ ان پندرہ سالوں میں بڑا میں تبدیلی آگئی ہے کرشنا بوس کے بال بھی سفید ہوتے لگے ہیں مگر کنول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ انگلستان میں بھی چند سال گزار آئی ہے اور وہاں کی مشہور ترین یونیورسٹی آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم کی سند لے آئی ہے ذرا سوچئے کہ بالغ عورت کی عمر میں پندرہ سال کا اضافہ کتنا اہم ہوتا ہے وہ یقیناً ادھیڑ عمر کو پہنچ چکی ہو گی اور ادھیڑ عمر کی عورت کے حسن میں کتنی کشش رہ جاتی ہے اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں مگر کنول کو تو شاید رائڈر ہیگرڈ کی "SHE" کا کوئی نسخہ مل گیا ہے کہ اس کی طرح کنول کی جوانی بھی سدا بہار ہے۔ ذرا راوی کے تاثرات ملاحظہ کیجیے۔

"پندرہ سال پہلے اور آج کی کنول میں کتنا کم فرق ہے۔ پندرہ سال پہلے کے چہرے پر صرف سنجیدگی بڑھ گئی ہے چال میں اور زیادہ متانت اور وقار آگیا ہے۔ پندرہ سال پہلے میں جس عورت کے قدموں پر محبت کی بھیک مانگنے کے لیے جھکا تھا۔ آج بھی اس کے قدموں پر جھک سکتا ہوں۔"

یا تو راوی کی بینائی اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ جوان اور ادھیڑ عورت میں فرق محسوس نہیں کر سکتا یا اس کی شدید جذباتیت نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر یہ صرف راوی کی غیر معمولی جذباتیت ہوتی تو ہم

جان لیتے مگر اس عمر میں اس کی محبت کے گرفتار اور بھی نظر آتے ہیں۔

راجندر پرشاد راوی کا ایک نہایت وجیہہ، تعلیم یافتہ اور نستعلیق قسم کا دوست تھا راوی نے اس کی ملاقات کنول سے کروادی تھی۔ راوی کہتا ہے "راجندر کا تعارف کنول سے میں نے کروایا تھا اور پھر اپنی نفاست اور مقناطیسی قوت سے وہ اس کے نزدیک ہوتا گیا۔ یہ نہیں کہ کنول پر کسی کشش کا اثر ہو جاتا تھا۔ پھول اور پتھر قریب تھے اور پتھر کی چمک میں پھول کا عکس کانپنے لگا تھا۔ وہ عورتوں کی آزادی کا حامی نہیں تھا۔"

راوی نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ راجندر بھی اس دیوی کا ویسا ہی عقیدت مند بن جائے گا مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ اور وہ نہ صرف یہ کہ کنول پر عاشق ہو گیا بلکہ اس نے ہمت سے کام لے کر اظہار عشق بھی کر ڈالا۔ راجندر کا تعارف جس طرح کروایا گیا ہے اور اس کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ کسی بھی عورت کے لیے قابل قبول ہو سکتا تھا۔ پھر وہ بقول راوی پہلا شخص تھا جس نے کنول کو اس کے وجود سے الگ کر کے ایک عورت کے روپ میں چاہا۔ اس نے کنول کو محبت آمیز خط لکھا مگر وہ شاید جنسی محبت کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔ بقول راوی "مردوں کے لیے اس نے وہ دیوانہ جذبہ کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کیا جس کو عشق کہتے ہیں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی حیاتیاتی خامی تھی ورنہ کسی نہ کسی کے لیے تو وہ اپنے دل میں دھڑکن ضرور محسوس کرتی۔

راجندر اور کنول کے تعلق کے بارے میں شاید مصنفہ نے دو تین مرتبہ رائے بدلی۔ پہلے قریب لانا چاہا پھر راجندر کو اس کا مدمقابل نہ سمجھ کر

دور کر دیا۔ کتاب کے اختتام کے قریب شاید مصنفہ کو راجندر پرشاد پر ترس آگیا اور یہ سوچا کہ ان میں جنسی محبت نہیں تو ہم خیالی اور دوستی ہی پیدا کروادی جائے۔ ہندوستان کے حالات زیادہ خراب ہوتے گئے جگہ جگہ فسادات ہونے لگے۔ ہر وسیع النظر آدمی فکرمند تھا ان حالات میں راجندر نے بھی اپنی ملازمت سے استعفےٰ دے دیا۔ استعفے کی وجہ راجندر نے راوی سے اس طرح بیان کی "تم عہدے کو کیوں اتنا گھسیٹتے ہو۔ وہ بھی ایک پناہ تھی۔ میں نے جائے پناہ بدل ڈالی۔ پہلے میں اکیلا تھا، اب ہم دو ہیں"۔ اس بات کو سن کر راوی چونک پڑا۔ اس کے بعد راجندر نے راوی سے پوچھا "تم کنول کماری ٹھاکر کو جانتے ہو نا وہ اور میں"۔ راوی جو خود بھی کنول کا خاموش عاشق تھا۔ اس بات کو سُن کر مضطرب ہوگیا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اس سے کوئی بات نہ بن پڑی اس نے راجندر سے بے تکا سا سوال کر ڈالا "تو پھر کب تک تم کنول کو لا رہے ہو اس گھر میں"۔ راجندر اس سوال کو سن کر ہنسنے لگا۔ دراصل اس نے بھی کنول کو اسی بلندی پر بٹھا دیا تھا جس پر کہ دوسرے لوگوں نے اسے زبردستی لا بٹھایا تھا۔ دراصل دیس سیوا کے لیے وہ اور کنول متحد الخیال ہوگئے تھے۔ دونوں میدان میں اتر آئے تھے ہوسکتا ہے۔ کھلم کھلا جنسی محبت کی ہمت نہ پاکر دونوں نے رفاقت ہی کو اس محبت کا پردہ بنا لیا ہو۔ راجندر کے الفاظ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں "کنول اور میں مل کر کام کریں گے کنول اور میں ساتھ چلیں گے ...... اور یہی وہ سطح ہے جس پر کھڑا میں کنول کماری کے پہلو میں رہوں گا"۔ یقیناً کنول کے دل میں بھی کچھ اس قسم کے خیالات ہوں گے۔ ورنہ وہ اس مرد کے قریب کیوں آتی جس کے خط لکھنے پر اس نے کہا تھا۔ "راجندر پرشاد نے میرا اپمان کیا ہے"۔

محبت کرنا یا نہ کرنا بذات خود کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مگر جس پھیلاؤ کے سامنے کنول کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے اور اس کی فطرت کے ہر پہلو کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے قریب ایسے لوگوں کو بھی لایا ہے جن کو وہ پسند بھی کرتی ہے اور پھر اس کا کسی کی طرف مائل نہ ہونا کچھ خلاف فطرت سا لگتا ہے۔ دراصل اسے اس کتاب میں ایسے اوصاف سے متصف کیا گیا ہے کہ کسی کی محبت میں مبتلا کرنا اس کے تقدس کو ٹھیس پہنچانے کے برابر لگتا ہے۔ راوی اس کے متعلق کہتا ہے، "مردوں کے لیے اس نے وہ دیوانہ جذبہ کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کیا جس کو عشق کہتے ہیں یا اگر اس نے کبھی اپنے دل میں کسی کے لیے محبت محسوس کی ہے۔ کبھی وہ لگاؤ تو کیا اس نے اس محبت کو النسانیت اور اس عظیم چکر میں لگا دیا ہے جس کو وہ انسان پرستی کہتی تھی۔"

اس نے کرشنا کی محبت کا انجام دیکھا اس نے اپنی بھابی تیرا اور کئی دوسری عورتوں کا انجام دیکھا تھا۔ مگر محض اس بنا پر کوئی عورت جنسی محبت سے متنفر نہیں ہو سکتی۔ یہ نفرت تو اس وقت ہو سکتی ہے جب وہ کسی مرد سے دھوکا کھا چکی ہو۔ اس کے باوجود اگر کوئی مرد اس کے معیار پر پورا اترنے والا ہے تو وہ اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ جنس مخالف کی طرف مائل ہونا انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ دھوکا کھا کر یہ جذبہ ختم نہیں ہوتا۔ البتہ عورت زیادہ محتاط ہو جاتی ہے۔ کنول کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ بھی پیش نہیں آیا اس کے متعلق کہا گیا ہے "بہ یک وقت وہ مرد سے اور اس کی چالوں سے واقف تھی مگر اس سے متنفر نہ تھی اور اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ زندگی میں کسی مرد سے محبت نہ کر سکے گی۔" ایک اور جگہ کہا گیا ہے "وہ اس کی جنگ دنیا کی سب سے بڑی طاقت یعنی عورت اور مرد کی جذباتی محبت کے خلاف تھی۔ مگر وہ جذبات

سے عاری نہ تھی"، ان بیانات میں خود اندرونی تضاد پایا جاتا ہے۔

راوی نے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس نے اپنی محبت کو عقیدت میں بدل ڈالا مگر کنول کے دل میں شروع ہی سے اس کے لیے "گوشۂ نرم" پایا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ راوی جب اسے خطرے سے آگاہ کرنے جاتا ہے وہ بارش میں بھیگ جاتا ہے۔ کنول اسے اپنی بگھی میں اکیلے گھر پہنچانے جاتی ہے اور اسے سردی سے بچانے کے لیے اپنا کمبل دے دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات اس کی بے خوفی کو ظاہر کرنے کے لیے کہی گئی ہو مگر ساتھ ہی اس سے راوی کے لیے اس کے دل کے نرم گوشے کا بھی پتہ چلتا ہے۔

راوی بارش میں بھیگ کر بیمار پڑ گیا تھا چنانچہ وہ کمبل واپس کرنے کافی دن بعد گیا۔ اس کی بیماری کا حال سن کر کنول نے کہا۔ "مجھے آپ کو صحت مند دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے"۔ پہلی مرتبہ جب وہ گیا تھا تو کنول نے اسے چائے پیش کی۔ راوی کو کنول کی چائے میں ایک نرالی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چائے کی دوسری پیالی بھی آئی۔ چائے کی دوسری پیالی بھی ختم ہو گئی تو وہ اٹھی اور کیرم بورڈ اٹھا لائی اور بولی "آیئے کھیلتے ہیں"۔ وہ جان بوجھ کر راوی سے ہارتی رہی اس طرح ایک دم کیرم لا کر کھیلنا شروع کر دینا ایسی ذہین عورت کے لیے کس قدر عجیب اور بچکانہ سی حرکت لگتی ہے خصوصاً اس حالت میں جب کہ اس کی پہلی ہی ملاقات تھی۔

جس اخبار میں راوی ملازم تھا اس میں شوبھا بنرجی بھی ملازم تھی۔ اسے کنول کی شہرت سے سخت نفرت تھی۔ وہ اس شہرت کو خود سمیٹنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے اخبار میں کنول کے خلاف خوب زہر اگلا اس نے کنول کے بے سہارا عورتوں کے نادار گھر کو قحبہ خانہ کہا۔ راوی

کا کچھ بس نہ چلا تو اس نے اخبار سے استعفیٰ دے دیا۔ کنول اس پر کہتی ہے "میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ جذبات کی رو میں بہہ کر میری خاطر اپنا مستقبل برباد کر لیں۔ اگر آپ کو میری ذرا بھی پرواہ ہے تو ابھی جائیے اور سیٹھ سے اپنا استعفیٰ واپس لے لیجیے۔"

اپنے سسرال کے ظلم سہتے سہتے راوی کی بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی خبر سن کر کنول کہتی ہے "میں خود ہی حاضر ہو جاتی مگر زمانہ بہت برا ہے۔ اس سے نہ ڈرتے ہوئے بھی ڈرنا پڑتا ہے اور جب زمانے کی زبان کھل جائے جب دنیا الزامات گھڑنا شروع کر دے تو کوئی روک نہیں سکتا۔" آخر دنیا کی زبان کیوں کھلے گی اور دنیا الزامات گھڑنا کیوں شروع کر دے گی۔ خاص طور پر کنول کے دل میں اس احساس کا پیدا ہونا اور اس کا اظہار اس شخص سے کرنا جس سے کہ یہ الزامات متعلق ہو سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اپنے تعلق خاطر کا اظہار کرنا ہے۔ مگر یہ اظہار ایسا ہی ہے جیسے ندی کے دو کنارے پر بیٹھے ہوئے افراد کا اظہار جن میں سے تیرنا کوئی بھی نہ جانتا ہو اور ڈوبنے کا خطرہ مول لینے کو کوئی تیار نہ ہو۔

جب کنول کو ڈان وارٹن نے بتایا کہ وہ ایک بائی جی کے یہاں "آسمانی موسیقی" سننے گئے تھے تو اسے راوی کے بارے میں یہ جان کر بڑا افسوس ہوا اور اس سے کہا کہ مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ اس واقعہ سے بھی اس کے تعلق خاطر کا اظہار ہوتا ہے۔

کنول راوی سے اپنے دل کی تمام باتیں کہہ دیتی ہے۔ مشورے کی ضرورت پڑے تو مشورہ بھی اسی سے لیتی ہے پھر بھی دونوں میں فاصلہ برقرار رہتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ راوی مصنفہ کی محض ایک Device ہو اور کنول سے خیالات، نظریات اور واقعات کے اظہار کا ایک آسان

ذریعہ ہو۔

راوی اور راجندر کے علاوہ کنول میں دلچسپی لینے والے اور بھی ہیں انہی میں آگرہ کا ایک دولت مند اور مشہور النسان رادھے کرشنن بھی ہے وہ شہر کا متمول اور بدنام ترین آدمی تھا۔ اس لیے نہیں کہ لوگ رادھے کرشنن سے گریز کرتے اس کے سائے سے بھاگتے تھے۔ اس کے برعکس جیسا کہ قاعدہ ہے لوگ رادھے کرشنن کو جلسوں کی صدارت پیش کرتے اس سے چندہ لیتے، اس کی رائیں سنتے اور اس کے حضور ادب سے بات کرتے تھے۔ شہر کی کوئی تقریب بغیر اس کے نامکمل رہ جاتی تھی۔ وہ شہر کا بے تاج بادشاہ تھا مگر اس کے باوجود بدترین آدمی تھا۔ متمول ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر وجیہہ اور خوبصورت تھا۔ وہ ہندوستانی خوبصورتی کا نمونہ تھا۔ وہ اپنی سیاہ نیلش میں اڑتا پھرتا تھا اور عورتوں کے دلوں پر بجلیاں گراتا رہتا تھا۔ ایک دعوت میں کنول کی اس سے ملاقات ہوئی جس میں شہر کے سارے آکسونین جمع تھے بقول کنول۔ "رادھے کرشنن ایک ایسا بچہ لگا تھا جو ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار سے بگڑ گیا ہو۔"

ایک دن وہ کنول سے ملنے جا پہنچا۔ اس نے کنول سے کہا تھا "پھر آپ وعدہ کیجیے آپ کبھی میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائیں گی۔" کنول نے جواب دیا تھا "وہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ کیا آپ کے ہاں آئے بنا دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔" رخصت ہوتے ہوئے رادھے کرشنن نے کہا "آج تو میں نے آپ کو تکلیف بہت دی۔" کنول نے سنجیدگی سے جواب دیا "تو آئندہ کے لیے محتاط رہیے نا کبھی ایسی تکلیف نہ دیجیے۔" ایک آکسونین کا دوسرے آکسونین کو اس طرح جواب دینا اور پھر اس النسان کو جسے وہ صرف ایک لاڈ پیار میں بگڑا ہوا بچہ

سمجھتی تھی قطعی خلافِ قیاس ہے۔ مصنفہ نے یہ دیکھ کر کہ رادھے کرشنن پہلے آدمی کی ملاقات ہی سے کہیں اس دیوی کا تقدس میلا نہ ہو جائے اس سے یہ الفاظ ادا کروائے ان الفاظ کو سنکر تو انسان کو نفرت ہو جانی چاہیے۔ وہ دنیا کی واحد دیوی نہیں تھی کہ کرشنن جیسا مغرور آدمی جس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اصلاح پذیر ہو۔ مگر ہوتا یہی ہے کہ مغرور انسان راندۂ درگاہ ہو کر اس کا عقیدت مند بن جاتا ہے اور کہتا ہے "دنیا میں وہ اکیلی عورت ہے جس کو میں پاربتی کے سمان اونچا سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی اپنی آنکھیں اس کی طرف اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ میں جو عورت کو آنکھوں سے نگل جاتا ہوں..... میں نے دیس دیس گھوم کر جتنی عورتیں دیکھی ہیں۔ وہ ان سب سے بلند اور افضل ہے۔ اس کے پاس سچائی اور گہرائی ہے۔" یہی عقیدت مند جب کنول کے گھر گیا تھا تو اس کے ارادے کچھ اور تھے۔ جبھی تو کنول اس سے اس قدر بے رخی سے پیش آئی تھی۔

جب رادھے کرشنن اپنی اکلوتی بیٹی کو قتل کر دیتا ہے اور انتہائی پشیمانی اور پریشانی کی حالت میں خانہ نشیں ہو جاتا ہے تو کنول پرسے کے لیے اس کے گھر جانا چاہتی ہے۔ رادھے کرشنن کی بری شہرت کی بنا پر راوی کنول سے کہتا ہے "میں جانتا ہوں دھرم کی راہ یہی ہے۔ پر دنیا کی نگاہیں ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔" کنول کہتی ہے "لوگ کیا کہیں گے۔" کنول نے اپنے دونوں ہاتھ بڑی بے بسی سے جھٹک دیے "لوگ لوگ، کب تک لوگ ہی ہماری زندگیوں پر حکومت کریں گے۔ ہم ان بندھنوں سے آزاد نہیں ہو سکتے۔" اس وقت رادھے کرشنن کی مکمل اصلاح ہو چکی ہے۔ وہ ہر مجلس میں کنول کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتا ہے اس کے باوجود کرشنا کا بھی خیال یہی ہے کہ کنول اس کے گھر جانا ٹھیک

نہیں۔ آخر کار راوی کنول کی طرف سے رادھے کرشنن سے ملنے چلا جاتا ہے رادھے کرشنن اپنی تمام جائداد کنول کے نام کر دیتا ہے کہ اسے جس طرح چاہے خرچ کرے۔

راوی ایک دن کنول سے ملوانے ڈان وارٹن کو بھی لے گیا وہ کافی دیر تک کنول سے باتیں کرتا رہا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی اور بظاہر ہے کہ کنول ہی کا بھاری رہا۔ راوی کہتا ہے "میں نے اتنے سالوں میں پہلی بار کھل کر کنول کو ایک عام عورت کی طرح ہنسنے اور گفتگو میں حصہ لیتے دیکھا تھا۔ اسپین کے ذکر میں کوئی بات تھی۔ ڈان وارٹن اس کو مرعوب کر سکے گا اس کا مجھے کبھی خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ وہ ایک کہانی سننے والے بچے کی طرح سوال پوچھتی اور جواب سن کر حیران ہو رہی تھی"۔

دو اشخاص اگر کافی دیر تک باتیں کرتے رہیں تو ان کی آنکھیں چار ہونا بھی لازمی بات ہے مگر راوی کی عقیدت مندی کا یہ عالم ہے "مجھے معلوم تھا وہ کنول کی طرف دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکے گا۔ کسی نے نگاہیں ملا کر اس کی طرف آنکھیں اٹھا کر کبھی بات نہ کی تھی۔ کوئی کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا تھا"۔ گفتگو میں ان دونوں کے تاثرات کیسے رہے ہوں گے اس کا اندازہ ان سطور سے لگایا جا سکتا ہے "میں نے اس کے گھر کا طواف ایک عمر کیا تھا مگر میں تو پھر بھی حاشیہ نشیں ہی رہا۔ مرد کی فطرت کے مطابق میں جل رہا تھا۔ میں ایک حاسد کی طرح ڈان وارٹن کو مار دینا چاہتا تھا مجھے اس کا وجود اپنے اور کنول کے درمیان ایک دیوار بن کر حائل لگتا تھا۔ میں کنول کے نزدیک کبھی نہیں ہوا"۔ کتاب کے آخر میں بھی ڈان وارٹن راوی سے کہتا ہے "یہ عورت جس کا تم ذکر کرتے رہتے ہو جس کو تم اتنا اونچا سمجھتے ہو مجھے اس سے محبت ہے"۔

کنول کے ایک دلچسپ عاشق ڈاکٹر بھٹاچاریہ بھی ہیں۔ انھیں شاید

مزاح کے تقاضے پورے کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ وہ شہر کے بڑے آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی طبیعت میں سادگی تھی ۔ جیسی بچوں میں ہوتی ہے اور شاید ان کی یہی سادگی کنول کو بھا گئی تھی۔ کیونکہ ایک زمانہ آیا کہ وہ اس کے سب سے بڑے والوں میں سے ہو گئے۔ وہ اس کے سب سے بڑے مدّاح بن گئے تھے۔ پھر وہ کنول سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ اسی سادگی کے طفیل وہ کنول سے کافی بے تکلف ہو گئے تھے۔ انھوں نے ایک دن کنول کو مشورہ دیا کہ وہ شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ کنول نے کہا "بات تو ٹھیک ہے پر سوال یہ ہے کہ کونسا مرد میری شرن پئے گا۔ اور ڈاکٹر بھٹاچاریہ نے۔ جو کنول کے خیالوں کے مطابق اس کے بڑے بھیا اور باوا کے برابر ہوں گے ...... سولھویں صدی کے انگریز جان بازوں کی طرح جھک کر ایک گھٹنا ٹیک، کر اور ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا تھا۔ میں حاضر ہوں۔ کنول پر بجلی گر گئی۔ وہ وہاں سے ہل نہ سکی وہ ہنس نہ سکی۔

اس عشق کا ذکر یا تو ایک مضحک منظر پیش کرنے کی خاطر کیا گیا ہے یا یہ دکھانے کے لیے کہ کنول کے عشق میں اس شہر کے بوڑھے تک مبتلا تھے۔

عورت کی ایک خصوصیت خود پسندی ہے۔ کنول نہ تو اپنی تعریف پسند کرتی تھی اور نہ کبھی اپنے کاموں اور کارناموں کا ذکر کرتی تھی "مردوں کے جمگھٹے اپنے گرد دیکھنے سے چاہنے والوں سے عورت کی جس خود پسندی کی تسکین ہوتی ہے۔ وہ کنول میں نہیں تھی ..... مہینوں اس کے منہ سے "میں" کا لفظ نہیں سنا گیا۔"

اسے بناؤ سنگھار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے غازہ اور لپ اسٹک نہیں لگایا اس لیے کہ ان چیزوں سے دلچسپی اس عورت کو

ہوتی ہے جسے چاہے جانے کی تمنا ہو اور کنول تو محبت کے لیے بنی ہی نہیں شاید اس لیے اس میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ عفو اور درگزر کا پتلا تھی۔ شوبھا نے اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ اس کی شہرت کو بے انتہا نقصان پہنچایا۔ اخبار کی سہولت سے فائدہ اٹھا کر اس نے کنول کے خلاف جی بھر کے لکھا۔ کنول نے بے سہارا اور راہ گم کردہ عورتوں کے لیے ایک نادار گھر بنایا تھا۔ نیرا بھی اسی نادار گھر میں آئی تھی جو آخر تک اس کے ساتھ رہی۔ کنول ان بے سہارا عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتی۔ زندگی کی نیکیوں اچھائیوں اور آدرشوں کا گر بتاتی۔ شوبھا نے کنول کے اس نادار گھر کو قحبہ خانہ کہا۔ اسے مجبور ہو کر یہ نادار گھر بند کرنا پڑا۔ شوبھا کی اس قدر زیادتیوں کے باوجود اس نے گھر پر کبھی شوبھا کا نام بھی نہیں لیا۔

مثالی انسان کے سونے اور جاگنے کے انداز بھی مثالی ہوتے نیرا کہتی ہے:۔

"جب بھی کوئی ملنے آیا ہے۔ اسے مستعد اور جاگتے ہوئے پایا ہے۔ نہ جانے وہ سوتی کب تھی۔۔۔۔ میں نے کبھی کنول کو جاگتے اور نیند کے لیے بیتاب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ایک بچے کی معصومیت سے آنکھیں بند کرتی اور سو جاتی۔"

موسیقی کے ذکر کے بغیر بھلا عورت مکمل کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس فن میں بھی کنول لاجواب ہے۔ اس کی موسیقی کا تعلق دوسرے دنیا داروں کے برخلاف دیولوک سے ہے۔ بقول نیرا "کنول کے گیتوں میں ایک ایسا سوز تھا جو دکھ لاتا ہے۔ جو اسے جگاتا ہے اور جو بھگوان کے چرنوں میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ کر سنا جا سکتا ہے۔"

کنول کی مذہبیت بھی عام انسانوں سے مختلف تھی۔ اسے کتابوں سے سکون نہ ملتا تو وہ بھگوان سے کہتی "اے بھگوان روشنی کہیں نہیں

ہے کہاں جاؤں ؟" وہ رات رات بھر بھگوان کے چرن دھوتی اور اس کی برکت سے دن بھر بے خوف و خطر اپنی راہوں پر چلتی رہتی۔ اس کا عقیدہ یہ تھا "یہ جسم کس کام کا اگر اس کو پرماتما اور اس کی پیدا کردہ انسانیت کو بچانے کے لیے نہ لگایا جائے۔

وہ تو اپنے کو ٹوٹا ہوا پھول اور بھگوان کے چرنوں کی دھول سمجھ کر اس کے چرنوں میں اپنے آپ کو گرانے سے ہی بڑی ہوئی تھی۔ بھگوان کی دیا اور اس کی نظر نے اس بھکارن کو وہ دان دیا کہ اس کا کشکول سورج بن گیا ؟" نیرا نے" اسے بھگوان کی مورتی کے سامنے بلکتے اور روتے دیکھا ہے۔ ایسے کہ اس کا سارا دھیرا آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ گیا ہے وہ بھگوان کی مورتی کے سامنے یوں تڑپی ہے کہ میرا بھی کیا روئی ہوگی۔ اس نے اپنے مان کے لیے کسی در کے سامنے جھکنا قبول نہیں کیا۔ پر اس کا ماتھا اس مورتی کے چرنوں میں رات رات بھر پڑا رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ پرارتھنا کی ہے " پربھو تمہاری شرن کے علاوہ مجھے اور کسی طرح کی امید نہیں تو نے اگر مجھے طاقت دی ہے تو سہارا بھی دے۔ تو ہی میرا رکھوالا اور تو ہی میرا ساتھی ہے۔ ساری دنیا اگر مجھ سے بگڑ جائے تو بھی مجھے تیری مدد اس راہ پر ڈگمگا نہ سکے گی۔ سارے کام بگڑ جانے پر تو نہ بگڑے۔ میرے پریتم نگر کی آبادی تو ہی ہے پربھو تو اپنے مندر سے میری ناقص عقل اور ٹوٹے دل کو چمک اور بھروسہ عطا کر؟" نیرا نے راوی کو بتایا کہ " اس نے کبھی کسی سادھو سنت کے چہرے پر اتنا پیار نرمی اور روشنی نہیں دیکھی اور پھر بھی ان کے اجالے میں کسی نے اسے مذہب کے متعلق باتیں کرتے نہیں سنا ؟"

کنول کی پراتھنا میں خشوع و خضوع کا جو رنگ بیان کیا گیا ہے اس میں ہندو مت کے بجائے اسلامی عبادت کا انداز زیادہ جھلکتا

ہے۔

شاید بھگوان کو خوش کرنے کے لیے ہی کنول نے بے سہارا عورتوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے دور کی عورتیں ہندوستان کی عظیم عورتوں کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ہندوستانی عورت کے لیے صحیح لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے ہی اس نے مغرب کا سفر اختیار کیا۔ وہاں کی عورت اور اس کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ اس نے ہندوستان کی مقید اور بے سہارا عورتوں کو بھی دیکھا اور یورپ کی آزاد عورت کو بھی۔ اس کے لیے مثالی عورت راجپوتانے کی بہادر رانیاں چاند بی بی اور نور جہاں تھیں۔ ایک تقریر میں کہتی ہے "آپ کیوں ہر عورت کے سینے میں اس کی نیکی اور بلندی کو سلا کر وہاں ایک دبی دبی سہمی سہمی مظلوم اور بے کس ہستی پیدا کر رہے ہیں جو بولے تو آپ کی زبان سے دیکھے تو آپ کی آنکھوں سے چلے تو آپ کے کندھے پر بوجھ ڈال کر اس گونگی بہری اور اندھی مخلوق کے بجائے تندرست اور روشن دماغ و دل کی حامل ساتھی کیوں پیدا نہیں کرتے۔"

وہ اعلیٰ درجے کی مقرر بھی تھی۔ کتاب میں اس کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جو اس نے اس وقت کی تھی جب کرشنن کی جائداد کے کئی دعوے دار کھڑے ہو گئے تھے۔ ذرا راوی کے الفاظ میں اس تقریر اور مقرر کا حال ملاحظہ کیجیے۔ "میں آپ سے سچ کہتا ہوں اس دن اسٹیج پر کھڑی کنول کے چہرے پر جو نور تھا وہ صرف ایک سچی۔ پاک باز اور بلند عورت کے چہرے پر ہی ہو سکتا ہے...... اس کے چہرے سے زیادہ خوبصورت کسی کا چہرہ نہیں دیکھا۔"

آدھی کتاب کے کچھ بعد سے سیاست کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ مختلف جماعتیں اپنے اپنے طور پر آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس سے

ساتھ ساتھ مذہبی تنگ نظری بھی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی ہے۔ فسادات ہونے لگتے ہیں۔ لوگ ہندو اور مسلمان بن کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔

کنول کے شہر آگرہ میں بھی سیاسی صورت حال اسی قسم کی تھی۔ کنول سے تو کوئی غلطی سرزد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ہر بات میں سب سے افضل تھی۔ چنانچہ سیاست میں بھی وہ بلند ترین مقام پر نظر آتی ہے۔ وہ تقسیم کے سخت خلاف تھی۔ اس کی نظر میں ہندو مسلمان برابر تھے۔ ہمیشہ اس کی زبان پر یہی نعرہ رہا "انسانیت کو بچاؤ"۔ اس قسم کے بلند نظریات رکھنے والے لوگوں کو تنگ نظر فرقہ پرستوں نے قتل کی دھمکیاں دیں۔ کنول کے کالج اور اس کے ہوسٹل پر تنگ نظر ہندوؤں نے حملہ کیا انھوں نے مطالبہ کیا کہ مسلمان لڑکیاں ان کے حوالے کر دی جائیں کنول نے آخری وقت ان کی حفاظت کی۔ اسی مقابلہ میں وہ بری طرح زخمی ہو گئی اس کی بینائی جاتی رہی مرتے وقت تک اس کی زبان پر یہی رہا "انسانیت کو بچاؤ"۔ ہوسٹل کی مسلمان لڑکیوں کو بچانے کی فکر آخری وقت تک اس کے ساتھ رہی۔ راجندر اور راوی بھی اس معاملہ میں کنول کے ہم خیال تھے آخر کار راجندر بھی لڑتا ہوا مارا جاتا ہے۔ راوی اپنی بیٹی بلیا کے ساتھ گھر سے نکل بھاگتا ہے وہ بھی بہت سی عورتوں کی جان بچاتا ہے۔ ہیرا بائی بھی مسلمان لڑکیوں کی حفاظت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ڈان وارٹن بھی بلیس لڑکیوں کی جان بچاتا ہے۔

فسادات کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ اس زمانہ کی لکھی ہوئی تقریباً ہر ناول میں نظر آتی ہے اس لیے اسے حقیقی تصور کیے جانے کے باوجود خوف طوالت سے حذف کیا جاتا ہے۔

سیاست کے تذکرہ سے کچھ ہی پہلے ڈان وارٹن کا تعارف کر دایا

جاتا ہے۔ وہ راوی کا دوست بن جاتا ہے۔ راوی کنول سے بھی اسے متعارف کروا دیتا ہے۔ اس طرح سیاست کی بحثوں میں وہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں آگرہ میں تصویروں کی ایک نمائش ہوئی تھی۔ اس نمائش میں ایسی تصویریں بھی تھیں جو ہندو مسلم منافرت کو ہوا دیتی تھیں۔ راوی صرف افسوس کر کے رہ جاتا ہے کہ ایسی تصویروں کی نمائش میں رکھنے کی اجازت ہی کیوں دی مگر سب سے پہلے وارٹن ہی راوی کو بتاتا ہے کہ یہ تصویریں ہندوستانیوں کی نہیں بلکہ غیر ملکیوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی تھیں۔ وہ راوی سے کہتا ہے "تم اتنی بے بسی سے یہ سب کچھ کیسے ہونے دیتے ہو۔ تم لوگ بے انصافی کے خلاف آواز کیوں نہیں بلند کرتے۔"

راوی بھی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر غیر ملکیوں نے اپنا داؤ چلا لیا ہے وہ پھر براہ راست انگریزوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے "حکومت امن کروانے کی کوشش میں در پردہ اپنے تنخواہ دار ملازموں کے ذریعے واقعات کو ہوا دے رہی تھی اور ہم سب سوچ رہے تھے شاید امن ہو جائے شاید ہم لوگ مرنے سے بچ جائیں۔ باپ کے مرنے پر جس طرح جائداد کے حصے بخرے کیے جاتے ہیں کچھ وہی حالت ہماری تھی۔ ہمارے دماغ معطل ہو چلے تھے۔ سوچ اور مصیبت کے احساس نے ہمارے ذہنوں کو کند کر دیا تھا۔"

تقسیم کی طرف اشارہ بھی ڈان وارٹن ہی کرتا ہے۔ اس کتاب میں کئی جگہ پتے کی باتیں ڈان وارٹن ہی سے کہلوائی ہیں۔ کہیں یہ ذہنی غلامی کی علامت تو نہیں ہے۔ قصہ میں ڈون وارٹن کا پیوند عجیب سا لگتا ہے اس کا کردار بہت ہی عجیب و غریب طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ صفحہ ۲۲۳

پر جہاں اسے متعارف کروایا گیا ہے اسے انگریز کہا گیا ہے۔ ملاقات ہوتے ہی وہ راوی اور من موہن کو ایک گانا بھی سناتا ہے اور تعجب ہے کہ راوی کو اس نغمے میں وہ درد محسوس ہوتا ہے جو بلبل کے نغمے میں ہوتا ہے حالانکہ موسیقی کے بارے میں انسان بہت تنگ نظر ہوتا ہے۔ یہ اس کی انتہائی نجی چیز ہوتی ہے۔ انسان ہر غیر ملکی چیز کو پسند کر سکتا ہے مگر غیر ملکی موسیقی کا مذاق بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ برسوں انگریزوں میں رہنے کے باوجود انگریزی موسیقی پر سر نہیں ہلا پاتا۔

ڈون وارٹن کچھ عرصے تک انگریز رہتا ہے پھر شاید مصنفہ نے یہ سوچا ہو کہ اسے مشرقیت کے کچھ قریب لایا جائے چنانچہ بعد میں اسے ہسپانوی بنا دیا جاتا ہے۔ اسپین سے عربوں کا تعلق ضرور رہا ہے۔ مشرقیت بھی وہاں کے معاشرے میں ضرور آئی ہو گی مگر اسے رخصت ہوئے بھی صدیاں گزر چکیں اسپین اور جنوبی اٹلی یورپ کے غریب علاقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کے بال بھی بھورے اور بعض کے سیاہ ہوتے ہیں۔ یہی حال ان کی آنکھوں کا ہے۔ ان کا رہن سہن یورپ کے دولت مند علاقوں سے کچھ مختلف ہے۔ محض اس لیے اس میں مشرقیت تلاش کرنا احمقانہ کوشش ہے۔ پھر اس برائے نام مشرقیت اور ہماری مشرقیت میں مزید قرب تلاش کرنا مزید حماقت ہے۔ خود عربوں ہی کو لے لیجیے۔ ان کی اور ہماری زندگی میں سوائے مذہب کے اور کسی بات میں قرب نہیں ہے بلکہ مذہب میں بھی ہمارا ان کا اسلام کم از کم ظاہری شکل میں خاصا مختلف ہے۔

مصنفہ نے وارٹن کو اس قدر مشرقی بنا دیا ہے کہ جب وہ ایک انگریز سے ملنے کے لیے جاتا ہے تو اسے اس کی بیوی کی ”ضرورت سے زیادہ اونچی سکرٹ اور کسا ہوا لباس“ دیکھ کر وحشت ہوتی ہے

وہ ہندوستانی عورت کے بارے میں کہتا ہے "تمہارے ہاں کی معمولی عورت ایک کہار کی بیوی میں بھی وہ نزاکت اور شرم ہے کہ یہ لوگ صدیوں تک اس کو نہیں پہنچ سکتے" اور پھر بھی اپنے آپ کو ترقی یافتہ اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔"

وارٹن کے کمرے میں تمام چیزیں بڑی بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ وہ اسے مشرقیت کہتا ہے اور اپنی مشرقیت پر فخر کرتا ہے "یہ میرا مشرقی پہلو ہے یہ میرا ماضی ہے۔ ہم میں یہ بے ترتیبی۔ یہ پھیلاؤ سے محبت مشرق سے آئی ہے۔" اس مشرقیت کے بعد بھلا یہاں کی موسیقی میں دلچسپی لینا کیا مشکل تھا۔ وہ خود بھی کہتا ہے کہ اسے ہندوستان کی موسیقی سے پیار ہے۔ من موہن کی رفاقت میں جب وہ ایک پراسرار سی بائی جی کے یہاں جاتے ہیں تو وہ کلاسیکی راگ گاتی ہے۔ اس راگ کو سن کر راوی اور من موہن کے ساتھ وارٹن بھی مدہوش ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہاں بھی بہت کم لوگ اس موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا شعور رکھتے ہیں بیشتر لوگ اس قسم کی موسیقی سے گھبراتے ہیں ایک یورپی آدمی کا اس سے لطف اندوز ہونا بلکہ مدہوش ہو جانا عجوبہ سے کم نہیں۔

وارٹن کی مشرقیت کا ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجیے "وہ الحمرا کی باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غرناطہ کی زمینوں باغوں اور ویرانیوں کا ذکر کرتے کرتے اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جذبات کی گرمی اور بے پناہ شدت سے پگھل رہا تھا۔ میں اور کنول بے خود سن رہے تھے۔ وہ دم لینے کے لیے رکا اور پھر کہنے لگا۔ "وہاں کی ہر شئے مشرق کی امانت دار اور عطا کردہ ہے۔ ہم لوگوں کو ہندوستان سے اس لیے تعلق ہے کہ ہم بھی مشرق کے پسماندگان ہیں" ان کھنڈروں سے صرف مسلمانوں کو دلچسپی ہوتی ہے اور وہ بھی شاید ایشیا،

کے مسلمانوں کو، ہسپانونیوں میں سے صرف ان گائڈز کو دلچسپی ہوتی ہے جو ان کا حال کچھ نمک مرچ لگا کر مسلمان سیاحوں کو سناتے ہیں اور معاوضہ وصول کرتے ہیں۔

دراصل ڈون وارٹن کا کردار بالکل غیر حقیقی ہے۔ راوی اس غریب کو زبردستی گھسیٹے پھرتا ہے۔ بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اپنی بات اس غیر ملکی کی زبان سے کہلوائی ہے۔

وارٹن کا ذکر یہاں ضمنی طور پر آ گیا تھا۔ دراصل اس کا کردار ایک طویل جملہ معترضہ ہے گفتگو دراصل کنول کے بارے میں ہو رہی تھی کنول کے بارے میں یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے مثل استاد تھی مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس مضمون کی استاد تھی صفحہ ٦٥ پر لکھا ہے "ایک بار پرانی تاریخ پڑھاتے ہوئے شدت جذبات سے کنول ٹھا کر کلاس میں رونے لگی" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کی پروفیسر ہو گی مگر اس کے دو صفحے بعد ہی ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ادب کی استاد تھی "کالیداس اور مہابھارت، بھگوت گیتا اور بڑے بڑے انگریزی شاعروں کے اشعار اور ان کے فن کے شاہکار اس کے لیے ایک ہی اہمیت رکھتے تھے۔ میں نے شیکسپئر کی ماہیت کو روح کو سمجھنے والا کنول کماری سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا" ادب پڑھانے کا اس سے بھی واضح اشارہ اگلے صفحہ پر دیا گیا ہے "اس نے پڑھاتے ہوئے لڑکیوں سے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ اپنے آپ کو بڑے لوگوں، عظیم مصنفوں اور گزرے ہوئے نامور لکھنے والوں کی صحبت کے قابل بناؤ۔"

مصنفہ کو ضرورت پیش نہ آئی ورنہ وہ اسے مضامین کی استاد بھی کہہ دیتیں۔ ایسی لائق پروفیسر تو کالج میں اکیلی ہی کافی ہے۔ آپ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ استاد انگریزی کی تھی یا کسی اور زبان کی، ممکن

ہے کہ وہ ایک ہی گھنٹے میں تمام ادبیات پر ایک جنرل لیکچر دے دیتی ہو۔

بات گھوم پھر کر وہیں آ جاتی ہے کہ کنول عورت نہیں ہے بلکہ تمام نسائی اوصاف کے منتہائے کمال کا ایک مثالی مجسمہ ذرا غور کیجیے کہ کیا یہ الفاظ کسی عورت کے بارے میں کہے جا سکتے ہیں "وہ عورت نہیں کوئی روپ وتی تھی۔ کوئی دیوی تھی۔ .... وہ نئی عورت بلکہ ماضی کے اندھیرے سے آئی ہوئی ایک روح تھی۔ وہ اجنتا کے غاروں سے نکلی ہوئی ایک مورتی تھی۔ وہ بہت پہلے کی اور بہت پرانی تھی" آگے چل کر کہا جاتا ہے "وہ تو چمک ہے بادلوں کی۔ بجلی کی گرمی۔ چاند کی زردی اور ٹھنڈک۔ جھرنے کی نرملتا۔ طوفان کی چنچلتا اور خوشبو کی مدھرتا"

جو ایسے اوصاف کی حامل ہو اس کے لیے بینا کی اس رائے سے کیسے اختلاف ہو سکتا ہے "بابا آپ کی دوست کیا لوہے کی بنی ہے .... آپ کی دوست پر سے تھکن اور اونگھ سب یونہی نکل جاتے ہیں"

بھلا اس قسم کی مشین سے غلطی کس طرح سرزد ہو سکتی ہے "کبھی اس کے اقدام غلط نہیں ہوئے کبھی اس کی تدبیریں ادھی اور کچی نہیں ہوئیں۔ یہ پختگی تو اس کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ یہ پختگی کنول ٹھاکر تھی"

اس ناول ایک بہت بڑی کمزوری راوی کا کردار ہے جس کے توسط سے یہ کہانی پیش کی گئی ہے اس کے لیے صیغۂ تذکیر استعمال کیا گیا ہے مگر اس میں مردوالی بات صرف یہ نظر آتی ہے کہ ایک عورت کا شوہر ہے اور ایک لڑکی بینا کا باپ ہے۔ اس کے علاوہ اس کے طور سے کہیں مردانگی کا اظہار نہیں ہوتا غالباً اس ناول میں بات الٹی ہو گئی جو مرد کا کردار ہو سکتا تھا اس کے لیے مصنف نے نسائی نام تجویز کر دیا اور جسے عورت ہونا چاہیے تھا اسے مرد کا روپ دے دیا۔

یہ ہر عورت کو ایسا بے ضرر نظر آتا ہے کہ وہ اس سے دل کے راز کہہ دیتی ہے اور سر جوڑ کر مشورے کرتی ہے۔ چاہے کنول ہو چاہے شوبھا چاہے بائی جی اور چاہے نیرا اور کرشنا یہ سب کے بھیا ہیں۔ اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ مرد کے مقابلے میں خواجہ سرا زیادہ نظر آتا ہے۔

دو مرتبہ اس میں مردانگی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے ایک مرتبہ اس وقت جب وہ کنول کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے سخت بارش میں بھیگتا ہوا اس کے یہاں پہنچتا ہے مگر اس کا بھی انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ بیمار پڑ جاتا ہے اس طرح اس کی مردانگی کی یہ کوشش بھی ناکام ہو جاتی ہے۔ دوسری مرتبہ جب شوبھا اس کے اخبار کے ذریعے کنول پر کیچڑ اچھالتی ہے اور وہ اسے روکنے میں ناکام رہتا ہے تو اخبار سے استعفیٰ دے دیتا ہے اس کے بعد وہ کنول کا بیان چھاپنا چاہتا ہے مگر کنول اس سے کہتی ہے "افسوس ہے آپ میں دھیرج نہیں ہے" اور وہ غریب جس میں پہلے ہی کافی دھیرج ہے مزید دھیرج اختیار کر لیتا ہے۔

اسے شبہہ تھا کہ وارٹن بھی کنول سے محبت کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اس کے کنول کا ذکر کرنے پر اس نے ہمت کر کے وارٹن کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ممکن ہے یہ ہمت بھی اس لیے کی ہو کہ اس سے پہلے من موہن بھی وارٹن کے ایک زوردار تھپڑ رسید کر چکا تھا۔ اور اس نے خاموشی سے اسے برداشت کر لیا۔ شاید وارٹن کو ایک بزدل آدمی کا اسے تھپڑ مارنا اتنا عجیب لگا ہو کہ وہ ہنس دیا وہ اتنے زور سے ہنسا کہ راوی ڈر گیا یہ تھی راوی کی بہادری۔

اس نے کئی جگہ کہا ہے کہ اسے کنول سے شدید محبت تھی چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے میری ساری ہستی کو جذب کر لیا تھا میں اپنے گرد و پیش کو بھول کر اس بے تابی کا تجربہ کر رہا جو نس نس میں درد

کی اینٹھن بن کر رہتا ہے۔ رگ رگ میں زہر بن کر سرایت کرتا ہے۔ جسے لوگ محبت کہتے ہیں لگاؤ کہتے ہیں۔"

پندرہ سال بعد جب وہ اس سے ملتا ہے تو اس کے احساسات یہ ہوتے ہیں "پندرہ سال پہلے میں جس عورت کے قدموں پر محبت کی بھیک مانگنے کے لیے جھکا تھا آج بھی اس کے قدموں پر جھک سکتا ہوں۔"

ایک اور جگہ کنول کے ساتھ کام کرنے کا ذکر کرتے ہوئے "میرے دل میں کام کرنے کے جذبے کے ساتھ کہیں ڈھکی چھپی ایک تمنا چپکے چپکے بڑھ رہی تھی اور وہ تھی کنول کے قریب اس کے خیالات سے یک جہتی کی تھی اس کی نگاہوں میں بلند ہونے کی تھی۔" اپنی بیٹی سے کنول کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے سوچتا ہے "جس دیوانگی سے کنول کو چاہا تھا وہ دیوانگی میرا ساتھ چھوڑنے والی نہیں۔"

شاید صرف ایک مرتبہ اس کی نگاہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو گا اس نے ایک مرتبہ جھک کر کنول کے قدم چھونے چاہے تھے۔ اس کے قدم سمیٹ لینے پر کہا تھا "آپ مانئے یا نہ مانئے میں نے جو دل آپ کی بھینٹ چڑھایا ہے وہ پاکیزہ سچا اور معصوم ہے۔" کنول نے کہا تھا۔ "پاکیزہ ہے سچا ہے معصوم ہے مگر ایماندار نہیں ہے۔" اس کے بعد وہ کہیں بھی جرأت کا اظہار نہیں کرتا اور بزعم خود محبت کا یہ عالم ہے کہ اسے کنول کے پھول تک سے محبت ہے۔ محبت میں ناکام ہو کر وہ اپنی بیٹی بینا کو کنول کا نمونہ بنانا چاہتا ہے۔

راجندر کی باتوں سے جب اسے شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ اور کنول ایک رشتے میں منسلک ہو رہے ہیں تو اس میں جذبۂ حسد بھی پیدا ہوتا ہے گویا اسے بھٹی میں گرا دیا ہو "زندگی میں جس عورت کو میں نے چاہا

اس کو کوئی اور لے جائے .... میں نے ایک عمر اس کا انتظار کیا۔ میں نے ایک عمر اس کے در پر اپنا ماتھا گھسا اور آخر میں وہ اپنا آپ کسی اور کو دے رہی تھی۔"

راوی نے کئی جگہ کہا کہ وہ بزدل تھا۔ کنول ایک تحریک شروع کرنا چاہتی ہے۔ راوی بھی ساتھ دینے کے لیے تیار ہے مگر کہتا ہے۔ میں تیار ہوں مگر کام کیا ہو گا۔ کہہ نہیں سکتا اپنے کمزور اور مایوس دل کے ساتھ طاقت کہاں سے لاؤں گا" اس پر کنول کو کہنا پڑا۔" آپ طاقت مجھ سے لے لیجیے۔"

ایک مرتبہ راوی کو وارڈن پر ایسا غصہ آیا کہ وہ بھی من موہن کی طرح اس کے منہ پر زناٹے سے ایک تھپڑ مارے۔ مگر پھر سوچتا ہے "مگر میں ایک بزدل آدمی تھا۔ میرے دل میں کمزور اور موقوف تمنائیں ابھی کہیں کہیں سانس لے رہی تھیں" ایک اور جگہ صفحہ ۱۹۱ پر وہ پھر کہتا ہے۔ "میں بتا چکا ہوں کہ میں بزدل ہوں۔"

جب وہ بینا کو کالج میں داخل کرانے گیا اور کنول سے ملا اس وقت کے تاثرات دیکھیے۔ "دل یوں ہی دھڑک رہا تھا۔ پگلا دل ہے نا کبھی کبھی تو یونہی دھڑکتا ہے" صرف یہ آخری جملہ ہی اس کی فطرت نسائیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔

ڈون وارڈن اس کے لیے ٹھیک کہتا ہے "تم عشق میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے آپ کو اپنے ارد گرد امن اور سلامتی کو چاہتے ہو۔ تم عقلمند ہو عشق کے لیے تھوڑا سا دیوانہ ہونا ضروری ہے۔ عشق میں پریشانیاں ہیں تم اس آگ کی محراب کے نیچے سے گزر کر ہیکل میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تم میں جذب صادق نہیں ہے۔"

اس کے بعد اس کا یہ انجام قرین قیاس ہے "میں سالوں کے

بعد اپنا وہ یہی سوال ہے کہ کنول کے دروازے پر جاتا رہا ہوں اور کنول نے کبھی میرے کشکول کو وعدوں سے نہیں بھرا۔" اس کی پست ہمتی کی بنا پر وہ کبھی کنول کے یہاں بن بلائے نہیں گیا۔

کنول کو شاید راوی کی طرف کچھ میلان بھی ہوگا مگر شوبھا تو اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ خود سوچتا ہے کہ اگر اس نے کنول کو نہ دیکھا ہوتا تو اپنا دل شوبھا پر نچھاور کر دیتا۔ اس کے بقول وہ خطرناک طور پر حسین تھی اسے حسن کا احساس تھا جسم کے دل آویز خطوط میں ایک جاذبیت تھی اس لیے وہ ہندوستان کی بہت سی تحریکوں کی رہنما تھی۔ رہنمائی کے لیے حسین ہونا اور دولت مند ہونا ضروری ہے۔

شوبھا بھانپ جاتی ہے کہ راوی کنول سے متاثر ہے۔ اسے خط میں لکھتی ہے "مجھے تو تمہارے لفظوں کے پیچھے کنول ٹھاکر کی تقریر نظر آتی ہے۔" چنانچہ وہ محبت اور ہوس کی تسکین کے لیے من موہن کا سہارا لیتی ہے اور راوی سے برادرانہ تعلقات استوار کر لیتی ہے۔

بائی جی بھی ایک عجیب وغریب اور پر اسرار ہستی نظر آتی ہے۔ وہ بھی اس قصہ میں ایک ایسا پیوند ہے جس کا کوئی خاص مصرف نظر نہیں آتا شاید مصنف نے اس کا کردار یہ دکھانے کے لیے پیش کیا ہو کہ جس ملک کی بائی جی اس قدر بلند ہو۔ وہاں کی ستونتیاں کیسی ہوں گی۔

بائی جی کے یہاں وارٹن اور راوی کو من موہن لے کر جاتا ہے۔ بائی جی کا تعارف صفحہ ۳۳۶ پر کروایا گیا ہے۔ جس کمرے میں انھیں انتظار کرنے کے لیے بٹھایا گیا تھا وہ "کمرہ اتنا چھوٹا اور مکمل تھا۔ جیسے کوئی تصویر ہو۔ دیوار پر پرانے فرانسیسی شاہکار لگے تھے۔ بقول وارٹن یہ تصویریں بڑی نایاب تھیں۔ یہ ایسے شاہکار تھیں جنکی تلاش میں وہ دیس دیس گھوما تھا۔ بقول وارٹن ان تصویروں کی قیمت لاکھوں روپے ہے۔

اس کمرے میں جو قالین بچھے تھے ان کی "چمک ہیروں کی سی تھی"۔ "جو عورت کمرے میں داخل ہوئی ذرا اس کا حال سنیے :" پھر ایک پردہ اٹھا اور کوئی عورت اندر آگئی - یہ ایک صاعقہ تھا۔ ایک بجلی تھی، سویا سویا سا حسن اتنی نوخیز اور الھڑ۔ رنگ میں ایک یاقوتی چمک جیسے فیروزے کی ہوتی ہے شمع کی روشنی میں مدقوق سی نزاکت ۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی نہیں مگر جب نیچے سے اوپر نگاہ ہوئی تو جیسے مندر کا دروازہ کھل گیا ہو۔ مسکراہٹ میں شوخی نہیں شرارت نہیں ، بیباکی نہیں اور نہ بناوٹ کی شرم ۔ نہ لبھانے کی کوشش "

من موہن اس سے کہتا ہے "میں آج شام ہی یہاں آیا تھا۔ گزر رہا تھا کہ یہ دوست مل گئے سوچا آپ کے درشن بھی ہوتے جائیں" سر پر ڈھکے پلو کو درست کرتے ہوئے بائی جی نے کہا "بڑی کرپا کی آپ نے ناک میں ہیرے کی کیل ایک ننھے سورج کی طرح دمک رہی تھی - وہ ایک ایسا سحر تھا جس کو محسوس کر لو اور وہ تمہیں نگل جائے"

من موہن جو شوبھا کے سامنے اتنی آزادی سے بات کرتا تھا یہاں بے حد ادب سے سنبھل سنبھل کے بول رہا تھا۔ کوئی لفظ غلط نہ ہو۔ زیادہ نہ ہو اور فالتو نہ ہو...... من موہن آہستہ آہستہ سنبھل کر ادب سے بول رہا تھا" حالانکہ شوبھا بھی خاصی اہم عورت تھی - وہ تعلیم یافتہ حسین اور ہندوستان کی بہت سی تحریکوں کی رہنما تھی۔ اس کے من موہن سے جنسی تعلقات تھے اس لیے من موہن اگر اس سے بے باک تھا تو سمجھ میں آنے والی بات تھی مگر اس کے بائی جی سے کس قسم کے تعلقات تھے کیا وہ بائی جی کا عقیدت مند تھا یا بائی جی سے مذہبیات پر درس لینے آتا تھا یا اس کے کتب خانہ سے استفادہ کرنے آیا کرتا تھا۔ بہر حال اس کی یہ عقیدت مندی سمجھ میں نہیں آتی ۔

اس مختصر گفتگو کے بعد خادم ایک بڑے سے طشت میں کھانے کی چند چیزیں لے آیا۔ جنھیں اتنے قرینے سے رکھا گیا تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

راوی کے الفاظ میں "اس صورت پر بھولپن تھا۔ کچی کلیوں کی سی خوشبو تھی وہ بانکپن جو بائیوں کی صورتوں کے لیے ضروری ہے وہاں کہیں نظر نہیں آتا۔ اپنے سر کو پلو سے ڈھانپے وہ ایک ایسی لڑکی کی طرح بیٹھی تھی جس کا خاوند گھر پر موجود نہ ہو اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے دوستوں کی خاطر داری کرنے کے لیے مجبور ہو۔

پھر وہ بائی جی وارٹن سے مذہب کی ماہیت اور بودھ مذہب کے بارے میں گفتگو کرتی ہے اس کی گفتگو میں عالمانہ اور مفکرانہ شان نظر آتی ہے۔ اس کے پاس ایک بے مثال کتب خانہ بھی ہے۔ وہ وارٹن سے کہتی ہے "اگر آپ کو ان مسائل پر قلمی نسخوں کی ضرورت ہو تو میرا کتب خانہ آپ کی امداد کر سکے گا" یہ اس شان سے کہا گیا ہے جیسے کہ ابھی ڈون وارٹن کو اس جیسی صاحب علم ہستی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

اس کے بعد موسیقی کا سلسلہ شروع ہو گیا لکھا گیا ہے کہ بائی جی نے ستار کے تاروں سے سر ملایا اور پھر بائی جی ستار پکڑے دوزانوں بیٹھی گانے لگیں۔ مصنف جب یہ تفصیلات دینے لگیں تو انھیں اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ ستار سے سُر نہیں ملایا جاتا۔ سارے ساز دراصل سُر سے ملائے جاتے ہیں۔ ان میں طبلہ بھی شامل ہے۔ گایک ستار لے کر نہیں گاتے بلکہ تانپورہ لے کر گاتے ہیں اور اس کے تاروں کو بھی گایک کے سُر سے ملایا جاتا ہے پھر اس کے تاروں کی آواز راگ گاتے وقت آدھار کا کام سر انجام دیتی ہے اور گایک کو بے سرا نہیں ہونے دیتی۔

اب موسیقی کا حال سنیے "بائی جی کا راگ کسی خاکی عورت کے گلے سے

نہیں نکل سکتا یا پھر ہم ہی اس سحر کو محسوس کرنے کے لیے آئے تھے اور اس جادو میں کھو گئے تھے۔

بائی جی ایک سچے بھگت کی طرح آنکھیں بند کیے ستار پکڑے دو زانو بیٹھی تھی اور مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ ہم سب سے بھی بے خبر سازندوں سے بھی بے خبر اپنے آپ کو بھگوان کے چرنوں میں دیکھ رہی تھیں۔

سازندوں کے رخصت ہو جانے کے بعد "بائی جی اس طرح ڈھانپ کر بیٹھی اپنے سوئے ہوئے حسن اپنی نوخیزی مندر کے دوار کی سی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔

جب یہ لوگ جانے لگے تو اس نے بغیر مانگے ہوئے وہ دونوں مصوری کے شاہکار اتارے اور ڈون وارٹن کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولیں۔ "یہ میری طرف سے تحفہ ہے"! اس تحفہ کے لیے لکھا گیا ہے کہ وہ لاکھوں سے بھی زیادہ مہنگی تصویریں تھیں۔ اس تحفہ کو پیش کرتے وقت وہ شرمندہ سی ہو کر کہتی ہیں "آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کے لیے میں اس وقت کیا کر سکتی ہوں۔ رات ہے اور یہ ناچیز سی تصویریں ہیں" گویا دن ہوتا تو شاید وہ کروڑوں کا تحفہ پیش کرتیں۔

ان تمام امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ ان بائی جی کا تصور کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑی راجکماری ہے جو شوقیہ بائی جی بن گئی ہے یا کوئی دیوی ہے جو بائی جی کا روپ دھار کر دنیا کا مشاہدہ کرنے یا اپنا چمتکار دکھانے آئی ہو۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجہ مہاراجہ بھی اجنبی مہمان کو زیادہ سے زیادہ ہزاروں کی چیز تحفہ میں دے سکتے تھے لاکھوں کا تحفہ اس طرح دے دینا ان کے بس کی بھی بات نہ تھی اور پھر لطف یہ کہ اس پر بھی شرمندہ ہونا کہ کتنا حقیر تحفہ دے رہی ہیں۔

یہاں سے نکل کر یہ لوگ جا ہی رہے تھے کہ ایک اور بائی جی کا چھکڑا

جاتا ہوا ملا جو بہت بیمار تھی یہ دوسرے قسم کی بائی جی تھیں جس نے مجبوراً یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ طوالت کے خوف سے اس کا تذکرہ یہیں ترک کیا جاتا ہے ان بائی جی کے قصہ سے صرف من موہن کی فطرت کا ایک روشن پہلو سامنے آتا ہے پہلے اسے صرف ایک عیاش انسان کے روپ میں پیش کیا گیا تھا اب اسے ایک دردمند انسان کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ان بائی جی کے قصہ کی اور کوئی اہمیت نہیں۔

یہ دراصل عورتوں کا ناول ہے اس کے اہم کردار عورتیں ہی ہیں اس کہانی میں مردوں کی حیثیت محض ضمنی ہے اس میں نسوانی کرداروں کے مختلف درجے نظر آتے ہیں سب سے زیادہ بلند مرتبہ پر کنوں کا ری ٹھاکر ہے۔ جو نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک مثالی عورت ہے۔ اس میں مثالیت کو اس قدر بڑھا دیا گیا ہے کہ وہ عورت تو کیا انسان بھی نہیں رہتی۔

اس میں وہ عورتیں بھی ہیں جن کا کام گھر چلانا اور بچے پالنا ہے اس میں ایسی عورتیں بھی ہیں جو چپ چاپ ظلم سہتی رہتی ہیں اور ظلم سہتے سہتے مر جاتی ہیں۔ اس میں بیوہ کی دردناک زندگی کا نقشہ بھی پیش کیا گیا ہے ششما کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس کا میاں بیمار پڑا اور مر گیا۔ اس لیے اسے منحوس سمجھا جانے لگا۔ لوگ اس کے سائے سے پرہیز کرنے لگے۔

سپرنٹنڈنٹ کی ماں کے آخری وقت کی۔ اس کی بیماری اور موت کی داستان ضرورت سے زیادہ دردناک ہے۔ لگتا ہے اس کی بے کسی میں کافی مبالغہ برتا گیا ہے۔ یہ خلاف قیاس لگتا ہے کہ اس کے بیٹوں میں سے کسی کے دل میں بھی اپنی ماں کے لیے رحم اور خدمت کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہوا شوبھا ایک ایسی عورت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ جو سہاگن، بیوہ داشتہ

لیڈر۔ مختلف حیثیت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس وقت اس کا تعارف کروایا گیا ہے۔ وہ سوسائیٹی میں ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہے مگر اسے وہ عزت حاصل نہیں جو کہ کنول کماری ٹھاکر کو حاصل ہے۔ اس عزت کو حاصل کرنے کے لیے وہ آسان راستہ اختیار کرتی ہے وہ کنول کماری کی مخالفت کی مہم اپنے اخبار میں چلاتی ہے اسے طرح طرح سے بدنام کرتی ہے اس کے ناوار گھر کو آوارگی کا اڈہ بتاتی ہے۔ اسے وہ احترام تو پھر بھی حاصل نہیں ہو پایا البتہ اس کی مہم کنول کماری ٹھاکر کو کنارہ کشی پر مجبور کر دیتی ہے۔

آخر کار کنول کا رویہ۔ اس کا اخلاق۔ اس کا کردار اور کسی حد تک اس کے بھائی رگھو کی ملاقات اس کی فطرت میں انقلاب لانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور وہ تائب ہو کر چلی جاتی ہے اس کے بعد اس کا ذکر ان خطوط کے ذریعے ہوتا رہتا ہے وہ وقتاً فوقتاً آزادی کو لکھتی ہے ان ہی خطوط کے ذریعے ہم اس کی پچھلی زندگی سے واقف ہوتے ہیں۔

شوبھا بنیادی ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کی شادی ایک دوسرے گاؤں میں ہوئی تھی ابھی برات راستے ہی میں تھی کہ اس کے شوہر کو سانپ نے ڈس لیا اس طرح وہ اپنے سسرال بیوہ بن کر پہنچی۔

کچھ عرصہ تک وہ بیوگی کی زندگی گزارتی رہی پھر اس گاؤں میں ایک جوگی آیا۔ ”اس کی لمبی لمبی جٹاؤں میں نرمی تھی اور چہرے پر بلا کا حسن تھا۔ کیرتن کے سمے گاؤں کی بہو اور بیٹیاں اس کی آواز پر جھوم جاتیں“۔ آخر کار وہ اس جوگی کے ساتھ بھاگ نکلی۔ راستے میں وہ جوگی بھی اسے چھوڑ بھاگا۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں کئی تیز موڑ آئے۔ بقول اس کے ”بہر میں نے روپ بدلے۔ ہواؤں کے کندھوں پر سوار ہو کر خوشبو بن کر میں نے دور دور چکر لگایا ہے۔ پھول بن کر میں کئی دامنوں کی زینت بنی رہی

ہوں۔" ایک اور جگہ کہتی ہیں "میں نے کئی زندگیوں کے پیالوں میں تلخی ڈال کر مسرت چرالی ہے۔

جوگی کے چھوڑ جانے کے بعد بھٹکتے بھٹکتے وہ گرجا میں جا پہنچی اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور ایک عیسائی ڈانیئل سے شادی کر لی۔ عیسائی بن کر اس نے تعلیم حاصل کی ہوتے ہوتے وہ شوبھا بنرجی بن گئی اور ہندوستان کی بہت سی تحریکوں کی راہنما۔ الغرض شوبھا مختلف حیثیتوں میں، ہمارے سامنے آتی ہے مگر وہ خود بتاتی ہے کہ دنیاوی شہرت اور عزت کے باوجود اسے روحانی سکون نہیں ملا۔ سکون کی راہ وہی ہے جس کا بلند ترین نمونہ کنول کماری ٹھاکر ہے اور آخر میں وہ اسی راہ کو اختیار کرتی ہے۔ کنول کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا کفارہ وہ اس طرح ادا کرتی ہے کہ آخر میں کنول کو اپنے گھر لے آتی ہے اور زخمی کنول کی خوب خدمت کرتی ہے۔ کنول اسی کے گھٹنے پر دم توڑتی ہے۔ یہ اس کہانی کی سب سے زیادہ گمراہ عورت ہے اسے ناول کی ویلین کہا جا سکتا ہے شرر اور پریم چند کی طرح مصنفہ نے آخر میں اسے بھی نیک بنا کر چھوڑا۔

ہمیں شوبھا کی پچھلی زندگی کا علم اس کے خطوط ہی کے ذریعے ہوتا ہے مگر اس کے بعد بھی خطوط کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر یہ خطوط قطعی غیر ضروری ہو جاتے ہیں اور کوئی مقصد حاصل نہیں کر پاتے۔

ان تمام عورتوں سے مختلف اور حقیقی عورت کا نمونہ کرشنا بوس پیش کرتی ہے، اس نے عورتوں کے حقوق کی تحریک شروع کی۔ اس کی ملاقات ایک شعلہ بیان مقرر اور عورتوں کی آزادی کے حامی نوجوان سے ہوئی" دونوں جذباتی تھے۔ ایک کھایا کھیلا اور زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کہنہ مشق شکاری تھا دوسری طرف آزادی کی روشنی سے

چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہر اندھیرے میں بھی خواب اور سہاروں کی جھلک دیکھنے والی لڑکی تھی داؤ چل گیا" دونوں نے کورٹ میں شادی کر لی۔

روبیندر کمار برہمن تھا اور ایک چھوٹے موٹے رجواڑے کا کمار۔ کرشنا بوس ایک معمولی ویش خاندان کی لڑکی تھی چنانچہ روبیندر کے والدین نے کرشنا کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مقدمہ بازی ہوئی کرشنا کی وکالت کنول نے کی چنانچہ فیصلہ اس کے حق میں ہوا

آخر کار کرشنا نے تنگ آکر اپنے شوہر کو قتل کر دیا اسے چودہ سال کی سزا ہوئی چار سال کی معافی کے بعد وہ دس سال جیل میں رہ کر دوبارہ کنول کے پاس آ گئی۔

کرشنا ایک عملی عورت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس کے ایک بچہ ہے جس سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ اس ناول میں صرف وہی ایسی ہستی ہے جو کنول سے بحث کر سکتی ہے اور اس کے نظریات کا کھوکھلا پن اس پر واضح کر سکتی ہے۔ گفتگو کے دوران ایک مرتبہ کرشنا نے کنول سے ہنس کر کہا "جب عاجز آ جاتی ہو۔ جب تمہیں اپنے نظریوں کا کھوکھلا پن ڈرانے لگتا ہے تم محبت سے پہلو بچا کر اپنی تسلی کرتی ہو"

"میرا سوال ابھی باقی ہے تم محبت کا پرچار کیوں کرتی ہو۔ تم زندگی کے دامن میں خوشیاں دیکھنے کی متمنی ہو۔ پر خوشیاں عارضی ہیں پھولوں سے بھی عارضی۔ اور محبت تو درد ہے۔ جو دل کو زندہ رکھتا ہے۔ تم درد چاہتی ہو۔ پتھر کے سینے میں درد کہاں سے لاؤ"

جب کرشنا اسے زچ کر دیتی ہے تو وہ تنگ آکر کہتی ہے "تو پھر میں کیا کروں؟" "کیوں" کرشنا نے تیزی سے مڑ کر اس کو، کی، طرہ۔

دیکھتے ہوئے کہا "تمھاری آنکھیں نئے پن کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتیں نیا پن تو ہر قدم پر زندگی ہے۔ ہر لمحہ نیا ہے کنولا رانی"

کرشنا اپنے بچے سے ملنے کے لیے بے تاب تھی کنول اس سے کہتی ہے "تم میں دھیرج کبھی نہ آیا تم اتنی جذباتی ہو شوبھا سے جا کر ملنے سے تو سارا بنا بنایا کام بگڑ جائے گا اور تم کتنے دنوں سے شوبھا کے پاس جانے کا سوچ رہی ہو بیٹے کی محبت نے تم کو اور کسی کام کے قابل نہیں رہنے دیا"

اور کرشنا جیسے آتش فشاں کی طرح پھٹنے کو تیار ہی ہو۔ کہنے لگی۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ میرا بیٹا ہے۔ دیوانگی کی حد تک ایک ماں کی طرح اسے چاہتی اور پیار کرتی ہوں میرا کام یہی ہے کہ میں اسے چاہوں۔ میری نجات اس سے ملنے اور اسے چاہنے میں ہے۔ تم اپنے نظریے کی کھوکھلی عمارت کو کب تک کھڑا رکھو گی۔ تم اکیلی کب تک رہو گی۔ تمھارا حال بھی مس جوزف کا سا ہی ہو جائے گا"

مس جوزف ان کی ایک استاد ہے جو ساری عمر کنواری رہی۔ جوانی میں اسے کئی قدر دان اور محبت کرنے والے ملے مگر اس نے سب کو ٹھکرا دیا اس کا کردار گویا عبرت کا ایک سائن بورڈ ہے۔ وہ ایک ملاقات میں کرشنا سے کہتی ہے "خدا کے عظیم قانون اور ربط حیات کو ٹھکرانے کی سزا مجھے اب ملی ہے"

اس کتاب کا ایک اہم موضوع سیاست بھی ہے اس کتاب میں اس جدوجہد کی تصویر پیش کی گئی ہے جو قوم پرست سیاستدان ہندوستان کی آزادی کے لیے کر رہے تھے۔ فرقہ واریت کو اس میں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ اس زمانہ کی عام فضا کا نقشہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:۔

"انسان تیزی سے ہندو اور مسلمان بن رہے تھے بھگوان کی مورتی

کے سامنے جھکنے والے نفرت کا پرچار کر رہے تھے۔ خدا کی حمد و ثنا کرنے والے اور مسجد کے بلند میناروں پر چڑھ کر اذانیں دینے والے زہر گھول رہے تھے۔"

اس کشت و خون اور قتل و غارت گری کا ذمہ دار صرف ایک فرقہ کو ٹھہرانا غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک جھوٹے مذہبی جنون میں ہندو و مسلمان دونوں مبتلا تھے۔

چندر شیکھر اور گنگا دھر ایسے لیڈروں کا نمونہ پیش کرتے ہیں جو کانگرس کے اسٹیج سے ہندو مسلمان اتحاد کے لیکچر دیا کرتے تھے مگر یہ دونوں اندر سے انتہائی زہریلے ہیں اور مسلمان کے خون کے پیاسے ہیں۔ بیشتر ہندوؤں کے اسی طرح دو رخ تھے اور اونچی اونچی باتیں کانگرس کے اسٹیج سے کی جاتی تھیں اور زہر اگلنے کے لیے مہاسبھا یا آر۔ ایس۔ ایس کو استعمال کیا جاتا تھا۔

چندر شیکھر اور گنگا دھر راوی کو مجبور کرتے ہیں کہ بدلے ہوئے حالات کے تحت اخبار کی پالیسی بدل ڈالے وہ اسے بھی فرقہ واریت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں راوی جواب دیتا ہے۔

"کیا بھگوان تمھیں پاپ کرنے، زہر پھیلانے اور دوسروں کو قتل کرنے کو کہتا ہے۔ تم اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جو کچھ کرنا چاہتے ہو وہ بھگوان کی آڑ لے کر کیوں کرتے ہو........ تم اسٹیجوں پر چڑھ کر کہتے پھرتے ہو کہ ہندوستان کسی کا نہیں بلکہ دونوں قوموں کا ہے۔ تم کانگرس اور ہندوستان کی یک جہتی کے حق میں ہو اگر تمھاری طرح کا دھرماتما جو جھوٹ سے بھرے بول پر یقین رکھتے ہیں کانگرس کا پروپیگنڈہ کرتے اور اپنی زبان سے خلوت میں بیٹھ کر اپنی باتوں کو جھٹلاتے ہیں تو نہ جانے کیا ہونے والا ہو گا۔"

راوی کی یہ جذباتی تقریر سن کر چندر شیکھر کرسی پر بیٹھا مسکراتا رہا۔ راوی کو وہ دونوں ہنستے ہوئے چھوٹے ابلیس لگ رہے تھے۔ دراصل اسی طرح کے سینکڑوں ہزاروں ابلیس معاشرے میں پھیل گئے تھے اور اپنی نفرت بھری تقریروں سے اپنے اپنے لوگوں کو بھڑکا کر انسانیت کا خون بہا رہے تھے۔

ایسے ہی دھرماتماؤں کے بارے میں راوی کہتا ہے "میں نے لوگوں کو ننھا کہ نئے کپڑے پہن کر تلک لگائے بھگوان کی مورتی کے سامنے تلواریں اٹھا کر سوگند کھاتے دیکھا۔ نفرت کی آری سے وجود کو کاٹا جا رہا تھا۔ پرخچے اڑائے جا رہے تھے۔ مذہب کی دھجیاں اڑ رہی تھیں..... دستی بم پھینکے جا رہے تھے۔ چیختے اور چلاتے بچوں کو نیزوں لٹکایا جا رہا تھا ان کو زندہ ہی آگ پر بھونا جا رہا تھا...... نازک اندام سفید لڑکیاں ننگی ٹھٹھرائی ٹھٹکوں سے برستی بارشوں میں قطار میں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ مرد انہیں دیکھ کر ہنستے اور شراب سے مدہوش ہو کر جس کو جی چاہتا کھینچ لیتے۔"

ایک اور جگہ لکھا گیا ہے "وہ عورتیں جن کو چشم فلک نے بھی کبھی عریاں نہ دیکھا تھا سرعام رسوا کی گئیں ان کی عصمت دری کی گئی۔"

اس ناول کے تمام پسندیدہ کردار سیاست میں بھی پسندیدہ نظریات رکھتے ہیں وہ اس مرتی مارتی دنیا میں بھی انسانیت کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں کنول کے ہوسٹل میں مسلمان لڑکیاں بھی تھیں وہ کہتی ہے "میں ہندو مسلمان میں یقین نہیں رکھتی۔ میرے لیے جو لڑکیاں کالج میں ہیں ایک امانت ہیں۔"

راوی کے ساتھ راجندر بلکہ ڈون وارٹن بھی مسلمانوں کی جان بچانے میں مصروف ہیں۔ خود راوی کے گھر میں اس کی بیوی اور اس کا چھوٹا بیٹا بھی اس زہر آلود فضا سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ صرف بیٹا

اس کی ہم خیال ہے اس لیے کہ وہ نہ صرف کنول کی شاگرد بلکہ اس کی منگنی ہے۔

راوی اپنے ہی مکان میں قید کر دیا جاتا ہے۔ جیسے تیسے وہ نکل بھاگتا ہے۔ وہ اور ڈون وارٹن مل کر بیس مسلمان لڑکیوں کی جان بچاتے ہیں۔ یہ دونوں ان لڑکیوں کو ہیرا بائی کے گھر لے جاتے ہیں اور اس کی پناہ میں چھوڑ آتے ہیں۔ اس طرح ہیرا بائی بھی اس کارِ خیر میں شریک ہو جاتی ہے۔

راجندر لڑتا ہوا مارا جاتا ہے کنول بھی شدید زخمی ہو جاتی ہے خود راوی بھی بلیم کی ایک چوٹ سے بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ڈان وارٹن اپنے ملک چلا جاتا ہے۔ راوی اسے خط لکھتا ہے وہ بھی جواباً خط لکھتا ہے۔ اہل مغرب ہندوستان کی مذہب پرستی اور روحانیت سے خصوصاً بدھ مت کی تعلیم سے بہت متاثر ہیں۔ ہندوستان کے یہ حالات دیکھ کر ڈون وارٹن بدھ مت سے تعلق ... رکھنے والی ساری کتابیں سمندر میں پھینک دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ جب یہ مذہب ان لوگوں کو تسکین نہ دے سکا تو اوروں کو کیا دے گا اس نے مشرقی مذہبوں کے صدر کے سامنے کتابوں کا ڈھیر جا کر ڈال دیا اور کہا۔

"ہندوستان میں لوگوں نے اہنسا پرمودھرما کے اصولوں کے باوجود ایک دوسرے کے گلے کاٹے دوسرے مذہب کی عورتوں کو ذلیل کیا۔ بچوں کو نیزوں پر لٹکایا۔ مردوں کو سرِ عام ہنس ہنس کر عذاب سے مارا اور ایسے وحشیانہ کام کیے کہ سارا یورپ کانپ گیا۔"

ان خیالات کے بعد ڈون وارٹن حق بجانب تھا کہ اس نے ان ساری کتابوں کو جھوٹ کا پلندہ سمجھ کر سمندر میں پھینک دیا۔

راوی اور اس کے ہم خیال ساتھی برصغیر کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔
ڈون وارٹن تقسیم کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ ترک وطن کے بارے میں وہ لکھتا ہے "اپنے گھر کی کڑیوں تلے دب کر مرجانا دوسرے ملک کی آزاد اور خوبصورت فضا میں سانس لینے سے بہتر ہے۔

راوی اور ڈون وارٹن ان فسادات کی ذمہ داری انگریزوں پر ڈالتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لینے کے بجائے ان کی ذمہ داری انگریزوں کے سر تھوپ دی۔

حالات ایسے ہو گئے تھے کہ فساد کی ذمہ داری کسی کے بھی سر تھوپی جائے مگر ترک وطن کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔ راوی بھی آخر میں تقسیم کا قائل ہو جاتا ہے مگر وہ ایسی تقسیم چاہتا تھا۔

"ہمیں جدا ہی ہونا ہے تو کیوں نہ بھائی بندوں کی طرح ایک چوراہے پر دوستوں کی طرح بچھڑ جائیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ہم کو پھر بھی کبھی ایک دوسرے سے ملنے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ کاش ایسا ہی ہوتا —— ایسی ہی فضا ہوتی تو شاید مسلمان تقسیم کا مطالبہ بھی نہ کرتے۔

اس کتاب کا قصہ آگرہ سے تعلق رکھتا ہے مگر آگرہ پن اس میں کم ہی ہے۔ شاید تاج کی رومانیت کی وجہ سے آگرہ کا انتخاب کیا گیا ہے ورنہ اس قسم کی فضا اور ایسی زندگی یوپی کے کسی بھی پرانے شہر سے وابستہ کی جاسکتی تھی۔

جس طرح ہماری فلموں میں فلم کا نام کسی نہ کسی بہانے سے کسی کی زبان سے ادا کروا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح مصنفہ بھی کنول کے ایک ادھورے خط میں اس کتاب کا نام لے آتی ہیں۔ لکھا ہے "شاید اس نے اپنے خط کو اگلی بہتر بہاروں کے انتظار میں ختم نہیں کیا تھا۔ بہار جو اس کے لیے کبھی نہ آسکی۔ بہار جو ہم سب کے لیے کبھی نہ آسکے گی۔ بہار جس کی تلاش میں قافلے سرگرداں نکلیں گے۔ مگر اسے پا نہ سکیں گے۔"

سہارا اردو ناول

آنگن

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور کا "آنگن" کرداری ناول کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ کا مقصد نہ کسی مخصوص علاقہ کی تہذیب کی تصویر کشی ہے۔ نہ سیاسی جدوجہد کی تفصیلات بیان کرنا ہے بلکہ ایک اوسط درجے کے زمیندار گھرانے کے کچھ افراد کی زندگیوں کو پیش کرنا ہے۔ جو اپنی اپنی مخصوص افتادِ طبع کی بنا پر ہمارے لیے کافی دلچسپی کے سامان رکھتے ہیں۔

کریمن بوا کے نزدیک تو یہ گھرانہ بہت بڑا ہے مگر جزئیات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک مظفر کوئی بہت بڑے زمیندار نہیں تھے۔ ان کی داشتائیں ان کی حویلی سے اتنی قریب تھیں کہ ان کی بیگم صاحبہ کو ان کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ ان داشتاؤں کے بچے حویلی کے قریب ہی سڑے ہوئے آموں کی گٹھلیاں چوستے چوستے مر گئے (سوائے اسرار میاں کے) بڑے زمینداروں کی داشتائیں ان کی حویلیوں سے اتنی دور ہوتی ہیں کہ بیگم صاحبہ کو ان کے بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ پھر ان کے بچے بھی اس حال میں نہیں رہتے جس میں کہ ملک مظفر کی داشتاؤں کے لڑکوں کو دکھلایا گیا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے

لڑکے زمینداری فروخت کر دیتے ہیں۔ اس سے جو روپیہ حاصل ہوتا ہے وہ ان کے تینوں بیٹوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ فروخت سے کتنا روپیہ حاصل ہوا ہو گا اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اس کے ایک تہائی روپے سے ایک معمولی دکان لگ پاتی ہے۔ جیسے اسرار میاں چلا رہے ہیں۔ ان کی آبائی حویلی جس کا آنگن اس کہانی کا مرکز بنتا ہے۔ وہ بھی معمولی حیثیت کی ہے۔

بڑے زمینداروں کے گھروں میں زیورات بھی کافی ہوتے ہیں، اور وہ گھر کی مالکن کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ملک منظر کی بیوہ کے پاس اس قسم کے زیور وغیرہ بھی نظر نہیں آتے۔ وہ کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

اپنی کہانی کے لیے اس حیثیت کے زمیندار گھرانے کو منتخب کرنا بھی مصنفہ کی فنکاری کی دلیل ہے۔ اس طرح یہ لوگ آسانی سے متوسط زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

بقول کریمن بوا ملک منظر کا انگریزوں میں کافی اثر و رسوخ تھا مگر ان کے تین میں سے دو بیٹوں کو انگریزوں سے نفرت ہے۔ تیسرے کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ اپنی دوسری بیوی اور اس سے ہونے والے بچے میں مگن ہے۔ اور اپنی پہلی بیٹی چھمی کی طرف سے کافی غافل ہے۔

بڑے ابا جن کا اس ناول میں نام بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ کٹر کانگریسی ہیں۔ شاید کچھ تو ان کے اثر سے اور کچھ اپنے سالے کی انگریز بیوی اور اپنی بیوی کی انگریز پرستی کی ضد میں۔ ان کے چھوٹے بھائی مظہر کو بھی انگریزوں سے کافی نفرت ہے یہ نفرت وقتاً فوقتاً اس لیے بھڑکتی رہتی ہے کہ ان کی بیوی نے زمینداری کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اپنے بھائی کے یہاں رکھ دی ہے اور مظہر میاں تڑپ کر رہ جاتے ہیں مگر وہ روپے انہیں ملتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی بڑے بھائی کی طرح کوئی کاروبار کر لیں اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں۔

ناول کی ابتدا فلش بیک سے ہوتی ہے۔ عالیہ کے ابا کی گرفتاری کے بعد یہ لوگ اپنے بڑے چچا کے پاس یعنی اپنے آبائی مکان میں آ جاتے ہیں۔ اس مکان میں عالیہ کی

پہلی ہی رات ہے۔ الّو کی آواز نے اس سنسان جگہ کو اور بھی خوفناک بنا دیا ہے۔ بے خوابی کی وجہ سے اس کا ذہن ماضی میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ بالکل قدرتی بات ہے۔

وہ سوچتی ہے "یہ رات کس طرح گزرے گی"، تلازمۂ خیال کے اصول کے تحت فوراً اس کا ذہن اس کے ابا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور وہ سوچتی ہے "ابا جیل میں تمہاری راتیں کس طرح گزرتی ہونگی۔ قریب کے ماضی کی تمام اہم باتیں ایک ایک کر کے اسے یاد آتی ہیں تہمینہ اور اس کی صفدر سے محبت کا قصہ۔ اماں کا اس کے ساتھ رویّہ۔ مہندی کا پودا اپنے کھیل کے ساتھی گویا ناول میں گزرنے والے واقعات کی طرف کئی اہم اشارے اس میں آگئے ہیں۔

اصل قصہ کی ابتدا ڈرامہ کی طرح تصادم سے ہوتی ہے۔ تصادم کا مرکز اماں کی ذات ہے۔ ان کا اولین تصادم صفدر کی ذات سے ہوتا ہے جو انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا دوسری جانب ان کا تصادم اپنے شوہر سے ہوتا ہے۔ جن کی بھی غالباً کوئی بات انہیں پسند نہیں۔ اپنے شوہر سے تصادم کی اصل وجہ صفدر اور اپنی بہن نجمہ کے ساتھ ان کا مشفقانہ رویہ ہے۔ پورے قصے کی بنیاد یہی دو تصادم بنتے ہیں۔

"صفدر بھائی کتنے وجیہہ مگر کیسی مسکین صورت کے تھے۔ ان کی مسکینی کی وجہ اماں کی بھرپور نفرت تھی۔ صفدر سے انہیں کس قدر نفرت ہے اس کا اندازہ صرف ایک جملہ سے ہو سکتا ہے۔ کہتی ہیں: "یہ نکما مجھے کھا کر اس گھر سے نکلے گا"،

نجمہ پھوپھی اماں سے بے زار تھیں اور اماں ان سے "اماں جب انہیں یاد کرتیں تو نفرت کا سانپ ہر طرف پھنکارنے لگتا" نجمہ تو نظروں سے دور تھیں مگر صفدر تو ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔

جس طرح یہ مشہور ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ شاید اماں کو صفدر اور تہمینہ کے قرب سے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں صفدر کے باپ اور سلمہ پھوپھی کی داستان پھر نہ دہرائی جائے۔ اور وہ اس کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں تھیں۔

اماں کا کردار اس ناول کا غالباً سب سے زیادہ توانا کردار ہے۔ ان کے ارادوں کی پختگی اور ان کو پورا کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کا حوصلہ، کسی کے آگے ہتھیار نہ ڈالنا کسی سے سمجھوتہ نہ کرنا۔ انھیں قصہ میں ایک غیر پسندیدہ انسان تو ضرور ظاہر کرتا ہے مگر ساتھ ہی انہیں ناول کا فعال ترین کردار بھی ثابت کر دیتا ہے ہے۔ شاید اسی لیے انہیں آخر تک برقرار رکھا گیا ہے۔

قصے کے اہم موڑ انہی کی بنا پر آتے ہیں۔ اس خاندان کی خوشحال زندگی کو المیے میں بدلنے کا ذمہ دار بھی دراصل انہی کا رویہ ہے۔

سلمہ پھوپھی کا جو بھی حشر ہوا اس سے عبرت دلانے کے لیے اماں صفدر کے باپ اور اس کا قصہ تہمینہ کو سناتی رہتی ہیں۔ صفدر کا باپ ایک غریب کسان تھا۔ زمینوں پر کام کرنے کے علاوہ گھر کا کام کاج بھی انجام دیا کرتا تھا۔ گھر میں اس کا پردہ نہ تھا۔ سلمہ کو صفدر کے باپ سے محبت ہو گئی۔ ایک دن دادی نے سلمہ کو صفدر کے باپ کا ہاتھ پکڑے سرگوشیاں کرتے دیکھ لیا۔ سلمہ کو اتنا مارا کہ سارا جسم نیلا پڑ گیا۔ آخر کار وہ صفدر کے باپ کے ساتھ بھاگ نکلی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اماں کہتی ہیں "کاش سلمہ میری بیٹی ہوتی تو پہلے ہی دن اسے ہاتھوں سے زہر کھلا دیتی"۔ اماں کی یہ تنبیہہ تہمینہ کو بتا دیتی ہے کہ وہ کس حد تک جا سکتی ہیں۔ وہ اس کی شادی صفدر کے ساتھ ہرگز نہ ہونے دیں گی۔

صفدر جس وقت چھوٹا تھا۔ اس کے ساتھ ان کا رویہ یہ تھا "اماں کی ہدایت پر نوکرانی صفدر بھائی کو گرمیوں میں دو وقت کا سڑا کھانا کھلاتی تھی۔ چلو بھر دودھ میں ڈھیروں پانی ملا کر دیتی اور گوشت پر کے چھیچھڑے کاٹ کر ان کے لیے قیمہ بنا دیتی مگر صفدر نے کبھی اس کی شکایت ابا سے نہ کی۔ تہمینہ اماں کی بے انتہا نفرت دیکھ کر عالیہ سے کہتی ہے "کیسے بے شرم ہیں یہ تمہارے صفدر بھائی جو یہاں سے جاتے نہیں۔ اب تو اس لائق بھی ہو چکے ہیں کہ کما کھائیں"۔

اماں کا معیار ان کے بھائی ہیں جنہوں نے انگلینڈ میں تعلیم پائی ہے۔ انہیں یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ ان کی بیوی انگریز ہے۔

ابا کو انگریز اور انگریزیت دونوں سے چڑ ہے۔ اماں عالیہ کو اسکول میں داخل کرنے

کے لئے کہتی ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں: "سنا ہے یہاں ایک ہی مشن ہائی اسکول ہے اور وہاں صرف انگریزی پڑھائی جاتی ہے یا پھر اپنے مذہب کی تعلیم ہوتی ہے۔ میں انگریزوں اِن اسکولوں کے سخت خلاف ہوں، یہ ہماری غلامی سے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دوبارہ اصرار کرنے پر ابا کہتے ہیں: "مجھے مشن اسکولوں سے نفرت ہے۔ میں اسے نہیں پڑھاؤں گا بے شک جاہل رہے۔"

"یہ تو میں دیکھوں گی کہ جاہل رہے گی یا پڑھے گی۔ تم کو اللہ واسطے کا بیر ہے انگریزوں سے۔ جس تھالی میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔" اماں کی آواز میں بلا کا طنز تھا کہ ابا کرسی سے اچھل پڑے۔

کسی نہ کسی بات کا موقع نکال کر اماں اپنے شوہر سے ہر وقت لڑتی رہتی تھیں اور انگریزوں کی غلامی کا احساس دلا کر ان کے دل میں انگریزوں کی نفرت کو بھڑکاتی رہتی تھیں۔

عالیہ کے اسکول کی نگران مسز ہاورڈ نے خود ہی عالیہ کے گھر آنے کی خواہش ظاہر کی۔ اماں کا مرعوبیت کے مارے برا حال تھا۔ "بھئی حد ہے انگریز ہو کر خود ہمارے گھر آنے کو کہا۔" چائے پی کر جاتے وقت مسز ہاورڈ نے عالیہ کے ابا کے بارے میں پوچھا۔ مگر اماں نے دفتر کے کام کا بہانہ کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد کہنے لگیں: "دیکھا چاتے پر نہیں آئے نا، وہ تو کہو مجھے اچھا بہانہ یاد آ گیا ورنہ کیا سمجھتیں مسز ہاورڈ۔ دیکھ لینا یہ اپنی نفرت کے پیچھے کچھ کر کے رہیں گے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ انگریز سے زیادہ اچھا حکمران کون ہوگا۔"

یہ جملہ پیشین گوئی کی حیثیت رکھتا ہے: "دیکھ لینا یہ اپنی نفرت کے پیچھے کچھ کر کے رہیں گے۔" آنے والے واقعہ کے لئے ہمیں پہلے سے تیار کر دیتا ہے۔ ابا میں انگریزوں سے نفرت تو تھی ہی، مگر اماں کی انگریز پرستی اور طعنے اس آگ کو رفتہ رفتہ مزید بھڑکاتے جا رہے تھے۔

ابا اس دن کافی دیر سے آئے۔ اماں انہیں دیکھتے ہی بگڑ گئیں: "اب آئے ہیں خانصاحب، کیا وہ نہ سمجھتی ہو گی کہ آپ کو ان کا آنا برا لگا۔ حد ہے وہ انگریز ہو کر ہمارے گھر آئے اور صاحب بہادر پرواہ بھی نہ کریں۔ اگر وہ رپورٹ کر دے کہ جناب

نے اس سے بدسلوکی کی ہے تو پھر ہوش ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ابّا نے جواب دیا "اب وہ زمانے لد گئے، جب تمہارے انگریز کے نام سے تھرتھری چھٹتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں کچھ نہ کرسکوں تو کیا نفرت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بدنیت تاجر، یہ حکمران کیا، مجھے تو ان کی ساری قوم سے نفرت ہے۔ اگر میرا دماغ بڑے بھیا جیسا ہوتا تو پھر دیکھتا مگر میں تو بندھا ہوا ہوں۔ نوکری کرنے پر مجبور ہوں۔"

جہاں میاں بیوی کی سوچ میں اس قدر تضاد ہو اور گفتگو طعنوں میں ہوتی ہو۔ وہاں گھر کا یہ حال ہونا لازمی تھا۔ اماں نے ابا کے انتظار سے تھک کر آپا سے باتیں شروع کر دیں۔ وہی صفدر کے خاندان سے دشمنی کی داستانیں۔ نجمہ پھوپھی کی خود غرضی کے قصے۔ بھائی اور بھاوج کے محبت بھرے گیت۔ آپا پلکیں جھپکا جھپکا کر سب کچھ سنتیں، مگر خود کچھ نہ کہتیں۔ ابا کی بیٹھک جب سُونی ہوئی وہ کسی دوست کے گھر چلے جاتے اور دس گیارہ سے پہلے واپس نہ آتے۔

اماں کا رویہ آہستہ آہستہ ابا اور تہمینہ میں بغاوت کے جذبات بھڑکا رہا تھا۔ ابا میں زیادہ شدت سے، تہمینہ میں ہلکے ہلکے مگر دونوں کا لاشعور آہستہ آہستہ کچھ فیصلہ کرتا جا رہا تھا۔

ابا تہمینہ کی شادی صفدر سے کرنا چاہتے تھے مگر اماں ڈٹی ہوئی تھیں "اس گھر میں صفدر دولہا بن کر اسی وقت آئے گا جب میری لاش نکل جائے گی۔" تم گئے چلی کر کہتی ہیں، "تمہاری دادی بے شرم تھیں جو صفدر کے باپ کو داماد بنا کر اب تک زندہ بیٹھی ہیں۔ میں تو اسی وقت زہر کھاؤں گی۔"

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، کچھ بھی نہ ہوگا۔" آپا جیسے کنوئیں کی تہ سے بولیں۔ ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ تہمینہ کا یہ جملہ اس عزم کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو آہستہ آہستہ استحکام پکڑ رہا تھا۔

ایک دن ابا نے بحث کے دوران اماں کی بھاوج کو بھنگن کہا تو اماں نے جواب دیا "میرے بھائی بھاوج کو کچھ کہا تو اچھا نہ ہوگا۔ وہ تم کو جانتی ہے نا، اسی لئے منہ نہیں لگاتی۔

میری وجہ سے چپ رہتی ہے ورنہ کب کا تم کو جیل بھجوا دیتی "۔ جس شخص سے ایسی باتیں ہر وقت کی جائیں اس کی ذہنی کیفیت کیسی ہونی چاہیے اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔

صفدر کا ذکر کرتے ہوئے اماں کہتی ہیں۔ اب آئے تمہارا وہ پنج بھانجہ، اگر بھنگی سے جوتے نہ لگواتے ہوں تو میرا نام نہیں "۔

" ضرور آئے گا اور یہیں اس کی بارات آئے گی "۔

ابا کے اس اعلان کے باوجود تہمینہ جانتی ہے "۔ اماں یہ شادی کبھی نہ ہونے دیں گی اور مجھے بدنامی سے بہت ڈر لگتا ہے اس لئے کچھ نہیں ہو سکتا "۔

بی اے کرنے کے لئے صفدر علیگڑھ چلا گیا۔ وہاں جانے کے بعد اسے منی آرڈر بھیجا گیا۔ وہ بھی اس نے واپس کر دیا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد صفدر کہیں چلا گیا۔ ابا نے بہت سر مارا مگر صفدر کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔ اماں تہمینہ کی شادی کا ذکر ابا سے بار بار کرتیں۔ ابا نے جان چھڑانے کے لئے کہہ دیا، جہاں جی چاہے کر دو۔ انہی دنوں بڑی چچی کا خط آ گیا۔ انہوں نے جمیل کے لئے تہمینہ کو مانگا تھا۔ اماں نے ابا سے پوچھ کر رشتہ منظور کر لیا تھا۔

اس کے دوسرے دن ہولی پر کُسم تہمینہ کے پاس آئی تھی۔ اس کے اگلے دن پتہ چلا کہ کُسم بھاگ گئی۔ اماں کُسم پر لعنت ملامت کر رہی تھیں۔ کُسم کے بھاگنے کے بعد اماں کی فکروں میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

کُسم کے بھاگنے کے بعد تہمینہ کے رویہ میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی آ گئی تھی۔ اسے ایک عجیب پیچیدہ نفسیاتی کیفیت کہا جا سکتا ہے۔ وہ شادی کی باتوں پر ڈھٹائی سے مُسکراتی۔ کیا مجال تھی جو وہ کسی بات پر ذرا سا بھی شرماتی۔ اماں کے سامنے اپنے جہیز کی تیاریوں میں مگن رہتی "ایسے خوبصورت میز پوش اور تکئے غلاف کاڑھ رہی تھی کہ ہاتھ چومنے کو جی چاہتا "۔

یہ ظاہری رویہ اس لئے تھا کہ اندرونی طور پر وہ کوئی فیصلہ کر چکی تھی۔ اسی دوران گھر سے بھاگنے کے کوئی چھ مہینے بعد کُسم اپنے عاشق کے ساتھ واپس گھر آ گئی۔ اماں نے کہا۔

"اگر اس نے میرے گھر کا رُخ کیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گی۔" تہمینہ اس واقعہ سے سخت پریشان ہو گئی۔ وہ ساری رات بے چین رہی۔ رات کو سو بھی نہ سکی۔ صبح اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اگلے دن پتہ چلا کہ وہ آدمی کسُم کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ چند دن بعد کسُم نے خودکشی کر لی۔ اس واقعہ نے تہمینہ کی زندگی میں ہلچل مچا دی۔ کسُم کا سارا قصہ دراصل تہمینہ کی خودکشی والے واقعہ کا پس منظر ہے۔ مصنفہ نے ایک محبت کے پیرایہ میں دوسری محبت کے امکانات کو بیان کیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد آپا کو جانے کیا ہو گیا تھا کہ رات کا زیادہ حصہ جاگ کر گزار دیتیں۔ ان کی صحت خراب ہو رہی تھی۔ رنگ مدھم پڑ گیا تھا اور چہرے پر خشکی دوڑ گئی تھی۔

بڑی چچی کے خط میں جمیل کی تصویر آئی۔ اماں اس تصویر کو لے کر تہمینہ کے پاس گئیں تو اس نے منہ پھیر لیا اور کہا "انسان صرف ایک ہی بار کسی کا ہوتا ہے۔" انہوں نے غصہ سے کہا پھر ایک دم ہنس دیں "سب اکٹھے ہی دیکھیں گے۔" ان کی ہنسی میں کتنی بے بسی تھی۔

ابا کو صفدر کے بارے میں معلوم ہوا تو انہوں نے اماں سے کہا "تمہاری وجہ سے وہ اس گھر کو چھوڑ گیا۔ وہ غلط قسم کی پارٹی کے ساتھ ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے۔ اس کی تباہی کی ذمہ دار تم ہو۔" یہ سُن کر تہمینہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے رات کو عالیہ سے سرگوشیوں میں کہا "مجھے سب معلوم ہے کہ وہ اپنے آپ کو کیوں تباہ کر رہے ہیں۔"

تہمینہ عالیہ سے ایسی باتیں کرتی ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہمینہ فیصلہ کر چکی ہے اور اپنے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار ہو چکی ہے۔ مہندی کے پودے کے بارے میں کہتا ہے: مہندی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے۔ اس سے سہاگ کی مہک آتی ہے۔ محبت کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ اس کی سرخی سے تمناؤں

کے خون کا پتہ چلتا ہے۔" گویا مہندی جہاں سہاگ کا اشارہ ہے۔ وہاں خون کا اشارہ بھی ہے۔ کہتی ہے: "میں کیسی باتیں کرتی ہوں" وہ مسکرائیں "باتیں ہی تو سب کچھ ہوتی ہیں ان ہی باتوں نے مجھے مسافر بنا دیا ہے اور یہی باتیں میرے سفر کو ختم کر سکتی ہیں۔"

اسی دوران میں اماں کے نام صفدر کا خط آیا۔ وہ خط تہمینہ نے کھول کر پڑھ لیا تھا لکھا تھا "چچی تہمینہ کی شادی مبارک ہو۔ آپ اسے کسی کی بھی بنا دیں پھر بھی وہ میری رہے گی۔ وہ صرف میری ہے۔"

اس خط کو پڑھ کر "آپا کے چہرے پر ایسا سکوت تھا۔ جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو۔"

تہمینہ عالیہ سے کہتی ہے "عالیہ بٹو سنو۔ جب میں چلی جاؤں اور تم کو کبھی صفدر ملیں تو میرا ایک پیغام کہہ دینا۔ کہہ دو گی نا" وہ پیغام یہ تھا "یہی کہ میں ان کو کبھی نہیں بھولی اور بس" اسی رات تہمینہ افیم کھا کر خودکشی کر لیتی ہے۔

ابا کی نظر میں تہمینہ کے اس کی تمام ذمہ دار بھی اماں ہی تھیں۔ اس کے بعد میاں بیوی میں فاصلہ اور بھی بڑھ گیا۔ عالیہ کے شکایت کرنے پر وہ کہتے ہیں "تمہاری ماں نے مجھے گھر سے دور کر دیا ہے۔"

اس واقعہ سے ان کی انگریز دشمنی اور بھی شدید ہو گئی۔ یہ دراصل بیوی کے خلاف ایک ردِ عمل تھا۔ اسی زمانے میں ایک انگریز افسر دفتر کے معائنے کے لئے آنے والا تھا۔ اس لئے ابا اس کے ٹھہرنے کے لئے ڈاک بنگلہ وغیرہ ٹھیک کرانے میں لگے ہوتے تھے۔ دفتر سے بھی دیر سے آتے تھے۔ اماں اس موقع پر بھی طنز سے باز نہ رہ سکیں۔ کہتی ہیں "خوب انگریزوں کو گالیاں دیتے ہیں اور اب وہ آ رہا ہے تو مارے ڈر کے سٹی گم ہے حضرت کی۔ زبانی جمع خرچ کرنے میں کیسے تیز ہوتے ہیں لوگ بھی۔"

انہوں نے عالیہ سے کہا کہ رات کے کھانے کا ذرا اچھا سا انتظام کروا دے۔ چھ

سات آدمیوں کا کھانا ہوگا۔ اماں پھر جلتے پر تیل چھڑکتی ہیں "یہ بھی حد ہے خالی خولی نفرت کرتے ہو اور خوشامدیں لگے ہو اس کی۔ لے مجھ سے کہو میں خود دعوت کا انتظام کردوں گی۔"

دفتر میں کسی بات پر اس انگریز افسر نے ابا کو 'ڈیم فول' کہہ دیا۔ وہاں تو پہلے ہی نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ اس ایک لفظ نے آپے سے باہر کر دیا اور انہوں نے اس کا سر پھاڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

یہیں سے اس گھر کا المیہ شروع ہوتا ہے۔ بظاہر اس کے ذمہ دار ابا نظر آتے ہیں، مگر اس عمل کی محرک حقیقی اماں ہیں۔ جن کی انگریز پرستی اور اپنی انگریز بھاوج اور اپنے بھائی کی ہر وقت کی قصیدہ خوانی نے اُن میں انگریزوں کے خلاف ان کی نفرت کو اس قدر ہوا دی کہ وہ ایک ایسی بات کو، جسے وہ شاید عام حالات میں اپنے خاندان کا خیال کر کے برداشت کر جاتے اس نے انہیں اس قدر مشتعل کر دیا کہ اس کا سر پھاڑ دیا۔

ماموں کا رویہ کبھی بھی ہمدردانہ نہیں رہا۔ مگر وہ تو بھائی ہونے کے علاوہ انگریز بیوی کے شوہر بھی تھے۔ اس لئے اماں کو ان کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آجاتی تھی۔ اس واقعہ پر "ماموں کتنی صفائی سے کہہ گئے تھے کہ اقدامِ قتل بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے آدمی کے بیوی بچوں کی سرپرستی کرنے میں انہیں بھی خطرہ تھا۔" مگر اماں کو ان سے پھر بھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔

اس کے بعد بڑے چچا آکر ان سب کو اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ جو کہ ان کا آبائی مکان تھا۔ یہاں سے کہانی میں کئی کردار داخل ہوتے ہیں اور کہانی کا محور اس گھر کا آنگن بن جاتا ہے۔

ان میں سے اہم ترین بڑے ابا کا کردار ہے۔ قصہ میں نمودار ہوتے ہی ان کی عظمت نمایاں ہونے لگتی ہے۔ سب سے پہلے ان کے رویہ کا تقابل ماموں سے ہوتا ہے اور وہ بڑے چچا کے مقابلے میں حقیر نظر آتے ہیں۔ ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہے مگر ان کا ظرف بہت وسیع ہے۔ ان کی زندگی کا اہم ترین پہلو ان کی سیاست ہے۔ وہ کٹر کانگرسی ہیں۔ سیاست میں ان کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان

کی پنڈت نہرو سے ذاتی سطح پر دوستی ہے۔ سیاست میں وہ قربانی اور تیاگ کی اعلیٰ ترین مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ کئی بار جیل جا چکے ہیں۔ بیڑیاں پہنتے پہنتے ان کے پیروں میں گٹے پڑ چکے ہیں۔ پاؤں دھوتے وقت وہ ان سیاہ گٹوں کو بڑے فخر اور پیار سے دیکھا کرتے تھے۔ کانگریس ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ایک معمولی سے لڑکے سے کر دی تھی اس کی واحد خوبی یہ تھی کہ وہ کانگریسی تھا۔ وہ بیوی بچوں کے جھمیلے میں پڑنے کی وجہ سے سیاست سے کنارہ کش ہو گیا تو بڑے چچا کو اس سے نفرت ہو گئی۔ وہ بیٹی کے گھر کبھی نہیں گئے۔ ان کی بیٹی چار عدد بچوں کے ساتھ آنگن میں گوبر تھاپ تھاپ کر زندگی گزار رہی تھی۔

بڑے چچا کے کردار کی عظمت کے سبھی نے گن گائے ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں: "وہ ڈرامے کے نہیں بلکہ ایپک کے کردار ہیں اور اس لئے مکالمے کے بجائے بیانات کے ذریعہ ان کو پیش کیا جاتا ہے۔"

بڑے چچا کا کردار دراصل مصنفہ نے بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ جہاں ان کے سیاسی خیالات اور ان کی قربانیوں کی بنا پر ان کی عظمت کا نقش ابھرتا ہے، وہاں گھریلو ذمہ داریوں سے لاپرواہی ہونے کی بنا پر اس عظمت کا کھوکھلا پن بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ جب وہ خود اپنی دو کانوں کی نگرانی کیا کرتے تھے گھر میں خوش حالی تھی۔ جب وہ سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے تو دوکانیں اسرار میاں کی نگرانی میں لشتم پشتم چلنے لگیں۔ ان کی آمدنی چندوں اور سیاسی ورکروں پر خرچ ہو جاتی۔ گھر والوں کو صرف روکھی سوکھی میسر آتی۔

انہوں نے اپنے بڑے بیٹے جمیل کو ایک مفت کے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اس نے کسی طرح بی اے کیا۔ اس کی انہیں کوئی خبر نہ تھی چھوٹے بیٹے کو بھی جمیل نے اسی اسکول میں داخل کروا دیا مگر وہ جمیل کی طرح ثابت قدم ثابت نہ ہوا۔ آوارہ ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اس کی تباہی کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک بڑے چچا پر آتی ہے۔

ان کے گھر کا یہ عالم تھا: "بڑے چچا جب تک گھر میں ہوتے بڑی چچی اور کریمن بوا مہمانوں کے کھانے کے انتظام میں سارا دن گزار دیتیں۔ بڑے سے پتیلے میں بڑا گوشت سرسوں کے تیل میں پکایا جاتا۔ ہندوؤں کی دکانوں سے پوری ترکاری خرید لی جاتی۔ کریمن بوا ڈھیروں روٹیاں پکاتے ہوئے بڑبڑاتی رہتیں خالص گھی کی خوشبو یاد کر کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو آتے رہتے۔ پھر بھی یہ گھر چل رہا تھا۔ سب کو پیٹ بھر روٹی ضرور مل جاتی۔"

"بڑے چچا سے جب گھر کی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ سرخ پڑ جاتے اجانے کیوں جھینپ کر سب کی طرف دیکھتے دیکھتے اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور بڑی امنگ سے سب کو سمجھانا چاہتے۔ جب ملک آزاد ہو جائے گا تو سب تکلیفیں دور ہو جائیں گی۔ تم لوگ ذرا گہرائی میں جا کر سوچو۔"

بیوی کے علاوہ ان کے سب گھر والے ان کی سیاست سے نالاں تھے۔ جمیل ان ہی کی ضد میں مسلم لیگی ہوا۔ "چھمی" جسے کسی بات کا شعور نہیں ہے۔ وہ بھی بڑے چچا کو کافر چچا کہتی ہے اور گاندھی جی کی شان میں گستاخانہ گیت ان کے سامنے بچوں سے گواتی ہے۔ عالیہ بھی انہیں گھر کی تباہی کا ذمہ دار سمجھتی ہے مگر پھر بھی ان کی محبت اور شفقت کی بنا پر ان کی خدمت بڑے خلوص سے کرتی تھی۔ سیاسی لوگوں کے بارے میں اس کا خیال یہ ہے کہ سارے لوگ کسی سے محبت نہیں کرتے۔ یہ لوگ شادیاں کرتے ہیں، اکیلے ہوتے ہیں اور انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کا اپنا گھر دنیا کے کسی حصے میں شامل نہیں ہوتا۔ ان کے گھر والے انسان نہیں ہوتے۔ یہ محبت کے قدموں کے کانٹے ہوتے ہیں جو ذرا دیر میں لہولہان کر دیتے ہیں۔"

بڑے چچا اتنے بڑے کانگرسی لیڈر رہیں مگر پھر بھی جمیل کو نوکری نہ دلوا سکے۔ حالانکہ اس وقت کانگریس کی وزارت بھی بن گئی تھی۔ جمیل کی بات

اپنی جگہ درست ہے۔ وہ کہتا ہے "جب آپ کو ایک گھر کا خیال نہیں تو اتنے بڑے ملک کے لاتعداد بہت سے گھروں کا آپ کس طرح خیال کریں گے۔"

دراصل بڑے پچا ایک آئیڈیل انسان ہیں۔ وہ ایثار و قربانی کی اعلےٰ ترین مثال پیش کرتے ہیں۔ بیشتر سیاست داں عملی انسان ہوتے ہیں وہ اپنے گھریلو اور قومی مفاد میں توازن برقرار رکھتے ہیں۔ بڑے پچا کا مطمحِ نظر صرف قومی مفاد ہے۔ اسی لئے وہ خود کو اور اپنے ساتھ سارے خاندان کو تباہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے انہیں ایپک کردار کہا ہے۔ مگر ایپک کردار یعنی ایپک ہیرو تو عموماً اپنی جنگ میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ بڑے پچا تو ناکام انسان کی مثال پیش کرتے ہیں وہ ایپک کے نہیں بلکہ المیہ کے ہیرو نظر آتے ہیں المیہ کے پیکروں کی طرح ان کی تباہی ان کی ہی غلطی کی بنا پر واقع ہوئی ہے وہ صدقِ دل سے ہندو اور مسلمان کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ مگر متعصب ہندو ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کی سچی کانگریسیت کے باوجود انہیں قتل کر دیا گیا ویسے تو مصنفہ نے کانگریسیوں کو اچھے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مگر بڑے ابّا کے قتل کے ذریعے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں تھے۔ جو مسلمان کسی مغالطے میں تھے۔ انہیں بڑے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑا۔

نجی اور قومی ذمہ داریوں اور فرائض کو ایک ساتھ سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بڑے پچا ایک ناکام انسان نظر آتے ہیں۔ مگر ان کی اخلاقی عظمت مسلّم ہے۔ وہ ایثار و قربانی کی علامت ہیں۔ کانگریس نے ایسے بہت سے لیڈر پیدا کئے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنی جدوجہد کے دوران ایسے نمونے پیش نہیں کئے۔ اس کی سزا یہ ملک آج تک بھگت رہا ہے۔

بڑے پچا بڑے عالی ظرف انسان ہیں۔ ان کے گھر کا خرچ ویسے ہی شتم پشتم

چل رہا ہے۔ مگر وہ بغیر کسی تامل کے اپنے بھائی کے بے سہارا خاندان کو اپنے ساتھ لے آئے۔ چھمی کی ساری بدتمیزیوں کے باوجود وہ اسے پناہ دیئے ہوئے ہیں۔ اسرار میاں کو کریمن بُوا تک حقیر سمجھتی ہیں مگر وہ ان سے بھائی کی طرح پیش آتے ہیں۔ ان کی بیوی کے علاوہ ان کی سیاست سے سب نالاں ہیں۔ ان سے سب سے زیادہ نفرت شاید عالیہ کی ماں کرتی ہے ۔۔۔ وہ انہیں پورے خاندان کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔

بڑے چچا کا بیشتر تعلق آنگن کی باہر کی دنیا سے رہا تھا۔ آنگن کی محافظ اور اس کی ساری پریشانیوں کو جھیلنے والی بڑی چچی تھیں۔ وہ بڑے چچا کی شایان شان رفیقۂ حیات ہیں۔ ان کے کردار میں بھی ایک عجیب عظمت پائی جاتی ہے۔ وہ سب کی شکایتیں برداشت کرتی ہیں۔ سب کے طنز سہتی ہیں۔ اُن کے پاس کچھ بھی نہیں۔ مگر شفقت سب کے لئے ہے عالیہ کو بڑی چچی اس گھر میں عبرت کی لاش معلوم ہوتیں۔ " ان کی آنکھوں میں جیسے صدیوں کا دکھ سمایا ہوا تھا۔ اتنی بہت سی جانوں کی فکر صرف ان کے کاندھوں پر سوار رہتی۔"

انہیں عالیہ کی ماں کے مقابل رکھ کر دیکھا جائے تو ان کی عظمت اور بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ عالیہ کا ابھی تو نتیجہ بھی نہیں نکلا مگر اس کی ماں کا رویہ یہ ہے: "بس اب تم جلدی سے ملازمت کی درخواستیں دینے لگو، میں بھر پائی ان مصیبتوں سے، اس اجڑے گھر میں جانے کس طرح دن گزارے ہیں، کبھی پیٹ بھر کھانا نہ ملا۔" اماں نے بڑی بے باکی سے کہا۔ اس وقت وہ بڑی مغرور نظر آرہی تھیں۔

"ارے چھوٹی دلہن! میں نے تو اپنی جان سے زیادہ تمہارا خیال رکھا ہے۔ اور ۔۔۔۔۔۔" بڑی چچی سے کچھ کہتے نہ بن پڑ رہی تھی۔

"بس جناب آپ کے خیال کا شکریہ اب آپ لوگ میری جان بخش دیں اور احسان نہ جتائیں۔ مجھے پتہ تھا کہ ایک دن یہی سننا ہوگا۔"

وہ غریب اتنا سن کر بھی خاموش رہتی ہیں۔ اگر عالیہ کو اپنی ماں قصہ کہانیوں کی ڈائن معلوم ہوتی ہیں تو اس کے مقابلے میں بڑی چچی کو ایثار اور برداشت کی دیوی کہا جا سکتا ہے۔

تقسیم کے بعد جب عالیہ کی ماں عالیہ کو لے کر پاکستان جانا چاہتی ہیں تو بڑے چچا اتنی سختی سے منع کرتے ہیں "کوئی نہیں جا سکتا میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں نکال سکتا۔" انہیں آزادی کے بعد ہندوستان سے بڑی توقعات ہیں۔ اپنی خدمات کا صلہ ملنے کی امید ہے۔ عالیہ کی ماں تڑ سے جواب دیتی ہیں "ماشاءاللہ آپ بڑے حق دار بن کر آ گئے نہ کھلانے کے نہ پلانے کے، کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا۔ میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا۔ آپ ہی نے انہیں مار ڈالا۔ میری لڑکی کو یتیم کر دیا۔"

عالیہ کا نتیجہ بھی نہ نکلا تھا نہ پاکستان بنا تھا۔ اُسی وقت ان کے منصوبے کتنے خطرناک تھے۔ ملاحظہ کیجئے "میں کہتی ہوں اب تم علی گڑھ جانے کا خیال چھوڑ ہی دو۔ خدا جمیل کو خیریت سے واپس لے آئے، میں تمہارے ماموں سے سب روپے لے کر اسے دے دوں گی۔ تمہارے چچا کی یہی دکانیں کچھ دن اور چل نکلیں گی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس نے میرا ہمیشہ ادب کیا ہے۔ خدا اسے خوش رکھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں نے کہا تو جنگ سے آنے کے بعد تمہارے ماموں ضرور اسے کوئی بڑا عہدہ بھی دلا دیں گے۔ رہے تمہارے بڑے چچا اور اسرار تو میں انہیں جلد ہی اس گھر سے چلتا کر دوں گی، بنا بنایا گھر ہے۔ حویلی سے کچھ کم تو نہیں۔ سب تمہارے نام لکھوا دوں گی۔"

بڑی چچی کی مسکینی اور بردباری کی وجہ عالیہ کی ماں کے نزدیک یہ ہے کہ وہ غریب گھر کی تھیں۔ اسی لئے تو انہوں نے بڑی مالکن کے ظلم بھی سہے، مگر حقیقت

یہ ہے کہ ان کی برداشت اور قربانیوں کی وجہ کسی حد تک تو ان کی افتادِ طبع اور کسی حد تک بڑے چچا کے کردار کا اثر ہے۔

کُسم کا قصّہ بھی بڑا دردناک ہے۔ اس کے ننھے ننھے گورے گورے پاؤں چاند کے دو ٹکڑے معلوم ہو رہے تھے اور اُس کی لانبی موٹی آنکھوں میں کیسی آپسی کی کیفیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے دیولوک کی کسی دیوی نے انسانوں میں اپنا ظہور کیا ہے، اور اپنی جان کی قربانی دے کر ہندو سماج کو اس کے ظالمانہ رواج کی شکل دکھا کر واپس لوٹ گئی ہو۔ کیا ایسی حسین لڑکی اس لائق تھی کہ وہ ایسے انجام سے دوچار ہو۔ بھاگنے سے ایک دن پہلے ہولی کے تہوار پر عالیہ کی ماں سے کہتی ہے: "جی چاہتا ہے کہ خوب رنگ کھیلوں موسی، رنگین ساری پہنوں، من کو مارنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے، پر بتی نے تو یہ کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔" مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی تھی کیونکہ وہ تو "ودھوا" تھی۔ تقسیم سے پہلے ہندو سماج میں بیوہ کی دوسری شادی کا رواج بہت کم تھا۔ کُسم کا گھر سے بھاگ جانا، پھر اپنے عاشق کے ساتھ گھر لوٹ آنا، اس کا چھوڑ کر بھاگ جانا، پھر اس ذلت سے نجات حاصل کرنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ کُسم خودکشی کر لیتی ہے۔ اس کا قصہ ایک طرف تو ہندو سماج کو اس کے ظالمانہ رواج پر تنبیہہ کرتا ہے اور دوسری طرف تہمینہ کی محبت کے ایک امکان کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ اسی لئے عالیہ کی ماں کُسم کے انجام سے ڈر جاتی ہے۔ تہمینہ کو خودکشی کی طرف آمادہ کرنے میں کُسم کی خودکشی کا کافی دخل حاصل ہے۔

اسرار میاں کا وجود زمینداری نظام کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ بڑے چچا، ان کے بھائی اور اسرار میاں سب ملک منظفر مرحوم کی اولاد ہیں۔ مگر ان میں یہ فرق کس قدر اہم بن جاتا ہے کہ اسرار میاں داشتہ کی اولاد ہیں اور بڑے چچا اور ان کے بھائی بیاہتا بیوی کی اولاد ہیں۔ یہ بھی بڑے چچا کا اخلاق ہے کہ انہیں گھر میں رکھ رکھا ہے۔ صرف وہی انہیں عزت دیتے ہیں اور بھائی سمجھتے ہیں۔ اُن کے علاوہ صرف عالیہ

کو ان سے ہمدردی ہے ۔" عالیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی باہر چبوترے پر جا بیٹھے ۔ اسرار میاں کی باتیں سُنے ۔ انہیں پاس سے دیکھے ، وہ کس طرح بولتے ہیں ، وہ کیسی باتیں کرتے ہیں ۔ وہ جو اُس کے دادا کی بدنیتی کا نتیجہ ہیں ۔ ان کی آنکھوں میں کون سی کیفیت ہوگی اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد کون سے اثرات ان کے چہرے پر لرزاں ہوں گے ۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے ۔ اور جب وہ یہ سب کچھ معلوم کرلے گی تو ایک بار چپکے سے اسرار چچا سے کہے گی ، انہیں بتائے گی ، وہ بھی انہیں بڑے چچا کی طرح عزیز ہیں ۔ اور وہ ان کی بے حد عزت کرتی ہے ، اور زندگی میں ایک بار ان کی خدمت کرنا چاہتی ہے اور وہ ان کے دل سے ان تمام تیروں کو کھینچ کر پھینک دے گی جو کریمن بُوا نے پیوست کئے ہیں ۔

ان کے علاوہ گھر میں کوئی ان کی عزت نہیں کرتا کہ گھر میں ان کی حیثیت نوکروں سے بھی بدتر ہے ۔ کریمن بُوا انہیں بے انتہا ذلیل کرتی ہے ۔ وہ غریب روزہ بھی اتنی دیر سے کھولتے ہیں کہ وہ مکروہ ہو چکا ہوتا ہے ۔ بے چاروں کو بھوک بھی لگی ہوتی ہے تو بڑی نحیف آواز میں کہتے ہیں ۔" سب کھا چکے ہوں تو مجھے کھانا بھجوا دو کریمن بُوا ۔" کریمن بُوا کہتی ہے ۔" ذرا صبر سے کام لیا کرو اسرار میاں صاحب کیا گھر والوں سے پہلے تمہاری کشتی سجا کر بھیج دیا کروں ۔" بقول مصنف اس " اسرار میاں صاحب " میں کتنا طنز چھپا تھا ، کیا مذاق قہقہے لگا رہا تھا ۔

بڑی مالکن کی وفات کے بعد جب میت اٹھانے کے لئے مرد اندر آتے تو اسرار میاں سب سے آگے تھے ۔ کریمن بُوا فوراً چلائیں ۔" خبردار زندگی میں مالکن نے منہ نہ لگایا ۔ اب ان کی لاش خراب کرنے آئے ہو ۔" یہ رویہ اس غریب کے ساتھ تھا جو بڑے بھلے دوکان سنبھال رہا تھا اور جس کی بدولت پورے گھر کو اور خود کریمن بُوا کو روٹی مل رہی تھی ۔ اسے کھانا دیتے وقت کریمن بُوا بڑبڑاتی ہیں ۔" گھر والوں کی تو یہ چڑیوں جیسی خوراکیں رہ گئی ہیں اور اسرار مسٹنڈا اتنا کھائے

کہ پکا پکا کر ہاتھ ٹوٹ جائیں"۔

اسرار میاں کے کردار کے ذریعہ مصنفّہ نے ہمارے معاشرے کے ایک اہم رویہ پر بھرپور طنز کیا ہے۔ ناجائز اولاد پیدا کرنے والے شریف ہی کہلاتے رہتے ہیں مگر وہ ناجائز اولاد جو بہرحال ان کی اولاد ہوتی ہے۔ معاشرے میں کوئی مقام نہیں پاتی۔ کریمن بُوا کو اسرار میاں سے اتنی چڑھ تھی کہ بڑے چچا کے قتل کے بعد انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ پھر پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گئے۔

کریمن بُوا کے تذکرے کے بغیر اس نظام کی تصویر ادھوری رہ جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں حق نمک کو کس قدر اہمیت دی جاتی تھی، کریمن بُوا اس کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ ان کی ماں بڑی مالکن کے جہیز میں آئی تھی۔ کریمن بُوا بڑی ہوئی تو اسس کی شادی گھر کے نوکر سے کر دی۔ مالکن کی خدمت میں کمی ہوئی تو انہوں نے اسس کی پٹائی کر دی۔ اس وقت تک اس کے نشانات موجود تھے" ان کی پیٹھ پر سیاہ نشان تھے اور ایک جگہ سے سفید سفید چربی نکلی ہوئی تھی"۔ یہ سارے ظلم سہنے کی وجہ کریمن بوا کا یہ تصور تھا "میں نے ساری زندگی ان کا نمک کھایا تھا اور اب بھی انہی کی اولاد کا نمک کھا رہی ہوں۔ نمک کا بڑا حق ہوتا ہے بٹیا عالیہ۔ میری ماں اللہ انہیں جنت نصیب کرے، کہتی تھیں کہ جس نے نمک کا حق ادا نہ کیا۔ وہ خدا کے یہاں بھی معاف نہ کیا جائے گا۔ مالکن! کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا مجھے، دوسری دنیا میں تو سکھ کی سانس لے سکوں"۔ شاید حقِ نمک کا یہ تصور بھی خود شرفا ہی نے اپنے ملازموں میں پیدا کیا ہوگا۔

اس گھر کی حالت بہت خستہ ہو چکی ہے، وہ کبھی اس گھر سے بیزار نہ ہوئیں، نہ انہیں کبھی کام سے تھکتے ہوئے دیکھا گیا۔ بگڑتے ہوتے وقت کے ساتھ ان کا احترام کرنے کا طریقہ کبھی نہ بگڑا۔ کیا مجال تھی جو کبھی اونچی آواز سے بات کی ہو۔

ہر موقع پر وہ پرانے زمانے کو بہت بڑی جذباتیت کے ساتھ یاد کرتی ہیں۔ سردی زیادہ پڑ رہی تھی تو کہتی ہیں: "عالیہ بٹیا، اس گھر میں جاڑے کے دنوں میں اپنے ان ہاتھوں سے منوں لکڑی پھونک دیتے تھے۔ ارے یہ دالان جو آج ٹھنڈا پڑا ہے پہلے آگ کی طرح تپتا تھا۔"

چھمی کی شادی کے موقع پر میراثنیں گا رہی تھیں۔ اس وقت بھی کریمن بوا کو اپنے مالک کے زمانے کی شادیاں یاد آ رہی تھیں: "مالک کے زمانے میں تو دس دس دن تک گھر کے باہر مجرا ہوتا تھا۔ سب سے اچھی رنڈیاں آتی تھیں۔ گھر میں مہینہ مہینہ پہلے ڈھول لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب گھر سے باہر جاتیں تو ان کی جھولیاں روپوں سے بھری ہوتیں۔ واہ کیا زمانے تھے۔"

چھمی کا جہیز دیکھ کر کریمن بوا کہتی ہیں: "اچھے زمانے میں تو ایسا جہیز باندیوں کی بیٹیوں کو دے کر رخصت کیا گیا تھا۔"

عالیہ کی ماں اور عالیہ جب پاکستان جانے کی تیاری کر چکیں تو انہوں نے بڑے خلوص سے کریمن بوا سے بھی کہا، مگر انہیں تو اس وقت بھی حق نمک روکے ہوتے تھا، کہتی ہیں: "اب تو یہی دعا کریں چھوٹی دلہن کہ اس گھر سے لاش نکلے میری۔ آج یہاں سے چلی جاؤں تو مرنے کے بعد مالکن مرحومہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ اپنے جیتے جی جہاں بٹھا گئیں، وہاں سے کیوں کر پاؤں نکالوں۔"

تقریباً سب ہی نقادوں نے چھمی کو اس ناول کا سب سے توانا کردار کہا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ مقناطیسی قوت کسی میں نہیں ہے، دراصل اس کی قوت کا راز اس میں ہے کہ وہ جاہل ہے۔ اسی لئے اس کے شعور اور لاشعور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہ اس کی زبان پر آ جاتا ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتی۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کرنے کے

بعد اسے بڑے چچا کے یہاں چھوڑ دیا ہے۔ وہی اس کا ہر طرح کا خیال رکھتے ہیں مگر وہ انہیں بھی نہیں بخشتی۔ سیاست میں وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کی۔ اسی لئے وہ بڑے چچا کو کافر چچا کہتی ہے۔ انہیں چڑانے کے لئے اس نے ایک گیت یاد کر رکھا ہے جس میں گاندھی جی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ وہ اسے گا گا کر سناتی ہے اور بڑے چچا تلملا کر رہ جاتے ہیں۔

اس کے باپ نے اپنی والدہ کی موت پر آنے سے معذرت کر لی۔ اس پر بھلا وہ کب چوک سکتی تھی "ہاں اب آنے کا کیا فائدہ۔ ایک دن کے لئے بیوی کے پہلو سے الگ ہو کر انہیں کب قرار آتا۔ میرا بس چلے تو اپنے والد صاحب قبلہ کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دوں!" اسے انتہائی بدتمیز ظاہر کیا گیا ہے مگر ایسے مہذب گھرانے میں اس درجہ کی بدتمیزی اور بے حیائی عجیب سی لگتی ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائیوں کو "پلے" کہہ کر پکارتی ہے۔

اس کے والدین نے اس کے عید کے جوڑے کے لئے پانچ روپے کا منی آرڈر کیا تو اس نے اس کے پرزے پرزے کر دیئے۔

عالیہ کے آنے سے پہلے جمیل "چھمی" میں دلچسپی لیتا تھا۔ عالیہ کے آنے کے بعد اس کی توجہ کا رخ بدلتے دیکھ کر "چھمی" بھلا کب چپ رہ سکتی تھی۔ اس نے عالیہ پر طنز کیا اور جمیل پر بھی "ان کے دھوکے میں نہ آئیے گا بجیا، یہ پہلے مجھ سے عشق کرتے تھے اور اب آپ سے۔" "چھمی" کے لئے گھر سے جو روپے آتے تھے اس میں سے پانچ روپے بڑی چچی کو دینے کے بعد وہ سارے پیسے جمیل کو دے دیا کرتی تھی۔ برسوں اس نے ایک کپڑا بھی نہیں بنوایا۔ اس کا خیال تھا کہ اس ہی نے اپنے پیسے سے جمیل کو بی۔ اے کروایا تھا۔ جمیل بھی اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ "چھمی" کہتی ہے "یہ دنیا سچ مچ بڑی بری ہے بجیا، جمیل بھیا بھی تو بی۔ اے کرنے کے بعد بدلے بدلے نظر آنے لگے ہیں۔ اگر میں ان کے پاس زیادہ بیٹھتی ہوں تو بہانوں سے اٹھا دیتے ہیں۔ سب کچھ بھول گئے نا، اور اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہا انہیں، سب کے سامنے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں

خیر کرتے رہیں۔ میں بھی تو کوئی کُتیا نہیں ہوں جو اُن کے پیچھے پھروں۔" اس کا نظریہ یہ ہے "بھئی جو ہم سے محبت کرے گا ہم اس سے کریں گے۔ یہ تو بدلہ ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"

اب ذرا چھمی کی عمر پر بھی غور کیجئے۔ اس وقت عالیہ کی عمر چودہ سال سے قریب ہے چھمی اس سے کئی سال چھوٹی لگتی ہے۔ پھر اس عمر میں محبت کے اتنے مرحلے طے کر لینا خلافِ قیاس لگتا ہے۔

شاید جمیل کے رویہ کے ردِ عمل کے طور پر چھمی نے تھانیدار کے بیٹے منظور سے محبت کا سلسلہ شروع کر دیا۔۔۔۔ خط و کتابت شکیل کی معرفت ہوتی تھی۔ ایک دن شکیل نے بھانڈا پھوڑ دیا تو سب کو تشویش ہونے لگی کہ چھمی کوئی گل نہ کھلا بیٹھے۔ منظور فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا تو چھمی کا یہ سہارا بھی جاتا رہا۔ وہ تھوڑے عرصے کے لئے اُداس ہو گئی۔

جب بڑے چچا نے چھمی کی شادی کی بات طے کی تو سب کو ڈر تھا کہ اُن کی کِرکِری نہ کر دے مگر چھمی اس طرح خاموش رہی کہ سب کو تعجب ہو رہا تھا۔ اس کی ساری خاموشی اور اور بدتمیزی ایک دم غائب ہو گئی۔ نکاح کے وقت بھی اس نے نہایت آسانی کے ساتھ "ہوں" کر دی۔ دراصل چھمی کا رویہ اس کی تمناؤں کا خون ہونے کے خلاف ایک ردِ عمل تھا۔ وہ جسے چاہتی تھی وہ نہ مل سکا تو اس نے زندگی ہی سے دل چسپی چھوڑ دی۔

شادی کے بعد چھمی کی سسرال والے پاکستان جانے لگے تو چھمی نے انکار کر دیا جھگڑا یہاں تک بڑھا کہ چھمی نے اپنی ساس کو بال پکڑ کر خوب مارا اور اس کی ساس نے اپنے بیٹے سے اسی دم طلاق دلوا کر چھمی کو مع اپنی لڑکی کے گھر بھجوا دیا۔

ادھر جمیل بھی عالیہ کو پانے میں ناکام ہونے کے بعد واپس چھمی کو اپنانے پر آمادہ ہو گیا۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ چھمی بہت خوش تھی۔ اس نے عالیہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے خط لکھا اس میں یہ اہم بات بھی لکھی کہ اس کے پاکستان جانے سے انکار کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح وہ جمیل کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ "وہ ظالم لوگ مجھ سے سب کچھ چھینے لے رہے تھے۔"

شادی کے موقع پر اس کے خاموش رویہ کی وجہ دراصل جمیل کی محبت ہی تھی۔

ناول اب کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے مگر بعض لوگ اب بھی ناول میں وہی پرانا ڈھانچہ تلاش کرتے ہیں۔ آخر میں ہیرو ہیروئن کی شادی ہو۔ برے افراد اپنی سزا کو پہنچیں۔ یہ باتیں نہ ہوں تو انہیں ناول کا انجام پسند نہیں آتا۔ ناول تو دراصل زندگی کی تخئیلی پیش کش ہوتا ہے۔ زندگی میں نہ کوئی ہیرو ہوتا ہے نہ کوئی وِلن، بلکہ عام انسانوں جیسے انسان ہوتے ہیں۔ ناول میں ان انسانوں میں تھوڑا سا آب و رنگ بھر دیا جاتا ہے تاکہ یہ اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین لکھتے ہیں "مرکزی کردار عالیہ جس سے قاری کو ناول پڑھتے وقت خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایسے عالم میں رہ گیا ہے کہ ہم اسے نہ ویران و مایوس کہہ سکتے ہیں اور نہ کامیاب و کامران"۔ اگر غور کریں تو ناول میں عالیہ کی حیثیت بڑی عجیب و غریب نظر آتی ہے۔ وہ حقیقتاً کردار نہیں بلکہ ایک Device ہے۔ جس کے ذریعے مصنفہ نے اپنی کہانی بیان کی ہے۔ اس کے گرد تقدس کا ایک ہالہ ہے۔ وہ اس پورے ماحول میں سب سے بلند نظر آتا ہے۔ چھوٹی عمر ہی میں حالات کے تحت وہ کافی بڑی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اسے تو ہر مسئلہ کو نہ صرف بیان کرنا بلکہ اس پر تبصرہ بھی کرنا ہوتا ہے۔ ایسے کردار کو کسی کی محبت میں آ، تو وہ کس طرح کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح اس کی غیر جانبداری مجروح ہو جاتی۔

اپنے آبائی مکان میں آنے کے بعد جمیل جو بقول چھمی کے، اس سے عشق کرتا تھا، اب عالیہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ تہمینہ کے انتقال کے بعد ایک فطری بات یہی تھی کہ جمیل کی شادی عالیہ سے طے کر دی جائے۔ جمیل اسے چوم بھی لیتا ہے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمیل جیسا غیر مستقل مزاج انسان اس کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ وہ دراصل چھمی ہی کے لائق تھا۔

عالیہ بھی کسی حد تک آئیڈیلسٹ ہے۔ وہ بڑے چچا سے بھی ان کے بلند نصب العین ہی کی بنا پر محبت کرتی ہے۔ صفدر کو بھی محبت میں ثابت قدم، اصولوں پر قائم رہنے

والے اور ان کی خاطر قربانی دینے والے انسان کی حیثیت سے وہ عزت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ صفدر نے جب علی گڑھ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کی خاطر بھیجے ہوئے روپے واپس کر دیئے تھے تو عالیہ نے شاید اسے خودداری سمجھ لیا تھا۔ پاکستان میں صفدر سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ اس کے لئے تہمینہ کی جگہ لینے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اس کی ماں اسی طرح صفدر سے نفرت کرتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی مخالفت کرنے کی عادی نہیں ہے مگر وہ ہمت کر کے کہہ دیتی ہے "یہ نہیں جائیں گے اماں! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ ہمیشہ میرے پاس رہیں گے۔ آپ ہم دونوں کو ایک کر دیجئے۔" اماں پھر خفا ہو کر کہتیں "لعنتی تم اتنی دیر سے یہاں بیٹھے عالیہ کو یہی پٹی پڑھا رہے تھے۔ تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ۔"

"میں تہمینہ آپا کی طرح گونگی نہیں ہوں، اماں یہ نہیں جائیں گے۔"

صفدر جو پاکستان میں بھی سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل جا چکا ہے۔ کہتا ہے۔ "چچی! آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ میں آپ کی خدمت کروں گا۔ میں نے اپنی زندگی کی ڈگر کو بدل دیا ہے۔ دنیا تباہ ہوتی ہے تو تباہ ہو جائے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میں اب صرف دولت کماؤں گا۔ میں اب کار کوٹھی کے خواب پورے کروں گا۔ میں اب جیل نہیں جا سکتا۔ بس اب امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہت جلد مل جائے گا۔"

عالیہ نے صفدر کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا۔ وہ ایک دم زمین پر آ رہا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے ایسا انسان نہیں چاہئے تھا جو اصولوں کا سوداگر کے دولت کے پیچھے دوڑے۔ وہ تو قربانی دینے والوں کی پرستار رہی ہے۔ کیمرہ کی اس آنکھ کو یا آئیڈیلزم کی اس علامت کو اگر آپ ہیروئن تصور کرنے پر مصر ہیں تو آپ ڈاکٹر احسن فاروقی کے ہمزبان ہو کر کہہ سکتے ہیں "اردو کے کسی ناول کی کوئی ہیروئن اس سے زیادہ دل آویز نہیں ہوئی ہے اور نہ اتنے اونچے اخلاقی درجے ہی پر دکھائی دیتی ہے۔"

وہ چھیتی کے تقدس سے جل جانے یا اسے رقیب سمجھنے کے تصوّر سے ماورا ہے۔

ناول کی کہانی کو پاکستان لانا کچھ کھٹکا سا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس سے چند باتیں سامنے لائی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ دکھایا گیا ہے کہ یہاں آ کر بعض لوگوں نے جھوٹے بیانات دے کر اثر و رسوخ سے کوٹھیاں الاٹ کروالیں اور اچھی ملازمتیں ہتھیالیں۔ صفدر جیسے انقلابی اور اشتراکی کا اپنے اصولوں کا سودا کر کے کار اور کوٹھی کے پھیر میں پڑ جانے سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہاں آ کر بہت سے ایسے لوگوں نے یہی رویّہ اختیار کیا۔ لیکن ہندوستان میں بھی اسی طرح بہت سے انقلابیوں نے خوب پیسے کمائے۔

خدیجہ مستور نے یہ ناول اپنے آخری زمانے میں لکھا۔ اس وقت تک افسانہ نویس کی حیثیت سے انہیں خاصی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ انہیں زبان و بیان پر کافی عبور حاصل ہو چکا تھا۔ اسی لئے ان کی یہ تصنیف ایک بھرپور ناول کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آیا۔ ان کا دوسرا ناول اس کے مقابلے میں بہت پھیکا ہے۔ کاش انہوں نے بھی ایملی برانٹی کی طرح زندگی میں ایک ہی ناول لکھا ہوتا اور وہی ان کی ابدی زندگی کا ضامن ہو جاتا۔

بعض نقادوں کی طرح اسے اردو کا بہترین ناول قرار دینا ایک غیر محتاط فیصلہ ہے لیکن اسے اردو کے چند بہترین ناولوں میں یقیناً شمار کیا جائے گا۔

اداس نسلیں

عبداللہ حسین

۶۴۶ صفحے کے ناول کے بارے میں صرف اچھے یا برے حکم لگانا ممکن نہیں۔ اتنے طویل ناول میں خوبیاں بھی ہوں گی اور خامیاں بھی۔

ناول ایک مربوط کہانی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا قصہ کتنے ہی حصوں پر مشتمل کیوں نہ ہو اور کتنے ہی ملکوں سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ مگر یہ ضروری ہے کہ یہ سب کچھ ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہو۔

یہ ناول چار حصوں پر مشتمل ہے ایک حصہ روشن محل کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا روشن پور سے اور تیسرا حصہ جنگ عظیم اور اس کے واقعات سے چوتھا حصہ تقسیم ہند کے بعد کے واقعات سے شروع ہو کر پاکستان آکر ختم ہوتا ہے۔ مصنف نے چند کرداروں کی مدد سے ان چاروں حصوں کو مربوط کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ چاروں حصے مل کر ایک "اجتماعی کل" کی شکل اختیار نہیں کر پاتے

اور ان کے درمیان کے جوڑ ہر کوشش کے باوجود دکھائی دیتے ہیں۔

ناول پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے مرکزیت کس حصّہ کو حاصل ہے اس کا تعین کرنے میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت پیش نہیں آتی اس لیے کہ کہانی کہیں بھی سفر کیوں نہ کر رہی ہو مصنف اپنے مخصوص منصوبے کے تحت روشن پور کا حوالہ دے کر اسے مربوط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دیہاتی زندگی پر تقریباً سوا سو صفحے صرف کیے گئے ہیں کم و بیش اتنے ہی صفحے روشن محل کی زندگی سے متعلق ہیں۔ روشن محل کا روشن پور سے یہ تعلق ہے کہ اس گاؤں کے زمیندار یعنی مالک یہاں رہتے ہیں مصنف کے نزدیک شاید یہ تعلق کافی نہیں تھا اس لیے انھوں نے یہاں کے ایک ماڈرن کسان کی شادی روشن محل کی عذرا سے کرادی اور اس رشتہ کی ناہمواری کو دور کرنے کے لیے دونوں خاندانوں میں قدیم قرابت بھی پیدا کردی۔

اس ناول کے مطالعے کے دوران قاری برابر یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ مصنف کی ہر تدبیر کے باوجود یہاں تک کہ نعیم کو وکٹوریہ کراس دلانے کے باوجود طبقاتی فرق ان کے رشتے میں برابر نمایاں ہوتا رہتا ہے اور یہ رشتہ محل میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔

اس مقام پر ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اگر مقصد دیہاتی زندگی کی پیشکش تھی تو اس قدر تفصیل کے ساتھ

روشن محل کی زندگی، پھر جنگ عظیم کے حالات اور اس سلسلے میں مختلف ممالک کی تصویریں۔ فیکٹری اور مزدوروں کی زندگی وقت کی سیاست، جلیانوالہ باغ کا واقعہ، دہشت پسندوں کی سرگرمیاں پرنس آف ویلز کا دورہ ہندوستان، مظاہرے وغیرہ کو اس قدر پھیلاؤ کے ساتھ پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اس سوال کا جو جواب خالد اختر نے اپنے تبصرہ میں دیا ہے وہ قرین قیاس لگتا ہے۔ انھوں اسے اسے پینورامک ناول اور بلاک بسٹر ساگا قسم کا ناول کہہ کر پکارا ہے۔ شاید مصنف کے پیش نظر یہی مقصد رہا ہو اس لیے انھوں نے اپنے قصہ کے لیے بہت وسیع کینوس استعمال کیا۔ ایسی کوشش سرشار بھی کر چکے ہیں مگر ان کے یہاں بھی زندگی اسی حصہ میں پائی جاتی ہے جہاں لکھنؤ ان کے ساتھ رہتا ہے اس کے باہر وہ ناکام رہتے ہیں۔ اس کے باوجود بقول بعض وہ تو جینئس تھے اپنی تمام خامیوں کے باوجود اپنی اس ناول نما داستان میں وہ اس قدر زندہ کردار ہمیں دے گئے ہیں کہ متعدد ناول مل کر بھی اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ عبداللہ حسین کے قلم میں وہ توانائی اور صلاحیت نہیں ہے۔ انھوں نے پانچ سال میں اس ناول کو مکمل کیا مگر نتیجے کے اعتبار سے اس کی اس ساری محنت کو زیادہ سے زیادہ ایک مستحسن کوشش ہی کہہ سکتے ہیں۔

سب سے زیادہ جو حصہ سب ہی کو کھٹکتا ہے وہ روشن محل کی زندگی ہے۔ نواب اور جاگیردار ہر جگہ اور ہر صوبے میں تھے مگر مغلیہ تہذیب کی آخری جھلک جہاں نظر آتی ہے وہ اودھ کے تعلقدار تھے۔ سرشار نے ان کی زندگی کا کھوکھلا پن اور اس کا مضحکہ خیز پہلو پیش کیا ہے۔ ان کی شان، ان کی رکھ رکھاؤ اور تہذیب کا رچاؤ رسوا اور ان کے بعد قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے ہندو یا مسلمان ہونے سے

یہاں زیادہ فرق نہیں پڑتا - ان کے رسم و رواج عادات و اطوار و گفتگو مشاغل لباس سب یکساں ہیں - یہ لوگ زیادہ دولت مند بھی نہیں ہیں مگر ان کو دولت کمانے کے لیے بھی کچھ نہیں کرنا پڑتا اس لیے قرۃ العین کے کردار بھی کچھ نہیں کر پاتے آپ انھیں اکثر باتیں کرتا ہوا پاتے ہیں - ان کی باتیں خوبصورت اور بے ضرر ہوتی ہیں۔

ان تعلقہ داروں کی نستعلیق زندگی اور قرۃ العین کے بیان میں جو رومانی حسن ہے اس نے عبداللہ حسین کو یقیناً متاثر کیا ہے۔ عبداللہ حسین کو اس زندگی کا براہ راست کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے قرۃ العین کی طرف رجوع کیا۔ اگر وہ صرف رجوع ہی کرتے تو اتنی خرابی پیدا نہ ہوتی۔ انھوں قرۃ العین کو مسلط کر لیا۔

خالد اختر کے اس بیان میں کافی صداقت ہے کہ "اداس نسلیں" کے باب کے باب "میرے بھی صنم خانے" کی کامیاب پیروڈی کے طور پر پڑھے جا سکتے ہیں اور مس حیدر کے شہرہ آفاق ناول سے اٹھائے ہوئے لگتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا۔ قرۃ العین کے کردار صرف باتیں کرتے ہیں چنانچہ روشن محل کے کردار بھی یہاں آئے ہوئے او نچے طبقے کے لڑکے اور لڑکیاں بھی زیادہ تر باتیں ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین کے کرداروں کی طرح یہ لوگ بھی عشق کرتے ہیں۔ مگر ان کے عشق بھی قوت عمل سے عاری ہیں۔ ، روشن محل کے کردار قرۃ العین کے کرداروں کی طرح باتیں کرتے ہیں مگر ویسی دلکش باتیں نہیں کرپاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرۃ العین کو زبان پر جو عبور حاصل ہے عبداللہ حسین کے یہاں اس کی بڑی کمی پائی جاتی ہے۔ افسانوی ادب پیش کرنے والے کے لیے زبان کا مزاج داں ہونا بڑا ضروری ہے۔ عبداللہ حسین

کے یہاں زبان کی خامیاں بڑی کھٹکتی ہیں۔ اس سے کسی اور مقام پر بحث کی جائے گی۔

روشن پور چونکہ پنجاب اور دلی کی سرحد پر واقع ہے اس لیے وہ اس کے زمیندار کو دلی سے زیادہ دور نہیں لے جا سکتے تھے دلی اور لکھنؤ کی تہذیب میں تھوڑا سا فرق تھا مگر اس کی نشاندہی عبداللہ حسین کے لیے ممکن نہ تھی اسلئے انھوں نے لکھنؤ کے نواب ہی کو روشن محل میں لا بٹھایا۔

روشن محل کے تذکرہ کے ساتھ ہی قرۃ العین کا سایہ موجود ہوتا ہے۔ نعیم اپنے چچا ایاز بیگ کے ساتھ روشن آغا سے ملنے روشن محل جاتا ہے۔ وہاں پرویز جس طرح نعیم سے اپنا تعارف کراتا ہے وہ جملے بھی بالکل قرۃ العین کے سے لگتے ہیں "اداس نسلیں" کے کچھ جملے پیش کیے جاتے ہیں۔

ص ۳۳: بھوک چونکہ انتہائی وحشتناک انسانی جذبہ ہے چنانچہ کھانا انسان کا شریف ترین فعل ہے

ص ۵۲: یہ فضول موت نہ تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر نعیم نے کہا عام موتوں کی طرح تھی۔

"تو سب موتیں فضول ہوتی ہیں۔

"نہیں اور۔ شاید لیکن موتیں فضول نہیں ہوتیں۔ موت سے آدمی مر جاتا ہے۔

ص ۳۹: "یار قصہ یہ تھا اصل میں کہ وہ جنے کیا سمجھنے لگی تھی خود کو ڈپٹی کمشنر کی بیوی تو تھی ہی اور کافی خوبصورت بھی تھی۔

ص ۲۲۵ سے ۲۳۰ تک کی تمام عبارت۔

ص ۴۱۹ :- "وہ اسس نے چوروں کی طرح گردن کندھوں میں چھپا لی اور دیوار کی اوٹ میں ہو کر چلنے لگی۔

ص ۴۲۰ "جب دن میں باہر بیٹھتے ہیں اور دھوپ میں ایسی چمک ہوتی ہے اور ہر طرف تتلیاں اڑتی پھرتی ہیں۔ رنگ برنگ اور شہد کی مکھیاں رنگ برنگ اور تارا پتے تیئں! اوہ" اس نے مٹھیاں کس کر چھاتی میں بھینچ لیں اور آنکھیں بھینچ کر ہنسی۔
"ہے نئیں"

ص ۴۲۲ :- "اوہ سویٹ" نجمی نے مٹھیاں ہوا میں چلائیں۔ "مائی ڈیئر۔ اس قدر بس اور بالکل بے ہوش کر دینے والی آواز ہے بارش کی نا؟"

ص ۴۲۷ :- "اللہ توبہ کیا چکر میں ہیں یہ لڑکیاں" فے جل کر بولی۔

یہ تو صرف چند مکالمے ہیں ورنہ روشن محل سے متعلق اکثر بیانات میں قرۃ العین کا سایہ نظر آتا ہے۔ نعیم اور ڈاکٹر انصاری جو مذہب پر بحث کرتے ہیں اس کے جملے بھی اسی انداز کے ہیں ان جملوں اور بیانات کو آپ عبداللہ حسین کے طبع زاد اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ یہ انداز اور جگہ نظر نہیں آتا۔ انھوں نے روشن محل کے بیان کو قرۃ العین کی طرح دلکش بنانے کے لیے شعوری طور پر انہی کا انداز برتا ہے۔

اس ناول میں بہت سے EPISODES ایسے ہیں جو پورے طور پر قصہ کا جزو نہیں بن پاتے اور پیوند کی طرح اوپر سے چپکائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سیاست ہی کو لے لیجیے اس عہد کے تقریباً ہر ناول میں آزادی کی جدوجہد کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اسی لیے عبداللہ حسین بھی اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر اس سیاسی جدوجہد کا ناول کے کرداروں سے وابستہ ہونا ضروری تھا۔ یہ سیاسی پس منظر بالکل اسی قسم کا ہے۔ جیسے ہمارے بعض تنقید نگار "شعرا کے حالات کے سلسلے میں "پس منظر" کے عنوان سے بڑی تفصیل سے بیان کرتے رہے ہیں۔ سیاسی پس منظر یقیناً اہم ہوتا ہے اور ہر انسان کی زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ مگر اس اثر کا معنی خیز Significant ہونا ضروری ہے۔

سیاسی جدوجہد کی حیثیت تاریخی ہے سیاسی اجتماعات کا ذکر کیا جائے ان میں اس دور کی اہم ہستیوں کی شمولیت ظاہر کی جائے تو ایسے مقام کا اور اگر کسی کے گھر میں ہوں تو ایسی ہستی کا انتخاب ضروری ہے۔ جن کا ذکر اس عہد کی تاریخ میں ملتا ہو۔

اینی بیسنٹ گوکھلے اور ڈاکٹر انصاری جیسے لوگوں کے جمع ہونے کے لیے روشن محل کا انتخاب کیا گیا ہے۔ روشن آغا زمیندار ہیں اس دور کے زمیندار کا اتنا باہمت ہونا کہ اس پایہ کے سیاسی لوگ اس کے خاص دوستوں میں شامل ہوں قرین قیاس نہیں لگتا۔ روشن آغا کا ایاز بیگ سے یہ کہنا کہ "آپ کی اینی بیسنٹ بھی آرہی ہے" ظاہر کرتا ہے کہ ایاز بیگ اس

عہد کے اتنے اہم آدمی ہوں گے کہ ان کا اینی بیسنٹ سے قریبی تعلق ہو سکے مگر اس کا کوئی قرینہ بیان نہیں کیا گیا۔

اینی بیسنٹ اور گوکھلے اس اجتماع میں ایسے آتے ہیں جیسے کسی معمولی فلم میں مہمان اداکار۔ زبردستی ان سے چند مکالمے ادا کروا دیے گئے ہیں۔ اس مقام پر گوکھلے اینی بیسنٹ سے کہتے ہیں "لیکن چند نوجوانوں سے میں ضرور متاثر ہوا۔ موتی لال نہرو کا لڑکا بھی آیا تھا۔ اس طرح جواہر لال نہرو کا ذکر بھی آ جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے بہروپیے اینی بیسنٹ اور گوکھلے کا سوانگ رچا کر جلسے میں آ گئے ہوں اور چند باتیں کر کے چل دیے ہوں۔

نعیم زخمی ہو کر جنگ سے واپس آ جاتا ہے۔ یہ تقریباً ۱۹۱۵ کا زمانہ ہے سیاسی جدوجہد کے نقطۂ نظر سے یہ دور بڑا اہم ہے۔ نعیم اس ناول کا ہیرو ہے اس لیے اسے اس جدوجہد میں شامل کرنا مصنف ضروری سمجھتے ہیں مگر کیوں؟ ظاہر ہے کہ نعیم کا قد و قامت بڑھانے کے لیے اور اسے روشن محل کی عذرا کے لائق بنانے کے لیے۔

جنگ سے واپس آنے کے بعد روشن پور میں ایک واقعہ رونما ہوتا ہے جس سے نعیم کے دل میں زمینداری نظام کے خلاف ہلکا سا غصہ پیدا ہوتا ہے۔ روشن آغا کا منشی ان کے مزارعوں سے موٹرانہ طلب کرتا ہے۔ بوڑھے احمد دین کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے اسے بیل کی طرح چلایا جاتا ہے وہاں ایک ماسٹر نعیم کو اپنے گھر لے جاتا ہے اور اسے اس نظام کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

نعیم اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ ماسٹر اور اس کے ساتھی کانگرس میں شامل ہیں۔ نعیم کا ماسٹر کے کہنے پر بغیر تفصیلات معلوم کیے فوراً آمادہ ہو جانا عجیب سا لگتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے نعیم کے سیاست میں دلچسپی لینے کا اظہار کہیں نہیں ہوتا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے

آمادگی ظاہر کر دیتا ہے اور ماسٹر کے بتائے ہوئے پتہ پر جا پہنچتا ہے اس کی ملاقات ضلع کمیٹی کے اسسٹنٹ سیکرٹری بال مکند سے ہوتی ہے یہاں اسے تھوڑی سی تربیت دے کر دہشت گردوں کے گروہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔

نعیم کانگرس کے نام سے واقف تھا اور شاید کام سے بھی ہوگا۔ دہشت پسندوں تک وہ جس طرح پہنچتا ہے۔ یہ سارا معاملہ کانگرس کی اس زمانے کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ دہشت پسندی اور تخریبی سرگرمیاں کانگرس ہائی کمان کی منصوبہ بندی میں کبھی شامل نہیں رہیں البتہ QUIT INDIA MOVEMENT کے ز... ہی نوجوانوں خصوصاً یونیورسٹی اور کالجوں میں تعلیم پانے والے ان سرگرمیوں میں بڑی شدت سے حصہ لینے لگے تھے اور انھوں نے واقعی حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا مگر یہ دوسری عالمی جنگ کی بات ہے ۱۹۱۵ء میں یہ صورت حال نہیں تھی۔

بہر حال نعیم کے یہ چند ساتھی جس طرح پلوں اور ریلوں کو اڑا رہے تھے یا اڑانے کی کوشش کر رہے تھے اس کا کوئی نتیجہ قصہ میں برآمد نہیں ہوتا۔ مصنف صرف یہ تصور دے سکے ہیں کہ جو لوگ ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں اس قدر بے رحم ہو جاتے ہیں کہ اپنے ہی ساتھیوں کی جان لینے میں بھی انھیں کوئی تامل نہیں ہوتا۔

نعیم کو یہ تخریبی سرگرمیاں قطعی پسند نہیں تھیں۔ وہ ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ جو راہ انھوں نے اختیار کی ہے وہ غلط ہے مگر وہ لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ شیلا نعیم کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ لوگ اسے مار دیں گے اس لیے اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ وہاں سے چلا جائے۔ چنانچہ وہ موقع پا کر وہاں سے نکل

بھاگا۔ ماسٹر کو وہ کانگریس کا نمائندہ سمجھتا تھا۔ اس کے بارے میں اس کے خیالات بہت اچھے تھے پھر ایسے آدمی نے اسے اس گروہ تک کیسے پہنچا دیا۔ جس پر اسرار طریقے سے نعیم اس گروہ تک پہنچتا ہے وہ سیاسی جماعتوں کا طریق کار نہیں تھا۔ تعجب ہے کہ نعیم نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا۔

اس دہشت پسندی کے طفیل میں نعیم کی ملاقات شیلا سے ہوتی ہے۔ شیلا اور اس کا بھائی موہن دونوں اس گروہ میں شامل ہیں۔ یہ ذات کے اچھوت ہیں۔ جن سے چھو جانے سے اونچی ذات کے ہندوؤں کی ہر چیز بھرشٹ ہو جاتی ہے۔ سوائے مرد کے جسم کے۔ جس وقت اس کی عمر بارہ سال تھی اس کے گاؤں کا زمیندار اس سے کہتا ہے۔

"اری پگلی عورت کے ساتھ سونے سے بھی کوئی بھرشٹ ہوتا ہے" اس طرح وہ کافی عرصہ اس زمیندار کے پاس رہی پھر اس نے دوسرے زمیندار کے سپرد کر دیا۔ جسے پرطابدبو دار پسینہ آتا تھا۔ جب یہ ہندو زمیندار بھرشٹ نہیں ہوتے تو بھلا نعیم کس طرح بھرشٹ ہوتا اس ماحول میں جس قدر جنسی قرب اور جنسی گفتگو ممکن تھی مصنف نے اس سے کچھ زیادہ ہی دکھا دیا ہے اور خاصی تفصیل کے ساتھ۔

یہاں سے لوٹ کر نعیم جب گھر پہنچتا ہے تو گویا وہ دو سال گھر سے باہر رہا تھا۔ مگر اس دوران میں اس کی جو مصروفیات قصے میں بیان کی گئی ہیں وہ دو تین مہینے سے زیادہ کی نہیں ہیں۔ ماسٹر اس سے پوچھتا ہے کہ وہ دو سال تک کیا کرتا رہا۔ نعیم جواب دیتا ہے کہ اس نے نو جگہوں پر "کام" کیا ہے۔ مگر اسے ان مقامات کے نام یاد نہیں رہے۔

اس کے بعد نعیم شادی کی دعوت میں شرکت کرنے روشن محل جاتا ہے۔ عذرا سے ملاقات ہوتی ہے۔ تجدید محبت ہوئی اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

روشن محل میں آنے والے پرویز کے دوست تعلیم یافتہ خوبصورت اور ان ہی کی طرح اونچے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں عذرا سے پہلی ملاقات میں نعیم میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آتی کہ عذرا کو اس سے اتنا لگاؤ ہو جائے کہ اس کے ساتھی اس سے یہ کہیں کہ "وہ تمہارا خوبصورت دوست آرہا ہے" اس وقت نعیم کی عمر پندرہ سال ہوگی عذرا کی عمر تیرہ چودہ سال سے بھی کم ہوگی۔ اس کے بعد یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس نے ساڑھی باندھی ہوئی تھی۔ اس عمر کی تو کیا بلکہ ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ غیر شادی شدہ لڑکیاں ساڑھی نہیں باندھتی تھیں یہ رواج یہاں اب تک قائم ہے۔

صاحبزادہ وحیدالدین عذرا سے اظہار محبت کرتا ہے۔ یہ واقعہ نعیم کے وہشت پسندوں کے گروہ سے نکل آنے کے بعد کا ہے۔ وہ عذرا سے کہتا ہے "ہم ایک دوسرے کو اتنے عرصے سے جانتے ہیں اتنے عرصے سے ایک دوسرے سے واقف ہیں ان راستوں سے واقف ہیں" اظہار محبت کے بعد پوچھتا ہے "اس کا مطلب سمجھتی ہو کیا ہے" اس کے باوجود عذرا اس پر کوئی توجہ نہیں دیتی۔ اس کے برخلاف وہ ایک بازو والے نعیم کو قبول کر لیتی ہے۔ یہ بات ناممکن تو نہیں ہے مگر ان حالات میں عجیب سی لگتی ہے۔

شادی کے بعد وہ روشن پور جاکر رہنے لگتے ہیں اسی دوران میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ رونما ہوتا ہے اس زمانہ میں نعیم کانگریس

سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس نے بقول عذرا اخبار پڑھنا تک چھوڑ دیا ہے۔ جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے عذرا کو نعیم سے بھی زیادہ دلچسپی ہے۔ وہ نعیم کو کانگریس سے غفلت برتنے پر ملامت کرتے ہوئے ایک دم کہتی ہے۔ "چلو چلیں"

"کہاں"

"امرتسر۔ دونوں! ہیں نعیم"

"عذرا یہ زندگی آسان نہیں ہے تم نہیں جانتیں۔

"لیکن اتنی دلچسپ ہے کہ اس بار میں دلی گئی تو ڈلیسائی سسٹرز نے بدیشی مال کی دکانوں پر پکٹنگ کی تھی۔ ان کی تصویریں سارے بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں چھپیں اور جہاں بھی میں گئی ان ہی کا تذکرہ رہا۔ ہر موقع پر ہر پارٹی میں۔ تم کانگریس پارٹی کے ممبر ہو۔ ہم آسانی سے جا سکتے ہیں۔ نہیں نعیم۔ ہم دونوں ہیں نعیم۔" اس نے دونوں ہاتھ لجاجت سے اس کے بازو پر رکھے "میں اس جگہ سے اکتا گئی ہوں۔"

اس اقتباس کے چند فقروں پر غور کیجیے اس لیے عذرا جانا چاہتی ہے کہ یہ زندگی اتنی دلچسپ ہے۔ پھر جس طرح ڈلیسائی سسٹرز کی تصویریں بڑے بڑے اخبارات اور رسالوں میں چھپیں ہر جگہ ان کا تذکرہ رہا۔ آخری بات یہ ہے کہ وہ روشن پور کی زندگی سے اکتا گئی ہے۔

گویا امرتسر جانا کسی سیاسی نظریے میں عقیدے کی خاطر نہیں تھا۔ بلکہ شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ اس لیے ان دونوں کے وہاں جانے میں کوئی تک نظر نہیں آتی۔ دونوں جیسے تماشا دیکھنے جاتے ہیں۔ وہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا جو طریقہ

انھوں نے اختیار کیا وہ حد درجہ احمقانہ ہے۔ وہ ایک باتونی بوڑھے مچھلی والے کو پکڑ لیتے ہیں اور اس سے اس واقعہ کی روئداد سننا چاہتے ہیں اگر اس واقعے کا وہی ایک چشم دید گواہ ہوتا تو بات بھی تھی مگر وہ اس قدر بکواس کرتا ہے کہ کوئی صحیح الدماغ انسان اس کے ساتھ وقت ضائع کرنا گوارا نہ کرتا مگر عذرا اور نعیم نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس کی بکواس سنتے رہتے ہیں۔ شاید اس بوڑھے مچھلی والے کو مصنف نے کولرج کی شہرۂ آفاق نظم "رائم آف دی اینشینٹ میرینر" کے بوڑھے ملاح کا مثنیٰ بنانے کی کوشش کی ہو بوڑھا ملاح جو شادی کے مہمان کو پکڑ کر اپنی سرگزشت سناتا ہے۔ اس بکواس کے ذریعے کولرج نے بڑی دلکش Primordeal اور Images تجربات بیان ہیں۔ جبکہ مصنف نے محض اپنے صفحات اور ہیرو ہیروئن نے اپنا وقت برباد کیا ہے۔

جنرل ڈائر کے تذکرہ میں اگر مصنف نے پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان سے فائدہ اٹھایا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ یہ واقعہ تاریخی نوعیت کا ہے انگریزوں کے مظالم کی ایک نہایت بدنما مثال اسے تاریخی حیثیت ہی سے بیان کرنا چاہیے تھا۔ بہتر ہوتا کہ راوی اس عہد کی کوئی تاریخی شخصیت ہوتی اگر کہیں سے کوئی بات نقل کی جاتی تو فٹ نوٹ میں ماخذ کا حوالہ دیا جا سکتا تھا۔

اس مچھلی والے کی ایک روایت ملاحظہ ہو۔ "گلی میں سے ایک گوری عورت نکل رہی تھی اس کے پیچھے شہریوں کا ایک گروہ شکاری کتوں طرح لگا ہوا تھا۔ بازار کے وسط میں انھوں نے عورت کو آلیا چاروں طرف سے اسے گھیرے وہ پلید نظروں سے اسے گھورتے رہے........ پھر ایک شخص آگے بڑھا اور عورت کی

قمیض کو گلے سے پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دامن تک پھاڑ دیا۔ عورت نے چیخ ماری جس سے سارا طلسم ٹوٹ گیا اور مجمع اس پر پل پڑا تھوڑی دیر کے لیے وہ بیس پچیس آدمیوں کے نیچے غائب ہو گئی لیکن اس کی چیخیں زمین کے ساتھ ساتھ مجھ تک پہنچتی رہیں میرے سامنے وہ سب اسے کتوں کی طرح نوچتے رہے۔ مگر وہ عجیب سخت جان ربڑ کی عورت تھی۔ بھئی واہ واہ۔

میں نے اس سے زیادہ عجیب و غریب عورت آج تک نہیں دیکھی ادھر ہجوم کا دباؤ کم ہوا ادھر وہ اچھل کر ان کے بیچ میں سے نکلی اور ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے بال سر پر کھڑے تھے اور وہ ٹانگیں پھیلا کر پوری رفتار سے چڑیلوں کی طرح بھاگ رہی تھی"۔

کسی عورت پر اتنے آدمیوں کے پل پڑنے اور کتوں کی طرح اسے نوچنے کے بعد اس میں اتنی سکت رہنا کہ وہ چڑیلوں کی طرح پوری رفتار سے بھاگ نکلے۔ قطعی ناممکن ہے سچ مچ کی چڑیل ہی یہ کارنامہ انجام دے تو دے ورنہ ان حالات میں تو عورت کیسی ہی کیوں نہ ہو اس کا بے ہوش ہو جانا لازمی ہے۔

اسی مچھلی والے کی ایک اور گپ ملاحظہ ہو۔

"جب جوتے ختم ہو گئے تو لوگوں نے اپنے کپڑے اتار اتار کر پھینکنے شروع کر دیے۔ اب پگڑیوں قمیضوں اور بنیانوں کے گولوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور جلد ہی آدھے سے زیادہ لوگ ننگے بدن ہو گئے بلکہ بعض تو بے حیائی سے کام لے کر سب کچھ ہی نکال کر پھرنے لگے"۔

جوتوں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر اس سے آگے کی

خصوصاً یہ صورت حال کہ ور.......... سب کچھ ہی نکال کر پھرنے لگے ۔ یہ خلاف قیاس بلکہ مضحکہ خیز ہے۔

جس راوی کو یہ لوگ تلاش کرتے ہیں وہ اس قدر فضول آدمی ہے کہ جب نعیم اس سے پوچھتا ہے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ اسے اس طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملی ہمارے ہاں تو صورت حال یہ ہے کہ دہریہ اور منکر بھی ساری کوشش کے باوجود ہندو یا مسلمان ضرور رہتا ہے۔ جوش صاحب کا خدا کو گالیاں دینے کے باوجود حضرت حسین کا مرثیہ لکھنا اس رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔

امرتسر کے سفر کے بعد عذرا اور نعیم کانگریس کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ دور دور کے دیہات میں پیدل چل کر پہنچتے ہیں اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے باتیں کرتے ہیں ان کے مسائل معلوم کرتے ہیں اور ان ہی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ انہی کے ہمراہ زمین پر سو کر راتیں بسر کرتے ہیں کانگریس کی کوششوں سے کسانوں میں جو بیداری آ رہی تھی عذرا اور نعیم کی کوششیں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔

نعیم کے سامنے ایک ہی گاؤں میں جس میں سیلاب نے تباہی مچا دی تھی یہ واقعہ پیش آیا کہ زمیندار کے گھڑسوار لگان وصول کرنے آئے۔ ان کے پاس اناج تو کیا بھوسہ بھی نہیں بچا تھا گھڑسوار ان کے گھروں میں گھس کر طرح طرح کی زیادتیاں کرتے ہیں ان کا آخری نعرہ سنائی دیتا ہے "ہم آگ لگا دیں گے گھروں کو، کھلیانوں کو سب کو۔"

یہ کانگریس کی پھیلائی ہوئی بیداری کا اثر تھا کہ "کسانوں میں جانوروں

کے گلے کی سی بلبلاہٹ بلند ہوئی اور وہ خالی ہاتھ اوپر اٹھا کر بڑھے سواروں نے ٹھٹک کر دیکھا اور خاموشی سے گھوڑے موڑ کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد کوئی اس فصل کا حساب وصول کرنے کے لئے نہ آیا۔"

کانگریس نے زیادہ تر کام دیہی علاقوں میں کیا تھا۔ "سوراج" کا مطالبہ شہروں کے ساتھ ساتھ دیہات میں بھی سنائی دے رہا تھا۔

اسی زمانہ میں مسلم لیگ بھی ابھر کر سامنے آچکی تھی اس ناول میں مسلم لیگ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دلی میں مسلم جماعتوں کا ایک اجتماع ہوتا ہے جلسہ گاہ کی سجاوٹ نہایت ٹھاٹ باٹ سے کی گئی تھی۔ یہاں مسلم لیگ کی دونوں جماعتیں تھیں۔ جنکے سربراہ محمد علی جناح اور سر محمد شفیع تھے۔ یہاں علامہ اقبال بھی تھے... خلافت کمیٹی کے ارکان بھی تھے۔ جن میں مولانا شوکت علی محمد علی بھی تھے۔ جمعیت العلماء کے نمائندوں میں مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ شبیر احمد عثمانی بھی تھے۔ ان کے ساتھ مسلمان امراء جو اپنی شان و شوکت کی وجہ سے سمندر پار تک مشہور تھے۔ اپنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ موجود تھے۔ خواتین کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جلسہ میں نعیم اور غیرا امراء اور عوام کی درمیانی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے (ان کی معاشرتی حیثیت دراصل یہی تھی) صدارت آغا خان کر رہے تھے اس جلسے میں سر شفیع نے پنجاب مسلم لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ میں مدغم کرنے کا اعلان کیا تو گویا اب پوری مسلم لیگ کی قیادت قائداعظم کے ہاتھوں میں آگئی۔ اس جلسہ کی کارروائی کا جو نقشہ پیش کیا گیا۔ اس سے انتشار اور تنظیم کے فقدان کا پتہ

چلتا ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس جلسہ کے صدر مولانا محمد علی اور ان کی بے باکی سے کا خائف ہیں اس کے بعد مسلم لیگ کے بارے میں میں کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ ہندوستان میں کیا کر رہی تھی۔ غالباً مصنف بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ محض ایک سیاسی جماعت تھی اور کانگریس ایک تحریک تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے پاس کوئی سماجی پروگرام نہیں تھا۔ ہم صرف تقسیم چاہتے تھے اپنی زمین چاہتے تھے۔ ہم نے وقت کے بہترین اور نہایت دیانت دار وکیل کی خدمات حاصل کر لیں اس نے اپنی باوقار شخصیت سے ایک طرف تو ہمیں متحد رکھا اور دوسری جانب اپنی لیاقت سے مقدمہ جتوا کر ہمیں زمین کا قبضہ دلوا دیا۔ اس کے بعد اپنا کام پورا کر کے خالق حقیقی سے جا ملا۔ ہمارے یہاں تنظیم صرف اس قدر تھی کہ ہم سب ہندو سے نفرت کرتے میں متحد تھے۔ ؎ پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے ہم آج تک ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

اس جلسے کی کارروائی ادھوری چھوڑ کر مصنف لکھتے ہیں "اسی سال چھ اپریل کو ڈانڈی ساحل پر مہاتما گاندھی نے نمک سازی کا قانون توڑ کر سول نافرمانی کا آغاز کیا" محض قانون شکنی کی خاطر لوگ جگہ جگہ نمک بناتے ہیں۔ روشن پور میں بھی علی اور اس کے ساتھی نمک بنا کر نہایت جوش و خروش کے ساتھ قانون شکنی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جلیانوالہ باغ کے واقعہ کے بعد نعیم کا دیہات میں جانا اور مسلم لیگ کے جلسہ میں شریک ہونا تو قرین قیاس لگتا ہے مگر اس کے بعد وہ پھر یکایک سیاست کو چھوڑ کر پشاور کی طرف چل پڑتا ہے۔ کانگریس کے "کام" کی خاطر نہیں بلکہ محض اس لیے کہ اس

؎ تقسیم کے وقت راقم الحروف کل ہند ریاستی مسلم لیگ کی عاملہ کا رکن تھا۔

نے اپنی جنگ کے زخمی ساتھی امیر خان سے ملنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ وعدہ اسے یکایک یاد آگیا۔

نعیم کو یہاں بھجوانے کا مقصد اس کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا کہ مصنف نے مصنوعی طریقے سے اپنے کینوس کو پھیلایا ہے اس بہانے قبائلی علاقے کی ایک شادی کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے رسم و رواج قبائلی طور طریقے، ان کی جہالت ان کی محبت ان کی مہمان نوازی، ان کا خٹک رقص اور رقص کے ساتھ ساتھ لڑائی وغیرہ غرضیکہ بظاہر ایک دلچسپ تصویر پیش کی جاتی ہے۔ مگر یہ تصویر قصہ میں اوپر سے چپکائے ہوئے پیوند کی طرح نظر آتی ہے۔

یہاں شاید مصنف کو خیال آیا ہو کہ نعیم تو گلے گلے سیاست میں اتر چکا ہے۔ چنانچہ پشاور ہی میں وہ ایک سیاسی پلیٹ فارم بھی لگا دیتے ہیں۔ سول نافرمانی کی تحریک یہاں بھی زور پکڑ جاتی ہے۔ نمک بنایا جاتا ہے۔ کھدر پوش لیڈروں سے ملاقات ہوتی ہے فائرنگ ہوتی ہے لوگ مارے جاتے ہیں نعیم اسے بھی تماشہ کی طرح دیکھتا ہے۔ وہ یہاں کے کسی لیڈر سے نہیں ملتا۔ اس واقعہ سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں ہو پاتا۔ اس ظلم و ستم کی تصویر پیش کرنے کے بعد اس قصہ کو یہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پشاور اور قبائلی علاقے کے واقعات داستان یا کہانی کے انداز میں بیان ہوئے ہیں اور صرف وقت کی ترتیب (Time sequence) کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں کسی واقعہ سے سبب مسبب کا تعلق قائم نہیں کر پاتے۔

اس ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر آپ یہ غور کریں کہ ناول کی ہئیت اور اس کا Pattern کیا ہے تو ممکن ہے آپ کا ذہن

"فسانۂ آزاد" کی طرف منتقل ہو۔ "فسانۂ آزاد" کا منشاء اپنے ہیرو کے کارنامے بیان کرنا ہے اس میں جادو کے کرشمے نہیں ہیں پھر بھی اس کا ہیرو ہرفن مولا ہے وہ ترکی کی طرف سے جنگ بھی لڑتا ہے کیا نغیم میں آزاد کی جھلک نظر نہیں آتی۔ عبداللہ حسین بھی اسے ہرفن مولا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہاں کوئی حسن آراء نغیم کو جنگ پر نہیں بھیجتی مگر مصنف اسے ایک اچھا سپاہی بھی ضرور ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بہادری کے کارناموں پر اسے بہادری کا سب سے بڑا انعام یعنی وکٹوریہ کراس ملتا ہے اور وہ ایک بازو گنوا کر گھر لوٹتا ہے۔ پھر بھی مصنف اس کی جان نہیں چھوڑتے۔ اس ایک بازو والے انسان کو بھی طرح کی مہمات پر بھیجتے ہیں۔ اسے سوؤروں کے شکار پر بھی لے جاتے ہیں۔ یہاں وہ خفت آمیز بہادری کا نمونہ پیش کرتا ہے اگر وہ شکار پر نہ جاتا تو قصہ میں کیا کمی رہ جاتی۔ یہاں بھی اس واقعے کی وجہ وہی کینوس کو وسعت دینا ہے۔

ان بے مقصد مہمات میں کئی سے تو یہ تاثر ہوتا ہے کہ نغیم محض تماشہ دیکھنے آیا ہے۔ پرنس آف ویلز کے استقبال کا نقشہ اسی قسم کا واقعہ ہے۔ عذرا کو پرنس آف ویلز کی آمد کا علم ہو چکا تھا۔ "اسے دیکھنے اس کے ساتھ باتیں کرنے اور اس کے پاس بیٹھنے کی خواہش نے اس کے دل میں کرب کی شکل اختیار کر لی تھی۔" نغیم اس دوران میں روشن پور آ جاتا ہے عذرا اسے دیکھنے کے لیے دلی جانا چاہتی ہے۔ مگر نغیم کہتا ہے کہ شاید وہ اس سے پہلے ہی گرفتار ہو جائے اس لئے کہ ان لوگوں نے پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ کیا ہے اور حکومت نے کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا ہے۔ عذرا بھی تیار ہو جاتی ہے کہ وہ بھی اس کے خلاف

مظاہرہ کرنے میں شریک ہو۔ پھر سوچتے ہیں کہ دلی میں روشن آغا اس کی اجازت نہیں دیں گے چنانچہ اس مقصد کی خاطر وہ کلکتہ چلے جاتے ہیں "

ایشیا کے سب سے بڑے شہر میں ہڑتال ہو جاتی ہے صرف پولیس اور فوج نے اپنی تعداد سے تفریحی رنگ لانے کی کوشش کی تھی عذرا اور نعیم مظاہرہ کے سلسلہ میں بڑی بچکانہ حرکتیں کرتے ہیں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ کانگریس کے کارندوں کے ساتھ مل کر مظاہرہ کرتے مگر عذرا کی دلچسپی صرف رومانی ہے وہ اس منظر کا تماشہ دیکھنا چاہتی ہے۔ بائیکاٹ کا اظہار کرنے والے بورڈ جگہ جگہ باندھ رکھے تھے۔ عجیب حلیہ میں لوگ نمودار ہو کر اور مویشی ہانک کر مظاہرہ کر رہے تھے۔ نعیم بار بار عذرا سے کہتا جاتا ہے کہ "کاغذ نکالو۔ کاغذ نکالو" نعیم ایک بورڈ بھی اتار لیتا ہے اس پر وہ کچھ لکھ کر لٹکانا چاہتے ہیں مگر اس کی نوبت نہیں آتی۔ عذرا شہزادے کو دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے۔ افراتفری میں بورڈ ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتا ہے۔ جلوس گذر جاتا ہے۔ دونوں تماشہ دیکھ لیتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ قصہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے یہ ہے ایک سیاسی کردار کی ایک سیاسی واقعہ میں شرکت جسے کہ اس سلسلے میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

مصنف نعیم کو ایک اہم سیاسی ہستی ثابت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں چنانچہ اسے گرفتار کرانا بھی ضروری تھا اسے جاٹ نگر میں ایک جلسہ منعقد کرنے کے سلسلے میں دلی سے ہدایات موصول ہوتی ہیں۔ پولیس والے جلسہ گاہ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ مگر بہر حال نعیم اور دوسرے کسان اندر گھس ہی آتے

ہیں۔ جلسہ سے خطاب کرنے کے لیے دوسرے لوگ بھیجے گئے تھے مگر افراتفری میں وہ ادھر ادھر ہو گئے۔ چنانچہ نعیم نے "بولنا شروع کر دیا اور کئی منٹ تک بے تکان بولتا چلا گیا........... اسے خیال بھی نہ رہا تھا کہ اس نے بولنا شروع کیا تھا اور کب ختم کیا یا یہ کہ اس نے کیا کہا"۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے بڑی زوردار تقریر کی اور معمولی مجمعے کے سامنے نہیں بلکہ اس کے نیچے پھیلتا سکڑتا۔ اٹھتا بیٹھتا اور پھیلتا دہکتا ہوا مجمع نہ رہا ایک ٹھوس اور لچکدار پگھلے ہوئے ربڑ کا دبیح مجمع بن گیا تھا۔ فرد کا یا افراد کے ہجوم کا تصور غائب ہو گیا تھا۔ اب یہ محض ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو اپنی ہی قوت کے تحت پھیل اور سکڑ اٹھ اور بیٹھ رہا تھا جس کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی"۔

قصہ مختصر اس سول نافرمانی کی پاداش میں اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ اس بہانے جیل کی اندرونی دنیا کا نقشہ بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تقریباً ۲۰ صفحے پر پھیلا ہوا ہے سب سے پہلے تو یہ بتایا جاتا ہے کہ نعیم کو دس مربع فٹ کی کوٹھڑی دی گئی تھی۔ اس رقبے کی ممکنہ لمبائی چوڑائی کا تخمینہ لگا کر دیکھئے مثلاً ۶ فٹ × ۱½ فٹ یا ۵ فٹ × ۲ فٹ یا ۱۰ فٹ × ۱ فٹ تینوں صورتیں ممکن نہیں ہیں کہ ان میں ایک آدمی سما سکے قبر کی زمین بھی روایتی طور پر ۲ گز لمبی کہی جاتی ہے یعنی ۲ گز × ۱ گز یا ۶ فٹ × ۳ فٹ۔ اس میں مردہ سماتا ہے زندہ اس میں بھی نہیں رکھا جا سکتا۔

اس کوٹھڑی کی حالت کیسی تھی جیل کا کھانا کس قسم کا ہوتا تھا جیل میں قیدیوں سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ وارڈ اور رسیر (یعنی... پرانے قیدی) دوسرے قیدیوں سے کیا سلوک کرتے تھے۔

قیدیوں کی آپس میں گفتگو کا معیار کیا تھا یہ باتیں عام قسم کی ہیں۔ البتہ ان ہی میں چند دلچسپ لوگوں سے بھی ملاقات کروائی جاتی ہے۔

نعیم جیل کے کھانے کو جانوروں کا کھانا کہہ کر کھانے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس پر اس سے اس طرح خطاب کیا جاتا ہے "آہا بیل کے بچے تو تم اپنی ساس کے گھر آئے ہو" پھر وہ ایک دم آنکھیں نکال کر چیخا "سنو اگلے ہفتے تمہارا وزن ہوگا اور اگر ایک تولہ بھی کم ہوا تو تمہیں مویشیوں کا گوبر کھلایا جائے گا" اس سے زیادہ سختیاں آج بھی ہندوستان پاکستان میں ہو رہی ہیں۔

اسی جیل میں عدم تعاون کے سلسلے میں چند تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کی خواتین بھی قید ہو کر آ جاتی ہیں۔ انہیں عادی مجرم عورتوں کی زبانی ایسی باتیں سننا پڑتی ہیں۔

"تم تو بڑی خوبصورت ہو"

"جیلر کے ساتھ سوؤ تو چھوٹ جاؤ گی"

"افیم لوگی"

"تمہارے خاوند نامرد ہیں جو یہاں آگئی ہو"

نعیم کی مشقت میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اب وہ محض قیدیوں کے پھٹے پرانے کپڑے مرمت کرنے کے کام پر مقرر تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے سینے سلانے میں کافی مہارت حاصل کر لی اس کا لکڑی کا ہاتھ بھی لے لیا گیا تھا۔ وہ محض ایک ہاتھ سے سلائی اور مرمت میں اتنا ماہر کیسے ہو سکتا تھا اور اتنے قیدیوں کے کپڑوں کی مرمت کیسے کر سکتا تھا۔

اس زمانے میں عذرا سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں حصہ لیتی ہے نعیم تو اس پر فخر محسوس کرتا ہے مگر اس کے گھر کے سارے

لوگ انتہائی خفگی کا اظہار کرتے ہیں اور اس سے انتہائی سرد مہری سے پیش آتے ہیں۔

نعیم کے جیل جانے پر بھی روشن آغا انتہائی رنجیدہ ہوتے ہیں اور عذرا سے کہتے ہیں کہ ان کے خاندان میں آج تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سرکار پرست طبقہ کے اس فرد کو سیاست سے کس قدر وابستگی ہوگی ان کے یہاں اینی بیسنٹ گوکھلے، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر امبیدکر جیسے لوگوں کا آنا اور سیاست پر گفتگو کرنا۔ روشن آغا کا ان کی گفتگو میں شریک ہونا قطعی خلاف قیاس لگتا ہے۔ مصنف نے شاید اسے محسوس کرتے ہوئے ان کے گھر پر مجلس خدام ہند کا جلسہ کروایا جس میں گوکھلے اور ڈاکٹر امبیدکر بھی شریک ہوتے ہیں کافی گفتگو کے بعد عجلت کے ساتھ ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ جس میں ملک کی انتہا پسند جماعتوں کی دہشت انگیز کاروائی کی مذمت کی گئی اور ڈومینین اسٹیٹس کا مطالبہ کیا گیا۔

روشن آغا نے نعیم کی گرفتاری اور عذرا کے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر جس قسم کے تاثر کا اظہار کیا تھا اس کی روشنی میں یہ قطعی خلاف قیاس ہے کہ وہ گوکھلے اور ڈاکٹر امبیدکر جیسے لوگوں کے ریزولیوشن میں شریک ہوسکیں۔

اس زمانہ میں کانگریس کے دو گروہ تھے ایک کو گرم پارٹی کہتے تھے جو کہ مکمل آزادی کا مطالبہ کرتی تھی اور دوسری نرم پارٹی جو کہ صرف ڈومینین اسٹیٹس چاہتے تھے یہ دونوں گروہ بہر حال کانگریس ہی سے وابستہ تھے۔

ضمنی طور پر ایک مضحکہ خیز بات بھی دیکھتے چلیے۔ سائمن کمیشن

والے بائیکاٹ کے سلسلے میں پولیس لاٹھی چارج کرتی ہے" اس کے بعد لاٹھی چارج شروع ہوا۔ سکوت اس تیزی کے ساتھ ٹوٹ گیا اور چاروں طرف چیخ و پکار مچ گئی تیزی کے ساتھ سر سراتے اور مار گراتے ہوئے مگدر اور لاٹھیاں ان کے سروں پر سے گذرنے لگے" لاٹھیاں تو ٹھیک ہیں مگر یہ مگدر کہاں سے آ گئے۔ مگدر تو پہلوانوں کے اکھاڑوں میں ہوتے ہیں۔ شاید ہی کسی نے پولیس والے کے ہاتھ میں مگدر دیکھے ہوں۔ ممکن ہے مصنف کی مراد مگدر سے کوئی اور چیز ہو۔

ایک اور گڑبڑ واقعہ دیکھیے۔ نعیم زبردستی علی کو لے جاکر مل میں بھرتی کروا دیتا ہے۔ گویا علی نے مل میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے جلسہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر گاندھی جی کے نمک سازی کے قانون توڑنے کی تحریک کا ذکر کیا جاتا ہے اور روشن پور میں علی بھی دوسرے لڑکوں کے ساتھ نمک بناتا ہے اس کا راول سے جھگڑا ہوتا ہے یہ کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ علی مل کی نوکری سے یہاں کیسے پہنچا ہے۔ اس کے آنے اور جانے کا کہیں ذکر نہیں ملتا چند صفحات کے بعد پھر اس کارخانہ میں علی کو کام پر جاتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ یا تو مصنف وقت کی ترتیب بھول گئے۔ یا واقعات کی ترتیب مسودہ درست کرتے وقت بدل گئی بہر حال کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔

نعیم کے ساتھ ساتھ علی کا قصہ بھی کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس قصہ کی ایک اہمیت تو یہ ہے کہ علی اور نعیم کے تقابل سے نعیم کے کردار کی یہ اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اپنے سوتیلے بھائی کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں تھا علی نے دیہاتی ماحول

میں ہی آنکھ کھولی تھی اور اسی میں بڑا ہوا تھا۔ اس میں کسان پن نعیم سے زیادہ تھا۔ مگر نعیم اسے اس میدان سے بالکل ہٹا دیتا ہے اور کارخانہ میں ملازم کرا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اسے بالکل بھول جاتا ہے پانچ سال بعد وہ گاؤں آتا ہے۔ وہ بھی نعیم کے رہا ہونے کی خبر سن کر۔ دونوں کو صرف ایک مرتبہ ساتھ کھانا کھاتے دکھایا گیا ہے۔ علی کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ زمینوں پر بڑی ماں کا قبضہ ہے۔ نعیم علی کو دوبارہ فیکٹری بھیجنا چاہتا ہے تاکہ مزدوروں میں کام کرے علی کے انکار پر وہ آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ علی کہتا ہے "تم نے ہمیشہ میرے ساتھ دشمنی کی ہے تم نے یہاں سے مجھے نکالا ہے اب مجھے جیل بھیجنا چاہتے ہو" نعیم صاف کہہ دیتا ہے کہ علی گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ یہ تھا نعیم کا رویہ اپنے سوتیلے بھائی کے ساتھ۔

علی آخر کار اکتا کر لاہور چل دیتا ہے پتہ نہیں اس کی ریل کس راستے سے گئی صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لاہور تیس گھنٹے کے سفر کے بعد پہنچا۔

علی کو کارخانہ میں بھرتی کروانے کے بہانے مصنف کو مزدوروں کی زندگی کو نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ بیان سب ملا کر تقریباً ۴۵ - ۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مزدوروں کی زندگی۔ دوران کار ان کے آپس کے تعلقات ان کا انداز گفتگو۔ فیکٹری کے چھوٹے بڑے افسران۔ فرٹ، انجنیئرز مینیجر وغیرہ کا رویہ مزدوروں کے ساتھ۔ مزدوروں کے مسائل۔ ہڑتال کرنا۔ انتظامیہ کا مزدوروں کو توڑ کر ان کی ہڑتال کو ناکام بنانا۔ یہ تمام باتیں نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ مگر اس قسم کی باتیں عام ناولوں میں مل جاتی ہیں ان میں کوئی خاص بات نہیں۔

بستی

انتظار حسین

عام طور پر کوئی شخص ناول اس وقت لکھتا ہے۔ جب وہ اس پیرائے میں کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اس ناول کے مطالعہ کے بعد کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی، جسے کہنے کی خاطر انتظار حسین نے یہ ناول لکھا ہو۔ دراصل انہیں تجربے کرنے کا شوق ہے۔ افسانے میں بھی انہوں نے کئی تجربے کئے ہیں۔ اس ناول کی شکل میں بھی اغلباً انہوں نے ایک تجربہ ہی پیش کیا ہے۔

انتظار حسین خاصے ذہین انسان ہیں۔ وہ الجھاوے دینے میں کافی ماہر ہیں۔ اس ناول کی ٹیکنیک کے بارے میں بھی انہوں نے مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کے فارم کا مسئلہ کچھ اس قسم کا تھا کہ جہاں بعض لوگوں نے اس کی تعریف کی وہاں بعض لوگوں نے اس پر اعتراضات بھی کئے۔ بعض اعتراضات کا جواب انہوں نے 'ادب لطیف' میں اس طرح دیا تھا۔ "اتنی مجھے خبر ہے کہ بیسویں صدی میں اگر یورپ میں ایسے ناول نگار پیدا ہوئے جنہوں نے ناول کے روایتی سانچے کو ملیامیٹ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ اگر میری ناول کے روایتی سانچے سے نہیں بنتی۔ تو مجھے انہی سے رجوع کرنا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں تو مشرق کی مخلوق ہوں ۔ ۔ ۔ اور میرا معاملہ یہ ہے کہ میری ایک بغل میں الف لیلہ اور دوسری بغل میں کتھا سرت ساگر ہے۔ افسانہ لکھوں یا ناول مجھے اپنے فکشن کی ان دو طاقتوں کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔"

ان کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔ "جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ڈبلنرز کی یہ کہانیاں کیسی ہیں اور یہ ناول (یولی سیز) کس تماش کا ہے تو میں نے جوائس کو بیچ میں چھوڑا اور کتھا سرت ساگر کے دفتر لے کر بیٹھ گیا۔ سوچا کہ سر پھوڑنا ہی ٹھہرا تو جوائس صاحب کا ہی سنگ آستان کیوں ہو۔ اپنے یہاں بھی پتھر موجود ہیں، مگر کتھا سرت ساگر تو علم دریا نکلی۔ تھاہ ہی نہیں ملتی، کہانی کو کہاں سے پکڑیں اور کہاں ختم کریں" اس مضمون میں کتھا سرت ساگر کے بارے میں کہتے ہیں "کہانی کے اندر کہانی پھر اس کے اندر کہانی، یہ کہانیاں کیا ہیں، ندیاں ہیں، کہاں سے کہاں بہتی آتی ہیں اور ساگر میں ملتی چلی جاتی ہیں۔ کہانیوں کا اتھاہ ساگر، ابدیت کا سمندر"۔

بستی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جہاں تک فارم اور اندازِ پیشکش کا تعلق ہے۔ اس ناول کو نہ الف لیلہ سے کوئی واسطہ ہے نہ کتھا سرت ساگر سے یہ دونوں داستانیں ہیں۔ داستانوں کی سب سے بڑی خوبی واقعات کی خلاقی ہوتی ہے یہاں واقعہ سے واقعہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کتھا سرت ساگر نہ الف لیلہ کو پہنچتی ہے نہ داستان امیر حمزہ کو، یہاں انتظار حسین نے خاص طور سے کتھا سرت ساگر کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ یہاں اس کتاب کو بمشکل چند لوگوں نے ہی پڑھا ہوگا محض مغالطہ دینے کے لئے انہوں نے اس کتاب سے اپنے ناول کا رشتہ جوڑا ہے اور ان کتابوں اور مصنفوں سے بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ جن کا کہ انہوں نے اتباع کیا ہے۔

بستی پر تبصرہ کرتے ہوئے فضیل جعفری لکھتے ہیں: "گیارھویں صدی عیسوی میں تالیف کی گئی سوم دیو بھٹ کی اس کتاب یعنی کتھا سرت ساگر کی ساری اہمیت تاریخی، معلوماتی اور زیادہ تر تفریحی نوعیت کی ہے۔ اس میں شامل کئی کہانیاں تو معمولی لطیفوں کی سطح سے بھی اوپر نہیں اٹھ پاتیں"۔

انتظار حسین نے ٹھیک لکھا ہے کہ جوائس سے سر پھوڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ "فنے گنز ویک" کو تو چھوڑیئے۔ ہمارے لئے اور خود انتظار حسین کے لئے یولی سیز کو سمجھنا اس لئے

مشکل ہے کہ ہمارا ناول نویس اور ہمارا قاری ابھی اس سطح پر بھی نہیں پہنچ پایا ہے۔ جہاں تک کہ یورپ میں انیسویں صدی کا ناول نگار اور اس کا قاری پہنچ چکا تھا۔ پھر ہم اس بیسویں صدی کے اس انتہائی ترقی یافتہ فارم اور اسلوب تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ البتہ اتنا تو لوگ جان گئے ہیں کہ ان کا موضوع شعور کی رو کی پیشکش ہے اور ان میں وقت کو نفسیاتی زمان کی سطح پر پیش کیا گیا ہے۔

ناول کی فارم کے متعلق جملہ ہے کہ ناول کا کوئی مخصوص فارم نہیں ہوتا۔ فارم کے سلسلے میں ہر صنف ادب میں دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ مگر ایک نئی فارم کو پیش کرنے اور اسے تسلیم کروانے کے لئے بڑے زبردست ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ شکسپیئر نے ڈراما اور سونیٹ دونوں میں جدتیں کیں اور لوگوں نے اسے شکسپیرین انداز کے نام سے موسوم کیا اور تسلیم کیا۔ ہمارے شاعروں میں صرف علامہ اقبال میں اتنی خلاقانہ قوت تھی کہ وہ جہاں چاہتے جدتیں کر سکتے تھے۔

آپ یہ کہیں کہ فارم کے معاملے میں مغرب کی پیروی کرنا لازمی نہیں۔ بے شک نہیں ہے۔ مگر آپ ذہانت اور خلاقی کی اس سطح تک تو پہنچے، کہ لوگ آپ کے نتیجۂ فکر کو تسلیم کریں۔

فضیل جعفری نے "الفاظ" علی گڈھ سے انتظار حسین کے جواب کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ "میں نے بستی لکھا ہے تو اعتراض کہتے ہیں کہ یہ ناول کی فارم کے مطابق نہیں۔ صاحب میں لکھتا ہوں جوتے نہیں بناتا ہوں، جوتے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ پیر کے ناپ کے مطابق ہو۔ میں نے افسانہ لکھتے ہوئے کبھی سوچا کہ یہ افسانے کے ماپ کے مطابق ہے نہ ناول لکھتے ہوئے یہ خیال رکھا۔"

افسانے میں فارم کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا نہ موضوع کا سوال اتنا اہم ہوتا ہے پھر بھی افسانہ کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ آپ ۵۰۰ صفحات کی تحریر کو اگر مختصر افسانہ کہیں اور ۵ صفحہ کی کہانی کو اگر ناول کہیں تو شاید بزعم خود آپ کو اس کا حق حاصل ہو۔ مگر کوئی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ یہ جوتے اور افسانے کے ناپ والی بات یہیں چھوڑیئے، ہمیں تو بستی کے فارم سے بحث کرنی ہے۔

لوگ جب ناول کے جدید فن کی بات کرتے ہیں تو پروسٹ، ڈورو تھی، رچرڈسن

ورجینا وولف اور جیمس جوائس سب ہی کا ایک ساتھ ذکر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان سب کا انداز پیش کش الگ الگ ہے۔ اگر یولی سیز اور مسز وولف کے ناولوں کی ہیئت ایک ہوتی تو انگلستان میں یولی سیز کی اشاعت کے مسئلے پر مسز وولف اس کی مخالفت نہ کرتیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ لیڈی چٹرلے کے خالق نے یولی سیز کو عریاں قرار دیا اور اس کی اشاعت کی مخالفت کی۔

مسز وولف کا مشہور ناول 'اورلینڈو' سمبولک (اشاراتی) ہے، جب کہ یولی سیز میں لاشعور کو زبان دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لاشعور کا ادراک ناممکن ہوتا ہے۔ جوائس نے شعور کی سطح کو ایک آدھ لمحے کے لئے چھو لینے والے لاشعور کو اس کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لاشعور لازمانی بھی ہوتا ہے۔ اس کی پیشکش کے سلسلے میں جوائس نے زبان کو جس فن کاری کے ساتھ برتا ہے اس میں غالباً اس کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

انتظار حسین نے ذکر تو کتھا سرت ساگر کے اتباع کا کیا ہے۔ مگر چپکے سے یولی سیز کو سامنے رکھ لیا۔ اس کی پیروی ہمارے یہاں کسی کے بس کی نہیں۔ فارم دراصل تخئیل کا قدرتی جامہ ہے۔ جوائس کی تخئیل شاید اسی پیرائے میں اپنا اظہار کر سکتی تھی۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا انتظار حسین کی تخئیل کو بھی یہی صورت حال درپیش تھی۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔

یولی سیز کے آخری ۴۵ صفحات جو مولی بلوم کی خود کلامی پر مشتمل ہیں۔ ایسی پیش کش کسی بڑے سے بڑے مصنف کو نصیب نہ ہو سکی۔ وہ نفسیاتی زمان (Psychological Time) کی پیش کش کی بہترین مثال ہے۔ انتظار حسین نے اسی ناول کی طرح جسے بہت سے لوگ ناول ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ماضی اور حال کو گڈمڈ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی سے حال میں اور حال سے ماضی میں پھسلنا اکثر جگہ شعوری لگتا ہے۔ ماضی اور حال کا ملغوبہ ان کے یہاں نفسیاتی زمان کا انداز حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ان کا ماضی شعوری یادوں پر مشتمل ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ انتظار حسین اس تکنیک کو کس طرح برتتے ہیں۔

ناول کی ابتدا ماضی کی یاد سے ہوتی ہے۔ پہلا باب اس ناول کا طویل ترین باب ہے، یہ ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چار مقامات پر حال کے پیوند لگا کر اسے شعور کی رو کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۴۳ صفحے کے اس باب میں زمانہ حال کا ذکر تقریباً ۱/۲ ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ باقی ماضی کی یاد سے متعلق ہے۔ اسے پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص شعوری طور پر اپنے ماضی کو اپنی پچھلی زندگی کو یاد کر رہا ہے ذاکر یادوں کے جنگل میں تھا کہ اس کے قریب والے میدان سے آنے والے نعروں کے شور نے اسے چونکا دیا۔ ذرا اس عبارت کو ملاحظہ کیجیے "باہر جتنا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے میں اندر سمٹتا جاتا ہوں۔ کب کب کی یادیں آ رہی ہیں"

یہ انداز بتا رہا ہے کہ ذاکر شعوری طور پر اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہے۔ چند سطروں کے بعد لکھا گیا ہے "وہ تو اس ساعت تک پہنچنا چاہتا تھا۔ جب اس کے شعور نے آنکھ کھولی تھی۔ مگر وہ ساعت اس کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ جب کسی یاد پہ انگلی رکھی۔ تو اس کے عقب میں یادوں کے دل بادل منڈلاتے نظر آتے۔ پھر وہ یوں چلا کر اس کی یاد کے حساب سے روپ نگر میں سب سے پہلے کون سا واقعہ ہوا تھا"

اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ ذاکر اپنی پچھلی زندگی کو سوچ سوچ کر یاد کر رہا ہے۔ یہ یادیں مرتب ہیں۔ ان میں ربط ہے جب کہ شعور کی رو میں کوئی ربط نہیں ہوتا واقعات میں ربط صرف تلازمہ خیال کا ہوتا ہے، جو یہاں سرے سے ہے ہی نہیں۔ اسے جوائس کا اتباع کہنا جوائس سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ دراصل یہ وہی انیسویں صدی والی تکنیک ہے۔ جس نے اترن کا لباس پہننے کی کوشش کی ہے۔

ماضی سے یعنی یادوں کے جنگل سے زمانۂ حال کی طرف لانے کا کام کئی جگہ ذاکر کے ابا انجام دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں، صفحہ ۲۲ پر ذاکر سبتو کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے یاد کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز آتی ہے "لگتا ہے آج بھی یہ لوگ سونے نہیں دینگے" ابا سے چند باتیں کرنے کے بعد ذاکر پھر یادوں کے جنگل میں چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ابا کی آواز پھر چونکا دیتی ہے "میاں ذاکر یہ کیا ہو رہا ہے"

ذاکر اپنے دوستوں کے ساتھ شیراز میں بیٹھا ہوا ہے۔ باہر شور ہو رہا ہے۔ عبدل نے دروازہ بند کر رکھا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ذاکر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے اور "یادوں کی پریاں اس کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ پھر صابرہ اس کے تصور میں چل پھر رہی تھی"۔

یادوں کے تسلسل میں ذاکر اس وقت کو یاد کر رہا ہے۔ جب فسادات ہو رہے تھے۔ سریندر اور وہ ویاس پور آئے۔ ایک نکڑ سے دونوں الگ الگ راستوں پر ہو لئے۔ سریندر ہندوؤں کے محلے کی طرف اور ذاکر مسلمانوں کے محلے کی طرف۔ اس کیفیت میں ابا کہتے ہیں۔

"ذاکر بیٹے! ارے کچھ سنا تو نے باہر گولی چل رہی ہے"!

کئی جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ذاکر کے "ابا" کو ماضی سے زمانۂ حال میں لانے کی ایک device کے طور پر استعمال کیا ہے۔

شیراز ہی میں ایک اور مرتبہ ذاکر عرفان سے باتیں کر رہا ہے اور باتیں کرتے کرتے وہ ماضی کے جنگل میں چلا جاتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ باتوں کے درمیان کوئی شخص یادوں میں کھو جائے۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو دوستوں کا طنز اسے فوراً چونکا دے گا۔ اس طرح بار بار ماضی کے جنگل میں چلے جانے سے یہی خیال ہوتا ہے کہ یا تو اسے کوئی خاص قسم کا مرض لاحق ہو گیا ہے یا انتظار حسین خود ذاکر ہوں کہ شعوری طور پر اپنے ماضی کی ایک ایک بات سوچ سوچ کر یاد کر رہے ہوں۔

مشرقی پاکستان کے مسئلے پر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جاتی ہے۔ مصنف نے جنگ سے پہلے کی مخصوص فضا کو اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شاید اپنی حب الوطنی کا ثبوت دینے کے لئے بعض لوگوں نے اپنی کاروں پر "کرش انڈیا" لکھ رکھا تھا۔ کہیں علامہ اقبال کے جوشیلے اشعار لکھے ہوئے تھے

جب ہندوستان کا حملہ ہو جاتا ہے یہی کاریں سامان سے لدی پھندی لاہور چھوڑ کر کسی اور جانب بھاگی جا رہی تھیں۔ ان پر لکھا ہوا "کرش انڈیا" ان کا منہ چڑاتا ہوا نظر آتا ہے۔ بھاگنے والوں کا ریلوے پلیٹ فارم پر بھی اسی طرح ہجوم نظر آتا ہے۔ ان میں اکثر وہی لوگ تھے جو بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے تھے۔ نعرے اور اشتہار اکثر ایسے ہی لوگ لکھے

اور لکھواتے ہیں جو حب الوطنی کا ڈھونگ رچاتے ہیں مگر ملک کے لئے قربانی نہیں دے سکتے۔

ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے کے واقعہ کے بعد ذاکر اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا ہے "چلتے چلتے نظر دیوار پر گئی، جہاں ایک بڑا سا اشتہار لگا تھا۔ گھوڑے پہ سوار ہاتھ میں تلوار، صورت خونخوار، یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے۔ اس پہ کوئی ردعمل نہیں ہوا کہ اب وہ تصویر بھی مردہ تھی اور لفظ بھی..... برابر سے موٹر گزری۔ پیچھے لکھا تھا کرش انڈیا، شاید کار والا یہ نعرہ لکھ کر بھول گیا تھا۔"

ذاکر اسی طرح شہر میں گھومتا رہا، وہ سارے نعرے اور اشتہار پڑھتا رہا: "کتنے لفظ مرے پڑے تھے۔ اسے لگا کہ نعرے نہیں پڑھ رہا مری ہوئی مکھیوں پر چل رہا ہے۔"

شکست کے بعد صورت حال پر خواجہ صاحب کو ابا کے جواب میں کتنا حقیقت آگیں نکتہ پوشیدہ ہے "خواجہ صاحب یہ دنیا دار الحساب ہے، انسان جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے۔"

جنگ کے دوران وقت کاٹنے کے لئے ذاکر ڈائری لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ڈائری لکھنے کی ایک وجہ تو خود کو پراگندہ خیالی سے محفوظ رکھنا ہے۔ دوسرے یہ کہ جنگ کے زمانے کی آپ بیتی مرتب ہو جائے گی۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ جان سکے گا کہ جنگ کے دنوں میں کتنا جھوٹ سنا اور کتنا جھوٹ کہا۔"

سب جانتے ہیں کہ ڈائری میں واقعات ہوتے ہیں جو کہ ڈائری نویس کے نزدیک حقیقتاً گزرے ہوں۔ اس میں فکشن کی گنجائش نہیں ہوتی۔ نوعیت کے اعتبار سے فکشن اور ڈائری ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں۔ اس میں کئی دنوں کی ڈائری مستقل افسانوں کی حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً ۷ر اور ۸ر دسمبر کی ڈائری۔

۴ر دسمبر کو امرتسر فتح ہونے کی خبر چاروں طرف سنائی دیتی ہے۔ ۷ر دسمبر کو آگرہ کا ہوائی اڈہ تباہ ہونے کی خبر، ۹ر دسمبر کو لوگوں کے اپنے اپنے گھروں میں تالہ ڈال کر بھاگ جانے کی خبر ہے۔ ۱۰ر دسمبر کی خبر ہے کہ سلامت اور راجل انقلابی سے محب وطن بن گئے ہیں اور سپاہیوں کے لئے تحفے جمع کرتے پھرتے ہیں۔ اس طرح ۱۰ر دسمبر تک ڈائری ڈائری

ہی رہتی ہے۔ اار دسمبر سے ڈائری میں فکشن کی آمیزش شروع ہو جاتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کا ذکر ایک تمثیل کی شکل میں آرائش محفل اور باغ و بہار کی زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ "جھیل کے بیچوں بیچ ایک ہاتھی اور کچھوا ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے، مگر دونوں میں سے نہ کوئی غالب آتا تھا نہ مغلوب ہوتا ہے۔" وہیں ایک مرد فقیر نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں: "میں اس کے روبرو پہنچ کر دست بستہ عرض پرداز ہوا کہ اے مرد بزرگ تو نے کیا دیکھا اور کیا جانا کہ ایسا کلمہ زبان پر لایا۔ وہ بولا کہ اے عزیز آدمی تین چیزوں کے ہاتھوں خوار ہوتا ہے، عورت کے ہاتھوں جب وہ وفادار نہ ہو۔ بھائی کے ہاتھوں جب وہ حق سے زیادہ مانگے، علم کے ہاتھوں جب وہ ریاضت کے بغیر حاصل ہو جائے۔"

جب ذاکر اس مرد فقیر کی بات نہ سمجھ سکا تو اس نے ایک داستان کے ذریعہ اسے سمجھانے کی کوشش کی اور تمثیل کے پیرائے میں برصغیر کی تقسیم کا حال اور ہندوستان پاکستان کے درمیان لڑائی کی وجہ بیان کی۔

مرد فقیر کی باتیں سن کر ذاکر اس بستی سے دور نکل گیا۔ ایک اور بستی میں جا پہنچا۔ اس بستی کا حال فسانۂ آزاد کی صورت میں سنئے: "قریب پہنچا تو کیا دیکھا کہ ایک نئی مرز بوم، شہر خریب، فضا مرغوب، باغوں میں اشجار ثمر دار، انواع و اقسام کے گل، گل پھول رنگ رنگ کے.... کوئی نازک پدمنی جھولے میں جھولتی ہے۔ آرسی میں اپنا روئے زیبا دیکھتی ہے، کہتی ہے۔ اللہ ری میں۔" تقریباً یہی الفاظ فسانۂ عجائب کی ماہ طلعت آئینہ دیکھ کر ادا کرتی ہے۔

ایک اور حسینہ کا حال سنیئے: "کسی گل رو کا عالم یہ تھا۔ آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پہ مستی کی دھڑی، سینا چھلکا پڑتا ہے۔ دوپٹہ ڈھلک ڈھلک جاتا ہے۔ پیٹ صندل کی تختی، ناف سونے کی پیالی پیر ڈوجیسے پیڑے۔ آگے پردہ داری ہے شرم کی عملداری ہے۔ قیاس کن ز گلستان من بہار مرا جی کی قسمت یاوری کرے اور ہمت ساتھ دے۔ وہ

غوطہ مارے اور گنگا نہائے، رہمت کو شناوری مبارک!"

اس اقتباس ایک غور طلب بات یہ ہے کہ جس عورت کی ناف سونے کی پیالی کی طرح ہوگی۔ اس کا پیٹ کتنا بڑا ہوگا۔ اگر پیٹ صندلی کی تختی کی مانند سپاٹ اور ہموار ہوگا تو اس قدر گہری ناف کا ہونا ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس عبارت میں عریاں اشارے بے ضرورت آگئے ہیں ان کا جنگ یا شہر کی حالت سے کوئی تعلق نہیں۔

اس دن کی ڈائری میں ایک اور پرلطف منظر دیکھئے۔ ایک دفعہ تو میں الف لیلہ کا ابوالحسن بن گیا۔ گلی کوچوں میں پھرتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ آنکھیں کھلیں عجیب منظر نظر آیا۔ حق دق رہ گیا۔ جس سر پر نظر گئی اسے غائب پایا۔ آدمی صحیح وسلامت کھوپڑی غائب! کھوپڑیاں غائب ہونے کی وجہ ایک مرد معمر نے یہ بتائی کہ ہماری کھوپڑیاں ہمارے بادشاہ کے سانپوں کی غذا بن گئیں۔

ڈائری نویس اس راز کو جاننے کے لئے اس مقام پر جانا چاہتا ہے جہاں کھوپڑیاں تراشی جاتی ہیں۔ مرد معمر اسے منع کرتا ہے۔ ڈائری نویس کی ضد ہمیں حاتم طائی کے کوہ ندا کا راز جاننے کے واقعہ کی یاد دلاتی ہے۔

اس دن جن دو افراد کی کھوپڑیاں تراشی جانے والی تھیں۔ وہ دربار کے منتخب دانشور تھے۔ ان کی کھوپڑیاں تراش کر طشت میں رکھ کر سانپوں کے سامنے پیش کی گئیں۔ مگر سانپ منہ مار کر الگ ہو گئے اور غصہ میں پھنکارنے لگے۔ بادشاہ کے ناراض ہونے پر مقربین نے بتایا کہ یہ کھوپڑیاں مغز سے خالی تھیں۔ اس لئے سانپ کیا کھاتے شاید مصنف نے اس داستانی پیرائے میں یہ طنز کیا ہو کہ آج کل کے دانشوروں کی کھوپڑیاں دماغ سے خالی ہوتی ہیں۔ بہرحال ڈائری میں اس قسم کی داستان طرازی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ البتہ اس پورے حصہ کو ایک مستقل افسانہ کی شکل میں پیش کیا جا سکتا تھا اور مداح اس کا کوئی نہ کوئی مطلب نکال ہی لیتے۔

۱۲ر دسمبر کی ڈائری کا یہی حال ہے۔ اس میں ایک راجہ اور جنی مہارانی کی علامتی

گفتگو سید انشا کی رانی کیتکی اور کنور اودھے بھان کی کہانی کی زبان میں پیش کی گئی ہے۔ یہ ڈائری ہے یا کسی پاگل کا خواب بیداری۔

۱۳ دسمبر کی ڈائری ذرا اہم ہے۔ یہ اس خبر سے شروع ہوتی ہے "ساتواں بحری بیڑا چل پڑا ہے" ہر طرف اس خبر کا چرچا ہے۔ ظاہر کہ شکست خوردہ قوم کو اسی سے بڑی ڈھارس بندھی ہے۔ ڈائری نویس کو شاید تلازمۂ خیال کے نظریے کے تحت ایک اشتہار یاد آتا ہے۔ جو اس نے کسی دیوار پر لگا دیکھا تھا۔ یہ غدر کے زمانہ کے حالات کے متعلق ہے۔ اشتہار میں درج ہے کہ بہادر شاہ کی مدد کے لئے ایرانی لشکر چل پڑا ہے۔ دلی کے شکست خوردہ لوگوں کی ذہنی کیفیت اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے پاکستانیوں کی مایوسانہ توقعات میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ بے سروسامانی دونوں جگہ تھی۔ مگر ۱۸۵۷ء کی دلّی کی یہ حالت بھی نہیں تھی۔ اس میں حد درجہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ دلّی والوں کے سامنے بڑے تلخ حقائق تھے۔ یہ مضحکہ خیز منظر ان حالات میں بھی ناممکن تھا۔ یہ محض مسخروں کی نقل معلوم ہوتی ہے۔

"چھاوڑی میں اور نقشہ دیکھا لوگ لٹھ پونگے لئے کھڑے ہیں۔ ایک چارپائی کی پٹی لے گھر سے نکلا اور صف میں آن شامل ہوا۔ دوسرا پھکنی سے مسلح گھر سے برآمد ہوا۔ اور بازو تولتا ہوا بیچ سڑک آن ڈٹا۔ میں نے قریب جاکر رازدارانہ پوچھا "عزیز کیا نیت ہے"؟ پھکنی والے نے کڑک کر کہا "توڑیں گے"

میں نے پھکنی والے پھر چارپائی کی پٹی والے کو حیرت سے دیکھا اور آگے بڑھ لیا۔ پھر خود ہی حیرت رفع ہو گئی۔ ٹھیک ہے لڑنے والے پھکنی، چمٹے اور چارپائیوں کی پٹیوں سے بھی لڑ لیتے ہیں جنہیں نہیں لڑنا ہوتا وہ تیار توپوں اور بحری بیڑوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں" یہ ساری عبارت اس لئے پیش کی گئی ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے واقعہ پر طنز کیا جائے۔

یہ مضحکہ خیز ڈائری اسی طرح ۱۳ سے ۱۶ دسمبر تک پاکستان اور ۱۸۵۷ء کے کے حقائق پر مشتمل ہے۔ سوچ میں تو ممکن ہے کہ تلازمۂ خیال پچھلے واقعات کی تصویر

سامنے لے آئے۔ مگر ڈائری میں ایسا ہرگز ممکن نہیں۔

ان چاروں کی ڈائری کی اگر اہمیت ہے تو یہ ہے کہ اس میں دلی کی کرخنداری زبان کا بہت اچھا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ جو بات زبان سے کہی جا سکتی ہے لسے لکھا بھی جا سکتا ہے۔ منٹو کے یہاں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ مگر منٹو نے بہت سی ناگفتنی باتوں کو گفتنی بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے یہاں قابل اعتراض نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ کرشن چندر نے "شکست" میں ماں اور بہن کی گالیوں کو مخفف کر کے گوارا بنا دیا تھا۔ مگر عبداللہ حسین نے "اداس نسلوں" میں جو پوری پوری گالیاں درج کر دی ہیں۔ اس سے عبارت نہایت بھونڈی اور بدنما ہو گئی ہے۔

انتظار حسین کے یہاں روانی میں چند جملے نکل گئے ہیں۔ جن سے عبارت میں سچائی کا رنگ تو آ گیا۔ مگر ساتھ ہی بھدا پن بھی پیدا ہو گیا۔ مثلاً: "اے حضت پھر ایسا ان بھی کوتی پتلا نہیں موتتا۔" — "ڈھڈو کے تجھے لبنت کی بھی خبر ہے۔"

ذاکر کی ایک لندن پلٹ دوست انیسہ جو کافی تجربہ کار ہے۔ ذاکر کی کار کے بارے میں کہتی ہے: "سیکنڈ ہینڈ زیادہ رواں چلتی ہے۔" اس ذو معنی جملہ کے ایک مفہوم میں کافی عریاں اشارہ پوشیدہ ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں لکھا تھا انتظار حسین کو تجربے کرنے کا شوق ہے۔ انہوں نے اس ناول میں زبان کے بھی کئی نمونے پیش کئے ہیں۔ "فسانۂ عجائب" کی زبان کا نمونہ پچھلے صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ خطوط غالب کی زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"جہاں آباد خرابہ بن چکا ہے۔ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور بازپرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں۔ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے کے باہر نہیں نکل سکتا۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔"

زبان کے مختلف نمونے درج کر کے شاید انتظار حسین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں زبان پر

عبور حاصل ہے، وہ ہر قسم کی زبان لکھ سکتے ہیں۔ زبان پر ان کا عبور مسلّم مگر ناول میں اس قسم کی شعبدہ بازی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

مصنف نے جس طرح ماضی اور حال کو گڈمڈ کر کے نفسیاتی زمان کا رنگ دینے کی کوشش کی، اس میں وہ ناکام رہے ہیں۔ ابنِ انشا نے ایک مرتبہ "جنگ" میں ایک کالم لکھا تھا کہ ایم اسلم کے کسی سلسلہ ہی تاریخی ناول اور ان کے پبلشر کے باغبانی کے سودے کی کتابت ایک ہی کاتب کر رہا تھا۔ اتفاق سے ان کے اجزاء گڈمڈ ہو گئے ہوں گے۔ کسی مجاہد کے کارنامے بیان ہوتے ہوتے چوزوں کی خوراک کا ذکر آجاتا ہے۔ ایسا ہی انداز کئی جگہ "بستی" میں نظر آتا ہے۔

۱۷ دسمبر کی ڈائری میں پاکستان کی شکست کے بعد کی صورتِ حال کا ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی فتح کے بعد کی صورتِ حال سے تقابل کی خاطر تانتیا ٹوپی کی گفتگو درج کی ہے۔ مصنف تانتیا ٹوپی کو بتاتا ہے کہ دِلّی کا زوال ہو چکا، لکھنؤ کی بساط الٹ چکی۔ جھانسی کی رانی ماری گئی۔ گویا ہندوستان جنگ ہار چکا ہے اور اب لڑنا بے سود ہے۔" تانتیا ٹوپی کہتا ہے "میرے پتر! پہلے میں ہندوستان کا تخت بچانے کے لئے لڑ رہا تھا۔ اب ہندوستان کی آتما بچانے کے لئے لڑ رہا ہوں۔ وہ لڑائی ہار گیا یہ لڑائی نہیں ہاروں گا۔" آگے چل کر کہتا ہے "تم مسلمان لوگ اب صرف تخت کے لئے لڑتے ہو۔" یہ مختصر گفتگو ہماری ذہنیت پر بڑا اچھا طنز ہے۔

آخر میں ذاکر اپنے باپ کی قبر کی دیکھ بھال کے لئے قبرستان جانا چاہتا ہے۔ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اسے بتایا کہ اس کے باپ کی قبر بیٹھ گئی ہے۔ اس کی ماں نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہیں مانا۔ مال روڈ پر گولیوں کا مینہ برس رہا ہے۔ لوگ جنونی ہو رہے ہیں۔ جگہ جگہ آگ لگی ہوئی ہے۔ ذاکر اسی دن اس لئے جانا چاہتا تھا کہ کل کا کوئی بھروسہ نہیں۔

ذاکر گھر سے چلا تو اسے سڑک بالکل سنسان نظر آئی۔ سڑک پر اینٹوں کے ٹکڑے اور کاروں کے شیشے بکھرے ہوئے تھے۔ سپاہی لاٹھیاں لئے قطار در قطار کھڑے تھے۔ آگے بڑھتا ہے تو بہت بڑا جلوس ملتا ہے۔ پھر اس جلوس کی مڈبھیڑ سپاہیوں

سے ہوتی ہے۔ دفعتاً ایک شور اٹھا، گولی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ بھگدڑ، نعرے، گالیاں برستی ہوئی اینٹیں، چلتی ہوئی گولیاں۔ ایسے جلوس میں گھر جانے کے بعد شاید دیوانہ بھی آگے نہ بڑھے مگر ذاکر پھر بھی قبرستان جا پہنچا ہے۔ قبرستان دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ صورت حال مصنف کو کوفہ کی یاد دلاتی ہے۔ جب حضرت حسین کا ایلچی بیعت لینے کے لئے وہاں پہنچا تھا۔ اس کے بعد خیالات کی رو گوتم بدھ کے زمانے میں جا پہنچی ہے۔ پھر کوفہ کے قتل و غارت کا ذکر ہے۔ قبرستان میں اس کی ملاقات افضال سے ہو جاتی ہے جو اپنی نانی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا تھا۔ آخر میں وہ دونوں شیراز کی طرف چل نکلتے ہیں اور پھر تھوڑی سی بے معنی گفتگو کے بعد کتاب اختتام کو پہنچتی ہے۔

اس ناول میں شیراز کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے جہاں ذاکر اور اس کے دوست اجمل، سلامت، عرفان اور افضال روزانہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ چائے پیتے ہیں اور حالات حاضرہ پر رائے زنی کرتے ہیں۔ اجمل اور سلامت انقلابی ہیں۔ سلامت کو بہت جوشیلا انسان ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ ہر وقت تقریر کرتا نظر آتا ہے۔ اس کا جوش و خروش اس کے ڈیل ڈول سے مناسبت نہیں رکھتا۔ افضال اس کے متعلق کہتا ہے "جب میں اس مکروہ آدمی آواز سنتا ہوں تو لگتا ہے کہ اسکوٹر میں ٹرک کا ہارن لگ گیا ہے۔ جب اس کے سر پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے وہ شاہدولہ کا چوہا نظر آتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس کے سر کو چھو کے دیکھوں مگر میری طبیعت گجگجا جاتی ہے۔ جیسے کوئی گلگلی چیز چھو لی ہو۔ میں ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔"

سلامت کمیونسٹ ہے۔ وہ اپنے باپ کو جاہل کہتا ہے اور اسے باپ ماننے سے انکار کر دیتا ہے خود کو فخریہ حرامزادہ کہتا ہے۔ یہی حال اجمل کا بھی ہے۔ سلامت کہتا ہے:-

"یار ہمارے مکروہ باپوں نے ہمیں برباد کر ڈالا" جب وہ جوش میں آتا ہے تو اپنے عزیز دوستوں سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے "کتو! تمہیں اب ہوش میں آنا ہوگا۔ حساب کا وقت آگیا ہے۔ حساب دینا ہوگا۔ تمہیں، مجھے سب کو۔"

پہلے وہ مشرقی پاکستان کی شورش کو آزادی کی جدوجہد کہتا تھا جب جنگ چھڑ گئی تو وہ

اور اجمل انقلابی سے محبِ وطن بن گئے اور سپاہیوں کے لئے تحائف جمع کرتے پھرے۔ اس کے بعد وہ شدت سے اسلام پسند بن گئے۔ سلامت کا باپ اگر ایسے بیٹے کی موت کی تمنا کرتا ہے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے۔

سلامت گھر میں بھی اسی طرح لیکچر دیتا رہتا ہے۔ اس کا باپ کہتا ہے کہ پہلے وہ اسے سوشلزم پڑھاتا تھا۔ پھر اسلام پڑھانے لگا۔ اس کا اندازِ گفتگو ایسا ہے کہ عزیز دوست بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

شیراز آنے والوں میں ایک شخص زوار بھی تھا جو بزعمِ خود پکا کمیونسٹ تھا۔ وہ خاصا ذہین انسان تھا۔ انٹلکچوئل بحثوں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ وہ ذاکر کے تمام دوستوں سے کم عمر تھا مگر اس نے اپنی ذہانت کی دھاک بٹھا دی تھی۔ اس نے بے شمار کتابیں پڑھی تھیں۔ اس نے خوب آوارہ گردی کی اور آگہی کی تلاش میں شراب، چرس، گانجا، افیون سب ہی کچھ آزمایا۔ وہ نہانے دھونے، اُجلے کپڑے پہننے اور حجامت کو تضیعِ اوقات کہتا تھا۔ وہ سی۔ ایس۔ پی کے امتحان میں بیٹھا اور کامیاب ہو کر شاید مجبوراً افسر بن گیا۔ حالات سے اس طرح سمجھوتہ کر لینے والے ہمارے ہاں بہت ہیں۔

شیراز کے اس گروپ کا ایک اہم کردار افضال ہے۔ وہ بے ضرر انسان ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کو "چوہے" کہہ کر خطاب کرتا ہے۔ ان کے لئے پرانے قصّے والے "پائیڈ پائپر" کا رول ادا کرنا چاہتا ہے۔ وہ سلامت اور اجمل کو مکروہ انسان کہتا ہے، ذاکر کے والد کو طیب، معصوم اور بچہ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی حماقت زدہ باتوں کو بھی مصنف نے شاید انٹلکچوئلزم کے طور پر پیش کیا ہے۔

اسے برگد کا درخت پسند ہے۔ اس لئے کہ بقول اس کے نروان تو برگد کی چھاؤں ہی میں ملتا ہے۔ ذاکر کے اس اعلان پر کہ وہ آجکل عشق کر رہا ہے۔ افضال اس سے کہتا ہے کہ عشق کرنے کے لئے آدمی کو طیب ہونا چاہیئے۔ وہ خود کو طیب کہتا ہے۔ مگر عشق اس لئے نہیں کر سکتا ہے کہ وہ مصروف بہت ہے۔ اس کی مصروفیت یہ ہے کہ اس کا کافی وقت چڑیوں اور پیڑوں کی سنگت میں گزر جاتا ہے۔

ایک دن وہ ذاکر سے کہتا ہے "میں یہاں پھولوں سے کبھی کبھی ملاقات کرنے آیا کرتا ہوں، پھولوں سے اور درختوں سے۔ اچھے لوگ ہیں۔ سب اپنے یار ہیں۔" یہاں آنے کی ایک اور وجہ یہ بیان کرتا ہے "میں نے سوچا کہ دیکھنا چاہیئے شکست کی صبح کیسے چڑھتی ہے۔"

اس کی ذہانت کا ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجیئے۔ وہ ذاکر سے کہتا ہے "یار! پاکستان کا انتظام میں ہاتھ میں نہ لے لوں..... یار میں نے اب یہی سوچا ہے۔ اگر دو طیب آدمی مجھے مل جائیں اور میرے بازو بن جائیں تو یہ ذمہ داری سنبھال لوں..... ان بدصورتوں نے پاکستان کی صورت بگاڑ دی ہے۔ بہت مکروہ لوگ ہیں۔"

افضال کو بقول خود کچھ مربعے الاٹ ہونے والے ہیں۔ ان مربعوں کے بارے میں اس کے منصوبے ملاحظہ ہوں "یار! پاکستان میں پھول بہت کم ہو گئے ہیں، جب ہی تو لوگ بدصورت ہوتے چلے جا رہے ہیں اور نفرت پھیلتی جا رہی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ ان بدبختوں کی صورتوں کو مسخ ہونے سے بچایا جاتے تو منصوبہ یہ ہے کہ ایک مربع میں گلاب کے تختے ہوں۔ دو مربعوں میں آموں کا باغ ہو گا۔ یار بات یہ ہے کہ مکروہ آوازیں سن سن کر میری سماعت خراب ہو گئی ہے۔ آموں کا باغ ہو گا تو کوئل کی آواز تو سنائی دے گی۔ کیوں کیا خیال ہے۔"

شیراز والے گروپ میں ایک معقول آدمی نظر آتا ہے وہ عرفان ہے۔ شاید اسی لئے بقول بعض وہ پاکستان میں ذاکر کے ہم جماعت سرینڈر کا بدلہ ہے اور ذاکر کا راز دان ہے۔"

جب بھی پاکستان میں کوئی گڑبڑ ہوتی ہے۔ ایک سوال بہت سے لوگوں کے ذہن میں آتا ہے۔ چنانچہ ذاکر بھی عرفان سے پوچھتا ہے "یار، پاکستان ٹھیک بنا تھا؟" اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں۔ شاید اس کا جواب کوئی نہ دے سکے۔ عرفان اس کا ایک نہایت معقول جواب دیتا ہے۔ "غلط لوگوں کے ہاتھوں میں آکر صحیح بات بھی غلط ہو جاتی ہے۔"

مصنف نے شیراز کے اس گروپ کو شاید INTELLECTUALS کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ لوگ INTELLECTUALS کے بجائے پاگل زیادہ نظر آتے ہیں۔ سفید سر والا پُراسرار ہستی کی طرح نمودار ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس قصے میں بے مصرف نظر آتا ہے۔ وہ ٹھیک سے مسخرہ بھی نہیں بن پاتا۔ جہاں تک اس گروپ کی پیش کش کا تعلق ہے۔ انتظار حسین پر قرۃ العین حیدر کا سایہ نظر آتا ہے۔

ذاکر کے والد سیدھے سادے مذہبی انسان ہیں۔ وہ حقیقی شیعہ عقائد کے نمائندے ہیں۔ وہ حالات سے اتنے بے خبر ہیں جتنے کہ بھگت جی۔ وہ زلزلہ آنے کی وجہ اس گائے کے سینگ بدلنے کو قرار دیتے ہیں۔ جس نے اپنے سینگوں پر زمین کو اٹھا رکھا ہے۔

وہ شیعوں میں مروّج بہت سی باتوں کو خلاف مذہب قرار دیتے ہیں۔ وہ مسجد میں بجلی لگوانے کو بھی بدعت کہتے ہیں مگر مسجد والے چپکے سے لگوا لیتے ہیں۔ وہ طیب ہونے کے ساتھ ساتھ معصوم بھی ہیں۔

ان کی اور ان کی بیوی کی بے خبری کا عالم یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء تک وہ ہندوستان میں چھوڑے ہوئے مکانوں کی چابیوں کو سنبھال کر رکھے ہوتے ہیں۔ حالانکہ انہیں بہت عرصہ پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ ان مکانوں میں شرنارتھی مقیم ہیں۔ ایسے مکانات کو شروع ہی میں حکومت نے قبضے میں لے لیا تھا۔ ذاکر کی ماں کہتی ہیں: "ارے میں ایک مرتبہ تالا کھول کے چیزوں کو کم سے کم دھوپ تو لگا آتی۔" ذاکر کے والد چابیوں کا گچھا ذاکر کو دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "یہ چابیاں امانت ہیں۔ اس امانت کی حفاظت کرنا اور چھوڑی ہوئی زمین کے احسانوں کو یاد رکھنا کہ تمہاری سب سے بڑی سعادت مندی ہوگی۔"

چابیوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ جیسے یہ لوگ جائیں اور انہیں مکانات واپس مل جائیں گے۔ چابیوں کا بار بار تذکرہ بڑا مضحکہ خیز لگتا ہے۔

سریندر کے طویل خط کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ذاکر نے سریندر کو کوئی خط نہیں لکھا پھر سریندر

کو کیسے پتہ چلا کہ ذاکر پاکستان میں نیم کا پیڑ تلاش کرتا پھرتا ہے۔ سریندر کو صابرہ تاریخ کا ایک عجوبہ نظر آتی ہے۔ جو باتیں مصنف نے سریندر سے خط میں لکھوائی ہیں اگر وہ ضروری تھیں تو انہیں کسی اور طریقہ سے بھی کہا جا سکتا تھا۔ سریندر کی زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو: "کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید بالپن میں، میں نے کسی رشی مُنی کا اپمان کیا تھا اور اس نے مجھے سراپ دیا تھا کہ تیری جنم بھومی تجھے درشن دینا بند کر دے گی۔ سو ویاس پور کی نگری اب مجھے درشن نہیں دیتی۔" اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اردو اتنی ہی جانتا ہو گا جتنا کہ یوپی کا کوئی ہندی خواں ہندو۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ علامہ اقبال سے اور ان کے فلسفے سے واقف ہو گا۔ سریندر کی عبارت ملاحظہ ہو: "پتہ نہیں یہ تمہاری تاریخ کا کمال ہے یا تہذیبوں کی تاریخ ہی اس طور پر چلتی ہے۔ شمشیر و سنان اوّل اور آخر؟ تمہارے حکیم الامت کی نظر اس آخر پر بھی تھی یا نہیں۔ تقدیرِ اُمم کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔"

اسی طرح یہ عبارت بھی سریندر کے قلم سے عجیب لگتی ہے "یار تم مسلمان لوگ خوب ہو۔ یوں عرب کے صحراؤں کی طرف دیکھتے ہو مگر قبروں کے لئے تمہیں ہندوستان کی چھاؤں بھاتی ہے۔ یہاں پیچھے رہ جانے والے بوڑھوں کو دیکھ کر میں نے یہ جانا کہ مسلمانوں کی تہذیب میں قبر کتنی بڑی طاقت ہے۔"

اس ناول میں ذاکر کہیں راوی ہے یعنی اس کے لئے صیغۂ واحد متکلم استعمال ہوا ہے اور کہیں اس کے لئے صیغۂ واحد غائب یعنی "وہ" استعمال کیا گیا ہے۔ شاید کسی اور ناول نویس نے یہ انداز برتا ہو۔ مجھے اس کا علم نہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ بھی مصنف ہی کی ایجاد ہو۔

صابرہ اس ناول کا ایک اہم کردار ہے۔ بعض لوگوں نے ان کے ناولٹ "دن" کی تہمینہ اور صابرہ کو یکساں قرار دیا ہے۔ انتظار حسین اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں: "ایک بار ایک بین بی بی نے کیا خوب تاڑا کہا کہ سچی! میں صابرہ کوئی نیا کردار نہیں یہ تو وہی تہمینہ ہے۔ ہاں بالکل۔ مجھے آئے دن نئی عورتیں تلاش کرنے کا چسکا نہیں۔ میرے لئے ایک عورت بہت ہے۔"

یہ اصول زندگی کے لئے تو ٹھیک ہے مگر ناول میں کم از کم اہم افراد میں تو انفرادیت ہونی چاہیئے۔ مختلف ناولوں میں کرداروں کی یکسانیت یقیناً ایک عیب ہے۔ اس قسم کے اعتراض

کا جواب شہر نے انتظار حسین سے بہتر دیا تھا۔ اعتراض کا مذاق اڑا لینے سے اعتراض ختم نہیں ہو جاتا۔

صابرہ کو جس طرح درمیان میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس طرح تقسیم کے بعد بہت سی صابرائیں ہندوستان میں رہ گئیں اور ان کے ذاکر پاکستان چلے آئے اور پلٹ کر ان کی خبر بھی نہ لی۔ لوگ اپنی بیویوں تک کو چھوڑ آئے اور یہاں آکر دوسری شادی رچا لی۔ اس عظیم انقلاب میں بہت کچھ ہوا گفتنی بھی اور ناگفتنی بھی۔

بہرحال جہاں تک صابرہ کا تعلق ہے وہ غالباً اس ناول کا سب سے توانا کردار ہے۔ اس کا ذاکر سے قرب اور پھر ہندوستان میں اکیلے رہ جانے پر اس کی استقامت میں کوئی بات خلاف قیاس نہیں۔ اس کے مقابلے میں ذاکر کا کردار کافی پست نظر آتا ہے۔

ذاکر نے بچپن میں سب سے پہلے وشنی میں دل چسپی لی۔ مگر اس نے اسے مُسلا سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ صابرہ سے ملاقات کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے میں دل چسپی لیتے رہے۔ عمر کے ساتھ دل چسپی رنگ بدلتی رہی۔ جب ذاکر کالج میں پڑھتا تھا صابرہ کا سراپا یہ تھا: "اس کا سینہ کتنا ابھر آیا تھا کہ ہمیشہ اسے دوپٹے سے ڈھکے رکھتی پھر بھی گول گول ابھار چھلکتے چھلکتے دکھائی دیتے۔"

پاکستان آجانے کے کافی عرصہ بعد وہ اپنی ایک شاگرد تسلیم میں دل چسپی لیتا ہے۔ مگر وہ ذاکر کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ البتہ وہ جاتے جاتے دروازہ کھول جاتی ہے جو کہ مدت سے بند پڑا تھا۔

اس کے بعد اس کی ملاقات اپنی لندن پلٹ اور تجربہ کار دوست انیسہ سے ہو جاتی ہے۔ اس کا سراپا ملاحظہ ہو:۔ "مگر اب اس کے جسم کے زاویے خوب ابھر آئے تھے اور گولائیاں خوب نمایاں ہو گئی تھیں۔ بھرے بھرے بازو، کمر اور کولھے کا خوشگوار نشیب فراز، بھری بھری گات، امڈتا چھلکتا سینہ،" وہ ذاکر کی باتوں سے پہچان جاتی ہے کہ ذاکر عشق کا تجربہ کر چکا ہے۔ وہ ذاکر کو بتا دیتی ہے کہ وہ مشکل لڑکی ہے۔

اسے آزاد خیال سمجھ کے ذاکر کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ "گاڑی چلاتے چلاتے ایک ہاتھ وہیل سے اٹھایا اور اس کے برہنہ بازو پر رکھ دیا۔ اس مردانہ جرأت پر اس نے کوئی

داد نہیں دی، حوصلہ شکنی بھی نہیں کی۔ بازو کو سہلاتا ہوا میرا ہاتھ شانے پر گیا۔ شانے کا سفر کرتا ہوا جب سینے کی طرف بڑھنے لگا تو اس کی طرف سے ہدایت جاری ہوئی "آگے نہیں"

تھوڑے آگے جا کر ذاکر نے بریک لگا دیئے اور گاڑی روک دی ،، میں انیسہ کے قریب سرک آیا۔ اتنا قریب کہ میں اپنے جسم سے اس کے کولہے کی نرمی اور گرمی کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرے۔ بکھری زلفوں کے ساتھ پھسلتی پھسلتی انگلیاں نرم شانوں پر اتر آئیں، شانوں سے پھسلواں بازو پر، پھر میں نے آہستگی اور نرمی سے اس کے امڈتے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔"

ذاکر اسے اس کے گھر چھوڑنے گیا! اس نے ذاکر سے کہا۔ "آؤ تمہیں کافی پلاتے ہیں"۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس کا کمرہ الگ تھلگ ہے۔ مگر ذاکر نے شاید حماقت میں اس کی دعوت قبول نہ کی اور گھر چلا آیا۔

اس عبارت پر میں کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا ایسی وضاحت کے بغیر ناول شاید جدید ناول نہیں بن پاتا۔

راجہ گدھ

بانو قدسیہ

۵٦۴ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کہانی کا مورل صرف اتنا ہے کہ رزق حرام رنگ لا کر رہتا ہے اور اس کا اثر نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ مصنفہ نے اس نکتے کو واضح کرنے کے لئے تقریباً اسی قبیل کا طریقہ اختیار کیا ہے جو مولانا روم نے دفتر پنجم میں کنیز اور گدھے کی حکایت میں برتا ہے۔

ناول کا قصّہ واحد متکلم کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ طریق کار خاصہ دشوار ہوتا ہے اس میں ہر کردار اور ہر بات کو راوی کے توسط سے ہی بیان کرنا پڑتا ہے۔ انکشافات اور واقعات کی دروبست سب راوی ہی کے واسطے سے قارئین تک پہنچائے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے یہ دشوار مرحلہ اس خوبصورتی کے ساتھ طے کیا ہے کہ کہیں بھی خلا محسوس نہیں ہوتا۔

ناول کی ابتدا پروفیسر سہیل کی سوشیالوجی کی کلاس کے لڑکے لڑکیوں کے تعارف سے ہوتی ہے۔ ابتدا ہی میں تین کرداروں کو نمایاں کر دیا گیا ہے۔ بقیہ قصّہ کسی نہ کسی حد تک انہی کرداروں کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔

ان میں سے ایک گلبرگ کی معاشرے کی پیداوار سیمی شاہ ہے جو ایک بیوروکریٹ

خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ خاصی ذہین۔ حلیہ اور انداز کے اعتبار سے الٹرا ماڈرن
دوسرا آفتاب ایک دولت مند کشمیری خاندان کا فرد جو سکس ملین ڈالرمین کی طرح بھاری
آواز میں اپنے تعارف کا افتتاح اس طرح کرتا ہے "ویسے میری Reputation
والدین کے خوف اور اللہ کے فضل سے اچھی ہے۔" آفتاب ذہین بھی ہے اور وجیہہ بھی،
تیسرا راوی ہے جو سیمی شاہ کے پیچھے بیٹھتا ہے اور اس کے کرتے کے نیچے سے
اس کی باڈیس کے الاسٹک ہک اور اوپر جلنے والی طنابوں کو دیکھ دیکھ کر
خوف زدہ ہوتا رہتا ہے۔

پروفیسر سہیل ان طالب علموں سے صرف ۵-۶ سال بڑا تھا۔ جسے بڑا ذہین
استاد کہا گیا ہے۔ پہلے ہی لیکچر میں طالب علموں کے سامنے سوال پیش کرتا ہے کہ
خودکشی جسے عموماً پاگل پن کی ایک معکوس شکل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی حقیقی وجہ کیا ہے۔
پھر وہ اس موضوع کو assignment کے لئے دے دیتا ہے۔ شاید سب
سے اچھا assignment مصنفہ پیش کرتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ ناول بھی ایک
اعتبار سے اسی سوال سے بحث کرتا ہے۔

کلاس میں اس سوال پر جس انداز سے گفتگو ہوتی ہے۔ جس طرح نکتے پیدا کئے
جاتے ہیں۔ اور جس قسم کے آوازے کسے جاتے ہیں۔ اس سے یہ کسی کلاس روم کی نہیں
بلکہ بازار کی یا کالج کے لان کی گفتگو معلوم ہوتی ہے اور جس استاد کی کلاس میں اس
قسم کی فضا ہو، اسے کسی بھی طرح کامیاب اور ذہین استاد نہیں کہا جاسکتا

ابتدا ہی میں تین چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ سیمی شاہ کی ذہانت، حسن،
آزادروی اور بے باکی، آفتاب کی وجاہت، ذہانت اور خوداعتمادی اور پروفیسر
سہیل کا علم اور تدریس کا غیر روایتی انداز۔ پھر قصہ آگے بڑھتا ہے تو سیمی کے پیچھے بیٹھنے
والا طالب علم بھی سامنے آتا ہے جو سیمی شاہ کو ہر وقت للچائی ہوئی نظروں سے
دیکھتا رہتا ہے۔ یہی اس قصے کا راوی قیوم ہے۔ جس کا نام بھی کافی دیر بعد بتایا
جاتا ہے۔

قصہ آگے بڑھتا ہے تو ایک مثلث سا بن جاتا ہے جس میں Vertex راوی ہے اور دوسروں پر سیمی شاہ اور آفتاب ہیں۔ جس انداز سے یہ دونوں سامنے آتے ہیں۔ اس کی رو سے ان کا ایک دوسرے کے قریب آجانا ایک منطقی نتیجہ تھا دونوں کچھ عرصہ تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور راوی خاموش تماشائی بنا سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ سیمی اور آفتاب کی محبت نتیجہ خیز اس لئے ثابت نہ ہو سکی کہ دونوں میں چند باتیں مشترک ہونے کے باوجود بڑا اختلاف تھا سیمی الٹرا ماڈرن، آزاد گھر سے بے نیاز، وہ کہاں ہوتی ہے، کیا کرتی ہے، کہاں جاتی ہے، کسی کو اس سے دلچسپی نہیں لاہور میں گھر ہوتے ہوئے وائی ڈبلیو سی میں رہتی ہے۔ اس کے برعکس آفتاب گھر والوں کے قابو میں ہے۔ وہ ایک دولت مند قالین فروش کا بیٹا ہے۔ اسے زیبا سے محبت نہیں مگر خاموشی کے ساتھ اس سے شادی کر لیتا ہے۔ کوئی مزاحمت نہیں کرتا سیمی کو غیر جذباتی انداز میں مطلع کر دیتا ہے۔ آفتاب کے سیمی سے علیحدہ ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ پروفیسر سہیل جو کہ خود بھی سیمی پر فریفتہ تھے۔ آفتاب کو سیمی سے بدظن کر دیا تھا کہ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ نیز یہ کہ اس میں محبت تو تھی وفا نہ تھی۔

راوی اور آفتاب ہاسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ مگر آفتاب نے اس سے کبھی سیمی کے متعلق بات نہیں کی۔ باتیں کیں تو اس وقت جب آفتاب کالج اور ہاسٹل چھوڑ چکا تھا اور اس کی شادی ہونے والی تھی۔

اس کے بعد مثلث کے دونوں سرے ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں اور ان کا ذہنی رابطہ Vertex کے توسط سے قائم رہتا ہے۔

شادی کے بعد آفتاب اپنی بیوی زیبا کو لے کر برطانیہ چلا جاتا ہے۔ قیوم اس سے ملنے ایئرپورٹ جاتا ہے۔ سیمی نہ شادی میں شریک ہوتی ہے نہ ایئرپورٹ جاتی ہے۔

آفتاب کی روانگی کے بعد سیمی اور قیوم ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ مگر توسط آفتاب کا تذکرہ ہی رہتا ہے۔ قیوم سیمی کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ آفتاب کو بھی اس سے محبت تھی مگر وہ مجبور تھا۔

سیمی کی آفتاب سے محبت عجیب قسم کی ہے یہ محبت آسیب بن کر اس کے ذہن پر زندگی بھر سوار رہتی ہے۔

آفتاب کے جانے کے بعد قیوم سے پہلی ملاقات میں تو یہ فطری بات ہے کہ سیمی اس سے آفتاب کی محبت کا ذکر کرتی ہے۔ قیوم اس کے جذبات محبت کو اور ہوا دیتا ہے۔ ایسے مواقع پر ٹھکرائی ہوئی انتقاماً کسی اور کی آغوش میں پناہ لے سکتی ہے یا ایسے موقع پر کوئی مل جاتے تو وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گر سکتی ہے۔ قیوم ایسے ہی موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ پہلے وہ اس کے سر کو بوسے دیتا ہے۔ پھر اس کے گالوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیتا ہے۔ اس کے بعد گنجے سر کے نوگزے جنات کافور کے درخت کے پیچھے سے برآمد ہوتے ہیں اور "سیمی کافور کے پتوں پر ہلکے ہلکے پسینے میں ٹھنڈی بوتل کی طرح ہولے ہولے بھاپ چھوڑ رہی تھی۔"

اس جسمانی ملاپ کی مصنفہ نے جو تشریح کی ہے وہ خلاف فطرت ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ "اسے جسمانی تعلقات کی رتی برابر بھی پرواہ نہ تھی..... وہ اپنے آپ کو میری تحویل میں دینے کے باوجود بالکل الگ تھلگ رہی.... اب اسے فکر نہ تھی کہ اس کوڑے کے ڈھیر پر کون اپنی غلاظت پھینکتا ہے" سارے مرحلوں سے گزرنے کے باوجود یہ کس طرح ممکن ہے۔" وہ اپنی بے عزتی کا نظارہ کرنے کے لئے موجود ہی نہ تھی۔ وہ تو اس وقت کہیں اور تھی کسی اور کے ساتھ تھی۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا رابطہ تھا۔ ادھر سے کوئی مدافعت نہ تھی۔ سومناتھ کا مندر کھلا پڑا تھا۔"

تھوڑی دیر کے لئے آپ اس سے اتفاق کر سکتے ہیں "جس وقت ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہم مکمل طور پر کھو کھلے تھے۔ میں جانتا تھا کہ سیمی کبھی میری نہ ہو سکے گی۔ وہ غالباً سمجھتی تھی کہ اپنے ساتھ میری لعنت لگا کر اس نے آفتاب سے

بدلہ لے لیا ہے۔ شاید وہ اپنے آپ کو ذلیل کر کے ہی اپنی ذات کو کچھ دیر کے لئے بچ سکتی تھی۔"

پہلے واقعہ کے بارے میں تو آپ اس رائے سے اتفاق کر سکتے ہیں، لیکن اس کے بعد سیمی بار ہا قیوم کے ساتھ کافور کے درخت تلے جاتی رہی اور گنجے سروالے نوگزے جنات اسی طرح برآمد ہوتے رہے۔ لکھا گیا ہے: "اب ہمارا معمول ہو گیا کہ ہم دونوں شام گئے جناح باغ میں چلے جاتے اس خطے میں جہاں جنات کا پہرہ تھا اور روحیں آدھی رات کو لالٹین لے کر پھرتی تھیں۔ جسمانی تعلق کے عین تین سیکنڈ بعد وہ ہمیشہ آفتاب کا نام لے کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ یہ نام میری کنپٹی میں گولی کی طرح لگتا۔"

آگے چل کر لکھا جاتا ہے: "ہم دونوں گھنٹوں پہروں آفتاب کی باتیں کرتے رہتے۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہتا۔ میں تسلی آمیز محبت کے ساتھ اسے چومتا رہتا وہ کبھی مدافعت نہ کرتی بلکہ کبھی کبھی شکر گزاری کے ساتھ مجھے دیکھ لیتی۔ لیکن جونہی آفتاب کی باتیں ختم ہو جاتیں وہ یکدم اندر کی لفٹ بند کر کے کہیں اوپر چلی جاتی۔"

غور طلب بات یہ ہے کہ سیمی بالکل بے حس نہ رہتی تھی۔ جہاں تک سیمی کا تعلق تھا وہ مجھے چومتی ضرور تھی، لیکن اسے مجھ سے محبت نہ تھی۔ کم از کم یہاں تک وہ سچی تھی۔"

یہ قطعی خلاف ہے ایسے مواقع پر کوئی بھی مرد یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی آغوش میں بیٹھی ہوئی عورت کسی اور مرد کا ذکر کرے۔ وہ یہی کہتا: "گولی مارو آفتاب کو تم اپنی بات کرو۔"

یہ عین ممکن ہے کہ کوئی عورت اپنی پہلی محبت کو زندگی بھر نہ بھول سکے۔ کسی کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں بن جانے کے باوجود وہ دل میں اس سے محبت کرتی رہے۔ مگر اقرار اسی کی محبت کا کرتی ہے اور اسی کو دنیا کا سب سے اچھا آدمی کہتی ہے۔ جس کی آغوش میں بیٹھی ہوئی ہو اس کے برعکس ہو تو قتل و خون ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیمی کو جنسی تعلق کی عادت پڑ چکی تھی۔ آفتاب کی محبت کا ذکر ایک پردہ تھا۔ اس طرح وہ اس تعلق کی بدنمائی پر شرمندہ ہونے سے بچنا چاہتی تھی۔ مصنف

نے آفتاب سے سیمی کی محبت کو پرخلوص کہہ کر پکارا ہے مگر روز روز کے اس جسمانی تعلق کے بعد یہ محبت فریب لگتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ خلافِ قیاس یہ ہے کہ قیوم بھی آخر وقت تک یہی ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے کہ آفتاب کو سیمی سے شدید محبت تھی۔ مجبوری اور انتقام کی کیفیت صرف پہلے واقعہ تک ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد یہ چاٹ بن جاتی ہے۔

سیمی کچھ عرصہ کے لئے غائب ہو جاتی ہے۔ ایک دن وہ قیوم کو ریڈیو اسٹیشن میں پروڈیوسر سہیل اور حیدر کے ساتھ نظر آتی ہے۔ سیمی کو حیدر کے ساتھ دیکھ کر قیوم چونک اٹھتا ہے۔ وہ قیوم کے زمانہ میں انگریزی میں ایم اے کر رہا تھا اور انگریزی مباحثوں کی جانی پہچانی شخصیت تھا۔ لمبا قد، گچھے دار مونچھیں، گھنی سائیڈ برنز، تنگ موری کی بند جینز، سینے پر تینوں بٹن کھلے، کھلی قمیص، کھلے کف، کھلی مسکراہٹ، آزاد چال۔ اس کے کئی اسکینڈل مشہور تھے۔

قیوم نے محسوس کیا سیمی حیدر کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ حیدر ایک نو دولتیے خاندان کا فرد تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بقول قیوم "محبت میں نہ تو یہ کسی کے پابند ہوتے ہیں نہ کسی اور کے پابند رہنے سے انہیں فرق پڑتا ہے"۔

سیمی قیوم سے کہتی ہے: "جب ہم سعید صاحب کے کمرے میں ملے تو میں نے فیصلہ کیا کہ شاید حیدر کو بھی صرف use کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ بھی میں صرف اپنی تنہائی کو پُر کر رہی ہوں ..... میرے پاس کیا ہے جو میں حیدر کو دے سکتی ہوں۔ خیر وہ بھی تو انسان ہے۔ خدا قسم میں اتنی بڑی Cheat نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی وقت وہ سمجھنے لگے کہ میں Serious ہوں"۔

سیمی خود جانتی ہے کہ حیدر اس کا پیچھا نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ وہ لڑکیوں کے تعاقب میں وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ سیمی حیدر کو صرف پلے بوائے کہہ کر پکارتی ہے۔

تینوں سے تعلقات کی نوعیت ملاحظہ ہو: "تمہاری اور بات ہے قیوم۔ تم جانتے ہو میں مر چکی ہوں۔ تم صرف میری قبر سے محبت کرتے ہو۔ حیدر جادوگر ہے۔ میکسیکو کا بروجو ہے۔ وہ

سمجھتا ہے کہ اس میں اتنی زندگی ہے کہ مجھے سانس پھونک کر زندہ کر لے گا۔ میں اب کسی کر اُسٹ کے حوالے نہیں کر سکتی اپنا آپ۔ ایک دفعہ آفتاب نے میری مردہ ممی میں روح پھونکی تھی۔ اب نہیں، اب نہیں، خدا کے لئے اب نہیں" اس کے بعد کہتی ہے "اگر میں کسی سے آفتاب کی باتیں نہ کر سکوں تو اس کی یادوں کے پریشر تلے میں پھٹ جاؤں"

یہ گفتگو باغ میں اسی کافور کے درخت تلے ہو رہی ہے اور قیوم پھر اسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مرنے سے پہلے سیمی قیوم سے کہتی ہے "سنو قیوم میرے دوست اگر میں تم سے محبت کر سکتی تو ضرور کرتی۔ آفتاب سے محبت میرا شعوری فعل نہیں۔ یہ نہ چاہتے ہوئے بھی مل جاتی ہے۔ آرزو کی طرح خود بخود، آپ ہی آپ۔ اگر میری شعوری کوشش سے کچھ ہو سکتا تو میں تم سے ضرور محبت کرتی۔ بھلا بتاؤ میں نے تم سے محبت کرنے کی کوشش نہیں کی، کی ہے خدا قسم لیکن یہ کم بخت نہیں ہوتی نہیں ہوتی"

اس دوران وہ قیوم سے کہتی ہے "اگر تم نہ ہوتے تو پتہ نہیں میں اپنی محرومی کا بدلہ کس کس سے لیتی۔ تعلیم یافتہ گھر سے نکلی ہوئی لڑکی بڑی ظالم ہوتی ہے قیوم...... جس وقت آفتاب مجھے چھوڑ کر لندن چلا گیا، میری Self-esteem بہت مجروح ہو گئی تھی مجھے کبھی کبھی لگتا تھا کہ میں مری ہوئی چھپکلی ہوں، جسے کوئی چمٹے سے بھی اٹھانا نہیں چاہتا اگر تم مجھ سے محبت نہ کرتے جسمانی محبت تو یہ میرا Confidence کیسے بحال ہوتا۔

جب قیوم کے عابدہ سے تعلقات ہو جاتے ہیں اور عابدہ کو قیوم کی بھابی سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے تو وہ قیوم سے سیمی کے متعلق کہتی ہے "وہ آپ کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی...... ہے نا۔؟ اس کے کسی اور لڑکے سے بھی تعلقات تھے، ہے نا؟ یہ دو دو تین تین جگہ تعلقات ہو کیسے جاتے ہیں بھلا" آگے چل کر کہتی ہے "تم زیادہ فلسفہ نہ کیا کرو میرے ساتھ۔ تمہاری سیمی کو چیڑی اور دو دو کھانے کا شوق تھا۔ یہ امیر زادیوں کے چوچلے ہیں۔ روٹیاں ان کے خانسامے پکائیں، بچے ان کے آیا پالیں اور یہ محبت تلاش کرتی پھریں ہر جگہ، دوسروں کے گھر برباد کریں مفت میں"

ایک مرتبہ کہتی ہے "اچھا عشق تھا اس کا بھی، محبت اسے آفتاب سے تھی اور لیٹتی وہ تمہارے ساتھ تھی! ایسے نہیں ہو سکتا ہاں!"

عابدہ کا تجزیہ درست تھا۔ یا تو یہ ساری محبت فریب تھی یا اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سیمی شاہ Abnormal لڑکی تھی۔ مصنفہ کا پلان یہ تھا کہ اسے سوپر نارمل ثابت کیا جائے۔ اسی لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی چھٹی حس بھی بیدار تھی۔ جس وقت آفتاب لندن جا رہا تھا اسے دکھائی دے رہا تھا۔ زیبا نے کیا پہن رکھا ہے۔ ایک دن کہنے لگی۔ "وہ آجکل سونف کھاتی ہے سارا دن ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے نظر آتی ہے زیبا، میں اسے دیکھ سکتی ہوں پانچ مہینے کی Pregnancy کے ساتھ۔" حالانکہ سیمی نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر وہ کہتی ہے کہ وہ اسے لاکھوں میں پہچان سکتی ہے۔

گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے سے پہلے ہی اس کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ تباہی کی طرف جا رہی ہے۔

سیمی کی موت کو عشقِ لاحاصل کی موت کہہ کر پکارا گیا ہے اور آفتاب کے لئے اس کی محبت کو گویا عشق کا عرفان کہا گیا ہے یہ Sublimity محض تصوراتی معلوم ہوتی ہے۔ آخری موقع پر بھی قیوم اس کی محبت کے تقدس کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "معاً میرے دل میں خیال آیا کہ قلب کا راستہ جسم سے ہو کر نہیں گزرتا۔ قلب تک پہنچنے کے لئے صرف ٹیلی پیتھی۔ وجدان، ہپنوٹزم، میسمریزم کی ضرورت ہے۔ جسم روحانی عمل کو ارتھ کر دیتا ہے۔ میں نے بڑے تقدس سے سیمی کے کف بند کئے اور دل میں عہد کیا کہ اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔" ناول کے قارئین جانتے ہیں کہ کف کس وقت بند کئے جاتے ہیں۔

اس کتاب کا نام "راجہ گدھ" رکھا گیا ہے۔ راجہ گدھ علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اگر آپ یہ غور کریں کہ یہ لفظ انسان کی کس صفت کی علامت ہے تو آپ الجھ جائیں گے۔ اگر روحانی طور پر مردہ سیمی سے مباشرت کرنے پر قیوم کو گدھ کی مردار خوری سے تشبیہ دی جاتی اور اسے گدھ یا راجہ گدھ کہا جاتا تو علامت واضح ہوتی مگر مصنفہ نے اس

علامت کو فلسفہ کا رنگ دینے کی کوشش کی اور ناول میں Intellectualism لانے کی کوشش کی۔ اپنے فلسفہ کی وضاحت کے لئے انہوں نے پرندوں کی چار کانفرنسیں منعقد کروا دیں۔ ان کا انداز ایسپ کی کہانیوں جیسا ہے۔

پہلی کانفرنس "عشق لاحاصل" کے عنوان کے تحت منعقد ہوتی ہے۔ چیلوں کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ گدھ جاتی میں دیوانہ پن کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ جس طرح انسانوں کی دیوانگی سے دنیا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اسی طرح کہیں گدھوں کی دیوانگی بھی جنگل کے باسیوں پر تباہی نہ لے آئے۔ اس لئے انہیں جنگل بدر کیا جائے۔ گدھ اپنی دیوانگی کا اعتراف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اس کی وجہ جاننے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا درخواست کرتے ہیں کہ انہیں اس کی وجہ بتائی جائے۔

مینا انسان کی درندگی پر روشنی ڈالتی ہے "انسان کی ساری قوت اس کی جلبی طاقت میں پوشیدہ ہے . . . . یہی برق رفتار اسے دنیا اور دین کی مسافتیں طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس گھوڑے پر انسان کے زانو سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے۔ ڈھیلا بیٹھا تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔ دنیا کا عرفان ہو تو شاعری، مصوری، موسیقی آرٹ جنم لیتا ہے۔ دنیا درکار نہ ہو قوت تیز ہو تو عرفان کی حدیں چھو لیتا ہے۔ اگر یہ قوت مذبذب ہو جائے تو خودکشی کرتا ہے۔ عشق لاحاصل ہو جائے اور گھوڑا سوار کو گھسیٹے تو انسان پاگل ہو جاتے گا" اس پر گدھ سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا اس میں بھی عشق لاحاصل کی قوت ہے۔ راجہ گدھ مہلت مانگتا ہے اور اجلاس ملتوی ہو جاتا ہے۔

پھر سیمی کی موت کے بعد گویا عشق لاحاصل کی موت کے بعد دوسرا اجلاس ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ہے "لامتناہی تجسس" اس اجلاس میں گدھ اپنے لئے وکیل تلاش کرتے ہیں راجہ گدھ اپنی ہی قوم کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے "سنو بھائیو! میں آخری بات تم کو سمجھاؤں گا اگر تم کو پھر بھی سمجھ نہ آئی تو میں خود تمہاری رائے کے تابع ہو جاؤں گا۔ سنو سوچ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک سوچ علم سے نکلتی ہے اور ریگستان میں سوکھتی ہے۔ دوسری سوچ وجدان سے جنم لیتی ہے اور باغ کے دہانے پر لے جاتی ہے۔ ان ہی دو قسم کے خیالات سے دو طرح کا

رہنا سہنا جنم لیتا ہے۔ ایک رہنا سہنا علم اور تجویز سے جنم لیتا ہے۔ اس میں چاقو، چھری، مقدمہ بحث مباحثے، کس بل، حق حقوق، چھینا جھپٹی، کرودھ کام ہنکار سب ہوتا ہے۔ دوسرا رہنا سہنا ایک اور قسم کی سوچ سے نکلتا ہے۔ اس میں وجدان، شانتی، امن پراشچت، پریم کی وجہ سے ہمیشہ ہجرت کا سماں رہتا ہے۔ اس وجدان کی وجہ سے ایسی سوچ والے غریبی میں امیر اور امیری میں غریب دکھائی دیتے ہیں۔"

گیدڑ گدھوں کا وکیل بننا منظور کر لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیوانگی کا عشق لاحاصل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دیوانگی تلاش سے پیدا ہوتی ہے۔ مسلسل سوالوں کے ناتسلی بخش جواب۔

تیسرا اجلاس رزق حرام کے عنوان کے تحت منعقد ہوتا ہے۔ اس کانفرنس میں راجہ گدھ صدرِ مجلس سے کہتا ہے "میں اپنا شکار خود نہیں کرتا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ میں دیوانگی اس رزق حرام کھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی کہ دیوانگی نے مجھے رزق حرام کھانے پر مجبور کیا۔"

گیدڑ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ آیا گدھ اپنی مرضی سے رزقِ حرام پہ راغب ہوا یا یہ اس کی سرشت ہے۔ اگر سرشت ہے تو اس پر اعتراض قدرت کے کاموں میں مداخلت کے مترادف ہے۔"

چوتھی کانفرنس کا عنوان ہے "موت سے آگاہی"۔ اس میں مختلف پرندے گدھ کے بارے میں اپنے اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ چیل ملکہ جو کہ گدھ جاتی کو جنگل بدر کروانے پر تلی ہوئی ہے کہتی ہے "جسم کا رزق بالآخر روح کو لگتا ہے اور روح کا رزق بالآخر کار جسم کا حصہ ہو کر رہتا ہے۔ رزق حرام چاہے بدنی ہو یا روحی دیوانہ پن کا باعث ہوتا ہے۔"

شاہین بچے بھی اپنی رائے پیش کرتے ہیں کہ "جب رزق حرام جسم کے اندر داخل ہوتا ہے تو منفی لہروں کا جال لہو میں پھیل جاتا ہے اور ہر جرثومہ کی زندگی منفی طور پہ متاثر ہوتی ہے۔ اور وقت سے پہلے ٹوٹنے لگتا ہے۔"

مختلف پرندے انسان کی دیوانگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ راجہ گدھ کہتا ہے کہ

انسان کی دیوانگی کی اصل وجہ موت کی آگاہی ہے۔ وہ چھوٹی سی ناپائیدار زندگی میں ہمیشہ کی بقا چاہتا ہے اس کے بعد وہ دیوانگی کی مزید تشریح کرتا ہے " دیوانگی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک دیوانہ پن وہ ہوتا ہے جس کی مختلف وجوہات بیان کی گئیں جن کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان کائنات کی ارذل ترین مخلوق بن جاتا ہے لیکن ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو اعلےٰ و ارفع بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے۔ پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے۔ دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن وہ اوپر اور اوپر اٹھتا جاتا ہے حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے۔ عام لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں لیکن انسان جب بھی ترقی کرتا ہے پاگل ہوتا ہے"

ان چار کانفرنسوں کے بیان پر تقریباً ۵۰ صفحات صرف کئے گئے ہیں۔ مگر ان سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ان بیانات کو جمع کیا جائے تو گدھ کسی بھی قسم کے انسان کا استعارہ نہیں بن پاتا۔ ان میں اتنی مباحث اٹھائی گئی ہیں کہ سب کچھ خلط مبحث بن کر رہ گیا ہے اور سوائے بقراطی کے کوئی اثر قائم نہیں ہو پاتا۔ دیوانگی کا عرفان سے کوئی تعلق نہیں۔ دیوانہ زیادہ سے زیادہ مجذوب بن جائیگا اور ننگ دھڑنگ گھومتا پھرے گا۔ عرفان اعلےٰ ہوش مندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ دیوانگی کی ایک منزل عرفان بھی ہے تو اس ناول میں کس کردار کو یہ مقام حاصل ہوا ہے۔ سیمی کو، آفتاب کو، قیوم کو یا امتل کو۔ اگر کسی کو بھی نہیں تو اس فلسفہ طرازی کی کیا ضرورت تھی۔ اگر یہ حصّہ نہ ہوتا تو ناول کی ہئیت اجتماعی کے لئے بہتر ہوتا۔

کسی انسان کو فرض کیجیئے کہ قیوم کو اگر راجہ گدھ کہنا مقصود ہے تو سیمی سے اوّلین جنسی تعلق کے بعد قیوم کے یہ الفاظ کافی تھے " یہ بھی عجیب رابطہ تھا مردار کو گدھ ہڈیوں تک شفاف کر چکا تھا لیکن وہ اپنی بے عزتی کا نظارہ کرنے کے لئے موجود ہی نہ تھی " اس سے پہلے جب قیوم آفتاب کی محبت کا ذکر کر کے کسی حد تک سیمی کے جذبات کو بھڑکا دیتا ہے تو دل میں کہتا ہے " اب وقت ہے اے راجہ گدھ اب وقت ہے" اس طرح یہ استعارہ بالکل واضح ہو جاتا۔

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ راجہ گدھ کسے کہا گیا ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے قیوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ پھر قیوم اپنے گاؤں جاتا ہے تو اپنے باپ کے لیے راجہ گدھ کا لفظ استعمال کرتا ہے"۔ وہ صرف راجہ گدھ تھا جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور میں اپنی زندگی کی ڈوری لٹکائے بیٹھا تھا"

اس کے بعد جب عزیز گاتی گاؤں سے غائب ہو جاتا ہے اور اس کی تلاش میں اس کی ماں ماسی الفت بھی غائب ہو جاتی ہے وہ قیوم کو بھاگتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے بھی قیوم راجہ گدھ کہہ پکارتا ہے۔ ان کے علاوہ اوروں کو بھی راجہ گدھ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً چاچا غلام رسول کو جو قیوم کے گھر میں طویل عرصہ تک بطور مہمان رہا کرتا تھا۔ اسے اشتہاری عاشق کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اسے گھر میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر اس کی خوب خاطر تواضع کی جاتی تھی۔ پراٹھے، مکھن، اس کی پلیٹ میں بوٹیاں بھی خوب ہوتی تھیں۔ یہ کیوں ہوتا تھا اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ مگر تھا وہ بھی راجہ گدھ ہی۔ اس طرح یہ ناول گدھ جاتی کی روئیداد بن جاتی ہے۔ حالانکہ مصنفہ کا غالباً یہ مقصد نہیں تھا۔

دراصل ناول بڑی غریب صنفِ ادب ہے۔ جب یورپ کے رومانوں اور جن و پری کے افسانوں کے بعد سروانتے کی "دو ڈون کوئی خوتے" شائع ہوئی تو لوگوں نے اسے نئی چیز (نوویلا) یعنی ناول کہہ کر پکارا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ دو چار افراد کے نام ڈالے اور کچھ بھی لکھ ڈالا۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ اسے بھی ناول کہہ ہی دیتا ہے۔ عاشقانہ خطوط لکھے گئے تو وہ بھی ناول کہلائے۔ خواب کی نفسیات بیان کی گئیں یا شعور اور لاشعور کی آنکھ مچولیاں بیان کی گئیں تو وہ بھی ناول ہی کہلائے۔ مغرب میں تو ہزاروں ناول لکھے جاتے ہیں۔ ان میں دو چار اس قسم کی کتابیں آجائیں تو وہاں تو سمجھنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ عام قاری کو ان سے مغز مارنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کسی نے انہیں ناول مانا کسی نے نہیں مانا۔ مگر نئے تجربات کی حیثیت سے انہیں کافی سراہا گیا۔

ہمارے یہاں انٹیلکچوئل ناول کی ابتدا قرۃ العین حیدر نے کی۔ وہ تو پنج نکلیں ان کی رسیں میں کئی مارے گئے۔ ہمارے یہاں بعض لوگوں نے فلسفہ طرازی، علمیت اور دانشوری

کو ناول کی کہانی پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول بھی ایسی ہی کوشش کا نتیجہ ہے۔ دراصل ناول کا اوّلین مقصد تفریح طبع ہے (ہنسنا ہنسانا نہیں) نہ کہ وعظ و تلقین۔ اگر ناول اپنی غایت پوری نہ کر پائے تو اسے وجود میں آنے کا کوئی حق نہیں۔

قیوم کے خاندان بلکہ برادری کو گدھ جاتی کہا گیا ہے۔ قیوم کہتا ہے "ہم پرانے گدھ جاتی کے وہ راجپوتی لوگ تھے جنہوں نے راجستھان میں پناہ لی تھی اور جو کھیتی باڑی کو منفعت کا کام سمجھ کر اب پنجاب کی سرزمین میں آباد ہو گئے۔ ہم راجپوتی لوگ اپنی غیرت اور آن کی تمام کہانیاں بھول چکے تھے" آگے چل کر کہتا ہے "بھابی صولت کا چہرہ؟ بھائی مختار کی شکل؟ اماں۔ ابا۔ کیا ہم سب انسانوں میں سے تھے؟ کیا ہماری شکلیں گدھوں کے مشابہ نہ تھیں؟"

اپنے باپ کو وہ اس سانڈھ سے تشبیہ دیتا ہے جو کھیت میں کھڑا ہوا ضرر لگتا ہے لیکن جسے کوئی بھی کسان کھیت سے نکالنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

لکھا گیا ہے کہ گدھ کی صفات نسل در نسل چلتی رہتی ہیں۔ مگر مختار اور صولت میں ایسی کوئی بات بیان نہیں کی گئی ہے۔ ان کی زندگی خاصی خوش گوار اور پاک صاف ہے۔

پھر ہر قوم اور برادری کی کچھ ممتاز خصوصیات ہوتی ہیں جو پرانے زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ مثلاً پٹھانوں کی بہادری، مہمان نوازی اور انتقام کا جذبہ۔ اسی طرح راجپوتوں میں بھی کچھ خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً بہادری، آن پر مر مٹنا اور بات کا دھنی ہونا۔ مصنفہ نے ایک راجپوت برادری میں ایسی خصوصیات بیان کی ہیں جو ان کے تاریخی کردار کے بالکل منافی ہیں۔ بہرحال انہوں نے جہاں ابنارمل افراد پیش کئے ہیں۔ وہاں اگر ایک ابنارمل قوم بھی پیش کر دی تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

پروفیسر سہیل کو اس کہانی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ قیوم کے صرف کالج ہی کے استاد نہیں ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً وارد ہو کر زندگی میں بھی قیوم کی راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ قیوم کی صحت بہت خراب ہو چکی ہے اور اس کے معدہ میں السر ہے تو وہ اسے یوگا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور ہوٹل ہی میں اس کا عملی مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں "ایک دم پروفیسر

اپنی کرسی سے اٹھا۔ دوچار کرسیاں اِدھر اُدھر کیں اور سر کے بل دیوار کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ پھر اس نے اسی حالت میں چوکڑی لگائی قمیص کے بٹن پینٹ سے نکالے اور پیٹ کے پٹھے کچھ ایسے سکوڑے کہ سارا پیٹ ایک چھوٹی سی اینٹ میں تبدیل ہوگیا۔ پھر وہ قلابازی لگاکر اترا اور کنول آسن میں بیٹھ گیا۔ ہوٹل میں رش نہیں تھا لیکن جو بھی موجود تھے اس طرف متوجہ ہوگئے۔"

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس قدر مضحکہ خیز منظر ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کسی نے مذاق میں ایک مسخرے کا نام پروفیسر رکھ دیا ہے۔

اس کے بعد پروفیسر سہیل مختلف قسم کی ورزشوں پر اور ان کی افادیت پر لیکچر دیتا ہے۔ کہیں کہیں ہندو مائتھولوجی کے حوالے بھی دیتا ہے۔

دوسری ملاقات میں پروفیسر سہیل قیوم کو یوگا کی مختلف قسموں کے بارے میں بتاتا ہے اور ان کی افادیت کی بھی تشریح کرتا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تنتر یوگا کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے: "تنترا یوگا کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں ہیں لیکن جو پرانے سیانے تھے وہ جانتے تھے کہ انسانی ارتقاء ہمیشہ Polarities سے پیدا ہوتی ہے۔ شوجی مہاراج اور شکتی کے میل سے کائنات وجود میں آئی۔ پرانے آریائی لوگ اور تبت کے لوگ تنترا یوگا سے وہ طاقت حاصل کرتے تھے۔ جسے elan vital کہنا چاہیئے اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ "یہ یوگا شرابی، بدمعاش زانی کے لئے نہیں بلکہ صرف اس دھرماتما کے لئے کامیاب ہوسکتا ہے جو اپنی گھٹی ہوئی شکتی کو بحال کرنا چاہتا ہو۔ اگر تنترا کے لئے کوئی عورت مل جائے تو مرد کو ہمیشہ یاد رکھنا پڑتا ہے کہ یہ سنجوگ! گو بظاہر جسمانی ہے لیکن اس کا اصلی جوہر اپنی ذات پر کنٹرول سکھاتا ہے اور جس طرح سانس لیتے وقت پران کو ہوا سے لیکر پھیپھڑوں میں داخل کرتے ہیں۔ ایسے ہی تنترا کرتے وقت عورت سے شکتی حاصل کرکے اپنی کنڈالنی کو جو تمام تخلیقی طاقتوں کی جان ہے بیدار کرتے ہیں۔"

جس دھرماتما کو وہ یہ مشورہ دیتے ہیں وہ قیوم ہے۔ تنترا یوگا کے لئے اسے جو عورت مل سکتی ہے وہ عابدہ ہے۔ جس غریب کو بچے کی تمنا ہے اور وہ اپنے شوہر کی طرف سے مایوس ہوچکی ہے۔ لہٰذا قیوم اپنے استاد کے نیک مشورے کی تکمیل کر ڈالتا ہے اور کرتا رہتا ہے

یوگا کی خوبیوں کے بارے میں پروفیسر سے جو کمی رہ گئی تھی، وہ قیوم عابدہ کو لیکچر دے دے کر پوری کر دیتا ہے۔ یہ پورا حصہ پڑھنے، یاد رکھنے اور لطف لینے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف کے تبحر علمی کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ اس لئے کہ اسے پیش کرنے کی حقیقی غایت ہی یہی ہے۔

چند جملے ملاحظہ کیجئے اور سر دھنئے: "پہلا چکر مقعد اور آلات تناسل کے درمیان ہے۔ اسے مولادھارا کہتے ہیں۔ اس کی چار سرخ پتیاں ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک زرد مربع زمین کی علامت، اس مربع کے اندر ایک تکون ہے۔ جس میں تمام (Psychic Energy) بند ہے ..... آخری چکر کنول کا ایک ایسا پھول ہے جس کی ایک ہزار پتیاں ہیں۔ یہاں شکتی اور شوا کا میل ہوتا ہے .... جو شخص کنڈالنی کے اس مقام پر قابض ہو جاتا ہے وہ اپنے دو موہے دشمن پر قابو پا لیتا ہے... .. وقت اور موت یہ دونوں بھی ایسے تنترک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

اب ٹیپ کا بند ملاحظہ فرمائیے: "تم شکتی ہو شکتی عابدہ، تمہارے ملاپ سے مجھے اپنی روح کا نروان میرا خدا مل سکتا ہے۔" بے چاری عابدہ کیا کرتی۔ کسی کی خدارسی کی راہ میں رکاوٹ تو نہیں بن سکتی تھی۔

غالباً یہی وہ عرفان ہے جو بقول مصنف گدھ اور انسان کی دیوانگی کی منتہا ہے۔

مصنف نے پروفیسر سہیل کو انٹیلکچوئل کہا ہے اور آخر میں اسے ثابت بھی کر دیتی ہیں۔ سہیل یعنی وہ خود ایک تھیوری پیش کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں اقتباسات کچھ طویل ہو جائیں گے مگر اس کے بغیر آپ اس تبحر علمی کی داد نہیں دے سکتے۔ کہا جاتا ہے:-

"میں نے دیوانگی کا راز پا لیا ہے قیوم اور وہ ہے تغیر نوع Mutation سادہ طور پر سمجھ لو کہ جب کبھی Evolution ہوتی ہے کوئی Specie بدلتی ہے۔ اس کی وجہ gene mutation ہوتی ہے ..... gene پوری طرح تغیر پذیر نہ ہوں تو ارتقا ———— ہوتا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ جائے تو

دیوانہ پن پیدا ہوتا ہے radiation tranquilizers اور ایسی ہی کوئی زہریلی دوائیوں سے gene میں خطرناک mutation ہو جاتی ہے۔ آج کا مغربی سائنسدان اس حقیقت سے بہت خوفزدہ ہے۔ وہ جانتا ہے ان باتوں سے تغیر تو ہوتا ہے لیکن مکمل نہیں ہوتا تغیر پذیر GENE لولا لنگڑا ہو جاتا ہے اور آنے والی نسلوں پر جس سے خطرناک نتائج مرتب ہوتے ہیں

مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی gene کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام سے ایک خاص قسم کی mutation ہوتی ہے۔ جو خطرناک ادویات شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزق حرام سے جو genes تغیر پذیر ہوتے ہیں، وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں۔ نسل انسانی سے یہ genes جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے، جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کرو رزق حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے"

پروفیسر کہتے ہیں کہ حلال و حرام کا تصور سب سے پہلے اللہ نے بہشت میں پیدا کیا۔ کہتے ہیں" اس گندم کے دانے کا رزق حرام جس وقت ان کے جسم میں داخل ہوا، ایک خطرناک تغیر آیا ان کے جسم میں، ان کے genes میں۔ اس تغیر سے اللہ نے انہیں ڈرایا تھا اس وقت تک حضرت آدم اور اماں حوا کے تمام خلیے صالح تھے۔ ان کا نیوکلس محفوظ طریقے سے ڈھکا ہے لیکن اب اسی نیوکلس میں چھپے ہوئے genes میں تبدیلی آئی اور genes mutate ہوئے۔ لولے لنگڑے اور ناامید اور آنے والی نسلوں میں منتقل ہو گئے۔"

اب ذرا قیوم کی بقراطی بھی ملاحظہ کیجیئے: "کیونکہ ان کے صنفی تخم کے اندر مرد اور عورت دونوں موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے کبھی تو وہ جغرافیائی قرب کے باعث عورت سے رابطہ قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کبھی وہ موسموں کی رومانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی وافر وقت کا بہتر مصرف نہ پا کر کسی نہ کسی کے قدموں میں جا گرتا ہے۔ کبھی اس کے جرثومہ کا مرد اسے عورت کی طرف کھینچتا ہے، کبھی اس جرثومہ کی عورت اپنی ہم جنس کی تلاش میں نکلتی ہے

کیونکہ اسے صنفی تخم کے اندر سائیکی کے دو مختلف روپ ہوتے ہیں۔"

بقول پروفیسر سہیل حضرت آدم اور حضرت حوا نے جو دیوانگی اپنی نسلوں میں منتقل کی۔ اسی نسل سے کیسے کیسے پیغمبر، فلسفی، سائنسدان، دھرماتما اور بڑے بڑے لوگ پیدا ہوتے۔ ان کے نظریے کے مطابق یہ بھی شاید دیوانگی ہی کے مختلف روپ ہوں گے۔ پروفیسر سہیل اس تھیوری کو Patent کروانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ معلوم نہیں اب تک اس کا بندوبست ہوا ہے یا نہیں۔ کہیں اہل مغرب اسے نہ لے اڑیں۔ اور مصنفہ کی ساری محنت اور دماغ سوزی غارت ہو جائے۔

مصنفہ نے انسانی عمل اور سوچ کو ایک نظریے کے تحت لانے کی کوشش کی ہے مصنفہ بھول جاتی ہیں کہ ہر فرد اپنی الگ دنیا رکھتا ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ کب کوئی دھرماتما شیطان بن جائے اور کب کوئی شیطان صفت انسان ولی بن جائے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ نفسیات کا علم اس قدر ترقی کرنے کے باوجود اور ذہن انسانی کے بارے میں اس قدر تحقیقات کے باوجود کسی فرد کے عمل کو کسی اصول کے تابع نہیں لا سکا۔ پرانی مثل ہے کہ ولی کے پیٹ میں شیطان اور شیطان کے پیٹ میں ولی اسی کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ رشوت خور اور حرام کی کمائی کھانے والے کی اولاد ضروری نہیں ہے کہ بدکار اور مصنفہ کے الفاظ میں دیوانی ہی ہو۔ ایسے لوگوں کی اولاد میں سے انتہائی نیک اور ولی صفت انسان بھی نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض متقی لوگوں کے یہاں بڑی گناہ آلود زندگی گزارنے والی اولاد بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ کا اپنا نظام اور قانون ہے۔ اس کی مشیئت کسی انسانی قانون کے تابع کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی مشیئت کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اسے سمجھنا انتہائی مشکل ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہ Unpredictable ہے۔

اب اس کہانی کے راجہ گدھ کے بارے میں بھی کچھ گفتگو ہو جاتے۔ مصنفہ کے نظریے کے مطابق تو اس کا رویہ اس کے خاندانی اثرات کے تابع ہے اور وہ فطرتاً مردار خور ہے۔

اس کی پہلی مردار خوری کا جائزہ لیجئے۔ دیکھا جائے تو وہ ایک نارمل انسان ہے۔ مخلوط نظامِ تعلیم میں خوبصورت لڑکیوں پر ہر طالب علم کی بلکہ نوجوان استادوں تک کی نظر ہوتی ہے۔ چند لڑکے لڑکیوں میں دوستی بھی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات آپس میں شادی بھی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات کبھی لڑکے اور لڑکی کی طرف سے بے وفائی بھی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا آفتاب کی بے وفائی بھی کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ قیوم کی سیمی پر نظر پہلے سے ہی تھی۔ وہ موزوں وقت پر ایک موزوں مقام پر یکجا ہو جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں دونوں ایک مخصوص جذباتی کیفیت پر پہنچ جاتے ہیں اور ان میں جسمانی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات پہلے جسمانی تعلق کا نتیجہ ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پہلے واقعہ کے بعد سیمی اپنا رُخ بدل لیتی۔ مگر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس واقعہ کو دہراتے رہتے۔ سیمی میں ایسی کشش تھی کہ قیوم کا اس سے بہت زیادہ لگاؤ پیدا ہو جاتا۔ جسے آسانی کی خاطر محبت کہا جا سکتا ہے۔ ایک قدرتی امر تھا۔ مخلوط تعلیم کے اداروں کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات غیر تحریری شکل میں زندہ رہتے ہیں۔ سیمی کے رویہ کو آپ ابنارمل کہہ سکتے ہیں۔ مگر قیوم کا رویہ بالکل نارمل انسان کا رویہ ہے۔

سیمی سے قیوم کا جسمانی تعلق اتنے عرصے رہا تھا کہ اس کی موت کے بعد قیوم کا اس قدر متاثر ہونا کہ اس میں دیوانگی کے سے آثار پیدا ہو جائیں اور اس کی صحت خراب ہو جائے ایک قدرتی بات ہے۔

اسی دوران قیوم کی ملاقات پروفیسر سہیل سے ہو جاتی ہے اور وہ قیوم کو یوگا کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس کا علاج صرف یوگا ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ دوسری ملاقات میں قیوم کو تنترا یوگا کی خوبیاں بتا کر اسے ذہنی طور پر تیار کر دیتے ہیں اتفاق سے اسی دوران قیوم کے کمرے میں عابدہ کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ پروفیسر سہیل نے قیوم کو سمجھا دیا تھا کہ اگر تنترا یوگا کے لئے اسے کوئی شادی شدہ عورت مل جائے تو اس کے لئے بہتر ہو گا۔

عابدہ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کے امرونی تھے۔ مگر اس کی سب سے

بڑی تمنا یہ تھی کہ اس کے یہاں بچہ پیدا ہو۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اس کے شوہر وحید کو علاج کی ضرورت ہے مگر وہ راضی نہ ہوا۔ ہر عورت کی طرح وہ بچہ کے لئے بے تاب ہے۔ بیشتر عورتیں اس تمنا کی خاطر گناہ کا راستہ اختیار نہیں کرتیں، مگر کچھ عورتیں کر بیٹھتی ہیں قیوم اسے طعنہ دیتا ہے کہ وہ جسم کے بارے میں سوچتی ہے۔ وہ کہتی ہے "جسم نہ ہوا تو روح کس مکان میں رہے گی۔ ہمارا تو بوٹا ہی نہ لگا۔ لاکھ دفعہ کہا میں نے وحید سے کہ تم علاج کروا لو پر مانے بھی وہ خبیث۔"

قیوم اس کے سامنے الٹا سیدھا فلسفہ چھانٹ کر اسے یوگا کے لئے تیار کر لیتا ہے دو ضرورت مندوں کا اس طرح گناہ کی راہ اختیار کر لینا ان حالات میں قرینِ قیاس تھا۔ عابدہ کو قیوم کے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ اس لئے راضی ہو گئی کہ

قیوم آسانی سے دستیاب تھا اور بدنامی کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اسے وحید سے صرف یہ شکایت تھی کہ وہ علاج نہیں کرواتا تھا جب وہ علاج کروانے کے لئے تیار ہو گیا تو عابدہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ قیوم اسے یہ تک کہتا ہے کہ وہ عابدہ سے نکاح کرنے کے لئے تیار ہے۔ مگر عابدہ صاف کہہ دیتی ہے "میں کیوں نکاح پڑھ کر اؤں گی۔"

وہ قیوم کو اس کی حیثیت بتا دیتی ہے "اب سنو تم درمیانے قد کے دبلے پتلے مردنما لڑکے ہو۔ تمہاری مونچھیں تمہارے چہرے پر نہیں سجتیں۔ تمہارے بالوں کی خشکی جھڑتی رہتی ہے جو تمہارے کوٹ کے کالروں پر بری لگتی ہے۔ تمہارے بڑھے ہوئے ناخن گندے ہوتے ہیں۔ تمہارا مزاج ایسا ہے جیسے راکھ جلتے ہوئے کوئلے پر چڑھی ہو اوپر سے بجھے ہوئے اندر سے جلا دینے والے۔" اس کے بعد کہتی ہے "پتہ نہیں کیوں میں تمہارے پاس آ جاتی ہوں۔ قیوم مجھے پتہ بھی ہے کہ یہ جائز نہیں حرام ہے۔ پتہ نہیں مجھے بچے کی تلاش لاتی ہے کہ اپنی تنہائی، پتہ نہیں میں تمہیں چپ کرانے آتی ہوں یا اپنے آپ کو۔"

اس کے بعد قیوم کی ملاقات ریڈیو کی ملازمت کے دوران امتل سے ہوتی ہے۔ جوانی میں اس کی خاصی شہرت تھی۔ لوگ اس کی ناز برداری کرتے تھے۔ اب اسے پروگرام دینا تو

درکنار اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ قیوم نے ترس کھا کر اس کی مدد کرنی چاہی، اس سے ملنا جلنا بڑھایا۔ یہاں تک کہ بھائی بھاوج کو بھی کسی نہ کسی طرح اس کا علم ہو گیا۔ شاید ترس کھا کر ہی قیوم نے (ممتاز مفتی کے الفاظ میں) امتل کے جوہڑ میں چھلانگ لگانے کی بھی کوشش کی مگر وہ تو امتل ہی کو اس پر ترس آگیا اور جوہڑ خود اس سے دور ہو گیا۔ امتل کا قصہ بھی ناول میں کافی صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سے صرف دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ریڈیو اسٹیشن پر صرف جوان لڑکیوں کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں اپنی مشہور آرٹسٹوں سے لوگ ملنے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امتل کا بیٹا بھی چونکہ رزق حرام ہی کی پیداوار تھا۔ اس لئے مخبوط الحواس تھا اور اس نے حالت جنون میں اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ اس اہم واقعہ کو شاید مصنفہ نے پروفیسر سہیل کی تھیوری کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے۔

بہر حال اس کے بعد قیوم کے بھائی بھاوج اس سے اصرار کرتے ہیں کہ وہ شادی کرلے۔ قیوم راضی ہو جاتا ہے مگر شرط یہ رکھتا ہے کہ لڑکی باکرہ ہو۔ لہٰذا بھابی ایسی لڑکی تلاش کرتی ہے: "ستاروں نے بھی اسے بے نقاب نہیں دیکھا، صوم وصلوٰۃ کی پابند، سلائی کڑھائی اچھی کھانا پکانا جانتی ہے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں . . . . بالکل باکرہ باعصمت لڑکی ہے، جیسی تمہیں درکار ہے، بالکل ویسی . . . بس وہ ڈبے میں پیک ہے پوری طرح، تم ہی اس کا ربن کھولو گے پہلی بار"

قیوم کو خیر جیسی لڑکی درکار تھی ویسی تو نہیں ملی، البتہ ایسی لڑکی ملی جس کا کہ وہ مستحق تھا۔ شادی ہو جاتی ہے۔ پہلی ہی رات اس کی بیوی روشن بتاتی ہے کہ اس کے بچہ ہونے والا ہے اس کے گھر والوں کو پتہ تھا مگر وہ بچہ کے باپ سے شادی کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے اور اسے اسی حالت میں ڈبہ میں پیک کر کے قیوم کے حوالے کر دیا۔

قیوم کا روشن کے ساتھ رویہ خلاف فطرت لگتا ہے۔ وہ اس سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس امانت کے طور پر رہے گی۔ جب اس کا چاہنے والا یعنی افتخار جدہ سے

آجائیگا۔ وہ اسے طلاق دے دیگا۔ چنانچہ انتخار آجاتا ہے اور وہ اس کی امانت اس کے حوالے کردیتا ہے۔

قیوم جو بقول مصنفہ اب تک مردار خوری کرتا رہا تھا۔ شادی شدہ عابدہ سے جسمانی تعلق قائم کئے رہا وہ اس عورت سے کس طرح دور رہ سکتا تھا جو شرعاً اور قانوناً اس کی بیوی تھی۔ دونوں بہت عرصہ تک ایک ہی کمرے میں سوتے رہے اور قیوم اسے امانت ہی سمجھے رہا۔ یہ اس کے کردار کے بالکل منافی اور خلاف قیاس ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور نیک آدمی ہوتا وہ بھی اس امانت میں خیانت کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

مصنفہ نے قیوم کی ملاقات اس کے پیر طریقت سے پھر کرادی۔ روشن کی پھوپھی پروفیسر سہیل کی چچی ہیں۔ جب وہ روشن کے ساتھ اس کی پھوپھی کے یہاں جاتا ہے اس کی ملاقات پروفیسر سہیل سے ہو جاتی ہے۔ وہ امریکہ پلٹ ہو گئے ہیں اور روحانیات کے اور زیادہ قائل ہو گئے ہیں۔ وہ روحوں کو بلانے کا علم یا فن بھی سیکھ آئے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ صرف غیر مسلموں کی روحوں کو ہی بلا سکتے ہیں۔ قیوم انہیں ماڈرن کیپسول سائز ولی کہہ کر پکارتا ہے۔ بھلا ذہنی پریشانیوں میں ان سے بہتر رہنمائی اور کون کر سکتا تھا۔

مصنفہ کو روحانیات سے خاص دلچسپی ہے۔ پہلا ناول میں جہاں انہوں نے دوسرے علوم کے دریا بہاتے ہیں۔ وہاں اس موضوع پر روشنی ڈالے بغیر کس طرح رہ سکتی تھیں۔

سہیل قیوم سے کہتے ہیں کہ اگر اسے شوق ہے تو وہ اسے ایک بزرگ سے ملا دینگے جو "تصور اسم ذات سے اگلی دنیا کھولتے ہیں جس سے انسان عالم ناسوت سے پرواز کرتا عالم ملکوت، جبروت اور لاہوت میں داخل ہوتا ہے ..... وہ پردہ اٹھا کر دکھا دینگے کہ کیسے انسان اس جسم کو چھوڑنے کے بعد پھر ابدی زندگی پالیتا ہے"

بہر حال سہیل قیوم کو لے کر سائیں جی کے ڈیرے پر جاتے ہیں۔ سائیں جی کے جسم پر تہمد کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ پہلے وہ ان کے لئے چائے منگواتے ہیں۔ پھر تندوری روٹیاں، مکھن اور مچھلی کا طشت لے کر ایک اور مرید حاضر ہو جاتا ہے۔ وہاں نہ کہیں

دھواں تھا نہ چولہا۔ گویا یہ سب چیزیں غیب سے آرہی تھیں۔

پروفیسر سہیل جو امریکہ سے ڈاکٹریٹ کر آئے تھے۔ سلوک کی مختلف منزلوں پر سائیں جی سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ گفتگو اتنی ٹیکنیکل تھی کہ قیوم کی سمجھ میں نہ آئی۔ سائیں جی قیوم سے کہتے ہیں: "بیٹا! اگر یہ صرف تجسس کے لئے ہے تو باز رہو۔ اگر باطنی فتح کی خاطر مطلوبہ روح کی رویت چاہتے ہو تو ہم راستہ بتا دیں گے۔" سائیں جی قیوم کو پاس انفاس اور ریاضت کا طریقہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ظلمات بشری جب دور ہونے لگیں گے تو خود بخود عالم ملکوت کا راستہ کھلے گا۔"

سائیں جی سہیل کو ایک پکی قبر کے قریب لے جاتے ہیں۔ سیڑھیوں سے اتر کر قبر کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ فرش لپا ہوا تھا۔ کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی۔ اس لئے وہ بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "پہلے چار ہفتے میرے ساتھ تم یہاں آؤ گے۔ پھر ایک جمعرات ہم باہر ہوں گے تم اندر رہو گے تم کو اپنے والد کی روح ملنے آئیگی۔"

اس کے بعد اسی قبر کے اندر قیوم کی ملاقات سائیں جی کے مرشد سے ہوتی ہے جن کے وصال کو چالیس سال ہو چکے ہیں۔ وہ قیوم سے پوچھتے ہیں "ہمارے ساتھ چلو گے؟" قیوم نے کہا، "کہاں جی؟" وہ جواب دیتے ہیں، "کہاں پوچھنے والا تیار نہیں ہوتا۔" اس کے بعد وہ قیوم کو قبر کے باہر بیٹھنے کے لئے کہتے ہیں۔ وہ عشا کی نماز تک باہر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد سائیں جی نے اسے اندر بلایا۔ وہاں سائیں جی اکیلے تھے اور مرشد غائب ہو چکے تھے۔ سائیں جی قیوم سے کہتے ہیں کہ اس نے بہت بڑا موقع گنوا دیا اگر وہ پیر و مرشد کے ساتھ چلا جاتا تو اس کی عاقبت سنور جاتی۔ اس کے بعد وہ اگلی جمعرات کو اسی قبر پر آنے کے لئے کہتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس وقت اس کی سیمی سے ملاقات ہو سکے گی۔

پرندوں کی کانفرنس میں راجہ گدھ انیر می کہتا ہے کہ دیوانگی کی آخری منزل عرفان ہے۔ مصنف نے بھی شاید قیوم کو عرفان کی منزل تک پہنچانے کے بارے میں سوچا ہو۔ پھر ارادہ بدل دیا ہو۔ بہر حال قیوم سلوک کی منزلیں طے کر لیتا ہے۔ سائیں جی اور قیوم اسی پکی قبر کے اندر بیٹھ کر گھنٹہ بھر تک پاس انفاس کرتے ہیں پھر عشا کی نماز کے بعد سائیں جی

قبر میں تلاوت شروع کر دیتے ہیں۔ قیوم قبر کے دہانے پر بیٹھ کر خالی الذہن ہونے کی مشق کرتا رہتا ہے۔ "تہجد کے وقت تک مجھے جنگل کی طرف سے لاکھوں آوازیں آتی ہیں۔ پھر فجر کے بعد اتنی خاموشی ہونے لگتی ہے کہ اپنے دل کی دھڑکن بھی گھڑی کی ٹک ٹک جیسی سنائی دینے لگتی ہے۔ سارے مسام کھڑے رہتے ہیں نتھنوں میں کئی قسم کی خوشبوئیں آتی ہیں اور لگتا ہے کہ عین گدی کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ اپنے پر پھڑپھڑا رہا ہے"۔ یہ گویا موت کے پروں کی آواز تھی"۔

سائیں جی قیوم کو نظری تعلیم بھی دیتے ہیں۔ وہ اسے لطیفۂ خفی کے بارے میں بتلاتے ہیں۔ "دو ابروؤں کے درمیان لطیفۂ خفی کا مقام ہے جہاں ناسوتی چیزوں کو دیکھنے کے لئے آنکھ کام دیتی ہے۔ جب باطنی آنکھ کھلے گی تو روح ملائکہ اور دیگر باطنی اشیاء خود بخود نظر آنے لگیں گی"۔ سائیں جی قیوم کو یقین دلاتے ہیں کہ اس کی باطنی آنکھ ضرور کھلے گی۔

ان مرحلوں سے کامیابی کے ساتھ گزارنے کے بعد ہی سائیں جی نے قیوم کی ملاقات اپنے مرشد سے کروائی تھی۔ گویا اسے عرفان کے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔

اگلی جمعرات کو جب وہ سائیں جی کے ڈیرے پر پہنچا تو وہاں مکمل خاموشی تھی۔ پھر وہ اس قبر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے کچھ لوگ ٹکڑیوں میں آتے ہوئے ملے۔ جس وقت وہ قبر کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ قبر اندر کو دھنسی ہوئی تھی اور نیچے اترنے والی سیڑھیاں غائب تھیں۔ قبر کے اوپر تازہ مٹی کا ڈھیر تھا۔ اندر جانے کے تمام راستے مسدود تھے۔ قبر ایسی لگتی تھی جیسے ابھی بنائی گئی ہو۔ قریب ہی سے سائیں جی کے مرید خاص کی سسکیوں کی آواز آئی اس نے بتایا کہ کل شام سائیں جی اندر عصر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ قبر دھنس گئی۔ ان لوگوں نے اسے کھولا نہیں۔ حسب ہدایت غائبانہ نماز پڑھ لی"۔

ممکن ہے روحانیت کے عالموں کو اس سارے قصے کا کچھ ماحصل سمجھ میں آئے۔ عام قاری کو تو کچھ پلے نہیں پڑتا۔ ممکن ہے مصنفہ نے قیوم کو عرفان کی منزل تک پہنچانے کا ارادہ بعد میں ترک کر دیا ہو۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا، سمجی کا آسیب اس پورے قصہ پر چھایا ہوا ہے۔

آفتاب تو سیمی سے بے وفائی کر کے لندن چلا گیا مگر اس کے ظالمانہ رویہ کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ آفتاب کے یہاں اپنارمل بچہ پیدا ہوا۔ شاید مصنفہ ہندو مائتھولوجی کے "شراپ" والے تصور میں عقیدہ رکھتی ہیں۔

آفتاب لندن سے آیا تو قیوم سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس لڑکے کی عمر دس سال تھی۔ اس کا سر باقی دھڑ سے اور آنکھیں چہرے سے بہت بڑی تھیں۔ وہ عجیب عجیب خواب دیکھتا ہے۔ خود کو دنیا کا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ کبھی عبرانی میں باتیں کرتا ہے۔ قیوم اسے سمجھاتا ہے کہ افراہیم پاگل نہیں ہے وہ ایک اور سمت میں دیکھ سکتا ہے۔ اس کی دیوانگی اس قسم کی ہے کہ اس سے روح میں توانائی آتی ہے۔ وہ ایک ہی جست میں کئی کئی منزلیں پار کر سکتا ہے۔ قیوم کے سامنے افراہیم ان مقامات کی تفصیلات بتانے لگتا ہے جنہیں اس نے دیکھا تک نہیں۔ اذان کی آواز آتی ہے تو "افراہیم کچھ دیر کانپتا رہا اور پھر منہ کے بل سجدے میں گر گیا۔ اس طرح گویا مصنفہ نے افراہیم کو ایک چھوٹا سا سائیں جی بنا دیا۔ البتہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس قسم کی اولاد رزق حرام سے پیدا ہوتی ہے یا رزقِ حلال سے۔

بقراطی کی باتیں تو آپ بہت دیکھ چکے، ایک مضحکہ خیز غلطی بھی ملاحظہ کیجئے:۔

روشن کو لینے کے لئے افتخار صرف دو ہفتہ کی چھٹی لے کر آیا ہے۔ قیوم کو اس مدت میں سب کام کرنے تھے: "یعنی افتخار کا روشن کے ساتھ نکاح اور میرا روشن کو طلاق دینا۔"

گویا اس وقت تک قیوم نے روشن کو طلاق نہیں دی تھی۔ قانوناً وہ اس کی بیوی تھی۔ اسے طلاق کے بعد عدت بھی پوری کرنا تھی۔ اس کے بعد ہی کوئی نکاح خواں روشن کا نکاح افتخار سے پڑھا سکتا تھا۔ مصنفہ یہی لکھ دیتیں کہ قیوم نے روشن کو ۳ — ۴ مہینے پہلے طلاق دیدی تھی۔ تو بات بن جاتی۔ ناول کو زیادہ انٹیکچوئل بنانے کا انجام کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔

یہ ناول دراصل راجہ گدھ کی نہیں بلکہ سیمی کی داستان ہے۔ مصنفہ اگر عام سطح پر بیٹھ کر لکھتیں تو کہانی میں خاصی جان تھی۔

چلتا مسافر

الطاف فاطمہ

برصغیر کی تقسیم بہت بڑا انقلاب تھی۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ تقسیم نفرتوں کے سائے میں عمل پذیر ہوئی۔ انقلاب کہتے ہی اسے ہیں جس میں حالات منقلب ہو جائیں۔ جہاں سینکڑوں ہزاروں رؤسا اور خوش حال لوگ روٹی تک کو محتاج ہو گئے وہاں لاکھوں کے وارے نیارے بھی ہو گئے۔

مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے میں دو جذبات سب سے زیادہ قوی تھے۔ ایک ہندوؤں سے نفرت اور دوسرا یہ کہ نئے وجود میں آنے والے پاکستان میں حکمرانی کا حق مسلمانوں کو ہی حاصل ہوگا۔ مسلم لیگ کا نعرہ تھا کہ پورے برصغیر میں بسنے والے مسلمان ایک قوم ہیں چنانچہ جہاں مسلمان دس فیصد سے بھی کم تھے وہاں کے مسلمان بھی مطالبۂ پاکستان میں جوش و خروش سے شریک تھے۔ یہ بہت کم لوگوں نے سوچا کہ پاکستان کتنے لوگوں کو سمو سکے گا اور وہاں کتنے لوگ پہنچ سکیں گے ہر مسلمان خیالی جنت کی تمنا میں مست تھا۔

مسلمانوں اور ہندوؤں میں باہمی نفرت تو تھی ہی سیاسی جماعتوں نے اسے اور بھی

ہو ادی۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ بنگال کی تقسیم کا بھی اعلان کیا گیا۔ کاش مسلم لیگ کٹا پھٹا پاکستان قبول نہ کرتی اور جتنے مسلمان فسادات میں مارے گئے اگر اس کے دس فیصد کی بھی قربانی دے دی جاتی تو انگریزوں کو ان دونوں صوبوں کی تقسیم کا فیصلہ واپس لینا پڑتا مگر قربانی کی تربیت تو مسلم لیگ نے دی ہی نہیں تھی۔ ایسے موقع پر حسن قسم کے تدبر کی ضرورت تھی۔ اس سے بھی کام نہیں لیا گیا بلکہ اس کی جگہ تکبر کا مظاہرہ کیا گیا۔ زیادہ تر قتل و خون ان دونوں صوبوں کی تقسیم کی بنا پر ہی ہوا۔

یہ باہمی نفرت پورے برصغیر میں وبا کی طرح پھیل گئی۔ باہمی محبت تو صدیوں کے وعظ و نصیحت کے بعد بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہے مگر نفرت بہت جلد پھیل جاتی ہے۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمان منتشر تھے۔ پڑوسی نے پڑوسی کو بے تکلف قتل کیا۔ لوگ انسانیت تو کیا حیوانیت کے درجے سے بھی گر گئے۔

اقلیتی صوبوں میں سب سے پہلے فسادات بہار ہی میں ہوئے۔ اس تباہی کا نقشہ پیش کرنے کے لئے الطاف فاطمہ نے بہار کے ایک زمیندار خاندان کی داستان بیان کی ہے! اس خاندان کے سرپرست کا نام مبشر تھا۔ مگر انہیں لوگ سید صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس خاندان کے تمام لوگ نیک اور شریف النفس ہیں۔ سید صاحب مسلم لیگ کے سرگرم رکن ہیں وہ اپنا تمام تر وقت قوم کی خدمت پر صرف کرتے ہیں۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے مزمل کو بھی عملی تربیت دینے کی خاطر مسلم لیگ کے ہر اجلاس میں ساتھ لے جاتے ہیں اسے مسلم لیگ سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کرنے کی بھی ترغیب دیتے ہیں۔

سید صاحب اور شاید ان کے اثر سے مزمل کا بھی عقیدہ یہ ہے کہ سیاست کے بارے میں نظریہ اور سیاسی جماعت کا انتخاب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس لئے مسلم لیگ سے اس قدر وابستگی اس کی مخالف جماعت سے تعلق رکھنے والوں سے دوستی برقرار رکھنے میں حائل نہیں ہوتی۔ سید صاحب کے عزیز دوست امیر حیدر پکے کانگریسی ہیں۔ نظریات کے شدید اختلاف کے باوجود دونوں میں گہری دوستی ہے دوستانہ طنز کے وار البتہ ایک دوسرے پر کرتے رہتے ہیں۔

نوجوانوں میں سیاسی جوش ذرا زیادہ ہی ہوتا ہے مگر مزمل بھی ان کا اپنے بزرگوں کی طرح احترام کرتا ہے۔ خود مزمل کا عزیز دوست مہندر بھی کانگریسی ہے۔ مگر دونوں کی دوستی اپنی جگہ قائم ہے۔

اس ناول کے قصہ کی ابتدا، قرارداد پاکستان منظور ہونے کے پانچ سال بعد سے ہوتی ہے یعنی ۱۹۴۵ء سے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی اور برصغیر کی آزادی کے قوی امکانات پیدا ہو چلے تھے۔ مگر ابھی حکومت برطانیہ نے یہ بات طے نہیں کی تھی کہ برصغیر کو کانگریس کے مطالبہ کے مطابق متحد رکھا جائے گا یا مسلم لیگ کے مطالبے کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کی شکل میں تقسیم کیا جائیگا۔

سید صاحب کو پاکستان بننے کا یقین ہے وہ حالات کی رفتار کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اسی لئے وہ اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ امرتسر کے ایک خوشحال گھرانے میں طے کر دیتے ہیں اور فخریہ کہتے ہیں کہ وہ پاکستان میں اپنا سفیر پہلے سے ہی بھیج رہے ہیں۔ سید صاحب کو کیا معلوم تھا کہ امرتسر کدھر جائیگا اور ان کی سفارت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

سید صاحب نے زمینداری کی دیکھ بھال کا کام مکمل طور پر اپنے بڑے بیٹے مدثر کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ غیر سیاسی آدمی ہیں۔ نہایت تن دہی سے زمینداری کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان کی دادی بھی ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ ناول میں یہ تو ذکر نہیں کیا گیا کہ ان کا رویہ مزارعین کے ساتھ کیسا تھا مگر ان کے اوصاف کا جس طرح تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ان کا رویہ مشفقانہ اور مذہبی تنگ نظری سے پاک ہوگا۔

ملک کی سیاسی فضا انتہائی خراب ہو رہی تھی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کے سانپ ہر طرف پھنکار رہے تھے۔ کسی کا ہندو یا مسلمان ہونا کافی تھا۔ ظلم کرتے وقت کوئی یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ ان کے ظلم کا نشانہ بننے والا فرشتہ ہے یا شیطان۔

فسادات کی آگ چاروں طرف بھڑک اٹھی۔ مسلمان کا خون گلیوں میں بہنے لگا۔ سید صاحب کے بڑے بیٹے مدثر کو فسادیوں نے قتل کر دیا۔ سید صاحب نے بڑے ضبط و تحمل کا ثبوت دیا۔ اپنے بیٹے کی نماز جنازہ خود پڑھائی۔ اس کے بعد سید صاحب کو بھی مار ڈالا

گیا۔ ان کے خاندان کا اپنے گھر پر ٹکے رہنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ مزمل اپنے پیچھے قافلہ کو لے کر بہاری مہاجر کی حیثیت سے جیسے تیسے ڈھاکہ جا پہنچا۔ جہاں اس جیسے لٹے پٹے ہزاروں لوگ بھی پہنچ رہے تھے۔ اتنا بڑا زمیندار گھرانہ انتہائی کس مپرسی کی حالت میں ڈھاکہ پہنچا۔ اس پورے خاندان کا واحد کفیل مزمل تھا۔

اس سے پہلے کہ مزمل کی مہاجرانہ زندگی سے بحث کی جائے۔ مناسب ہو گا کہ ہم اس کی شخصیت کے کچھ اور پہلوؤں پر بھی نظر ڈالیں۔ جب یہ ایک خوش حال اور بے فکر نواب زادہ تھا۔ اس کا حلیہ اس طرح بیان کیا گیا ہے "منجھلے بھیا تھے کہ جانو کسی نے سونے کی کان میں بیٹھ کر گھڑا ہو۔ ان کا پتلا نازک سا لمبا اونچا جسم، عجیب عجیب سی سوئی سوئی آنکھیں اور ناک پر دھرا ہوا غصہ۔ ذرا مزاج کے خلاف بات ہوئی اور تن بھن ہوئے نہیں۔"

منجھلے بھیا یعنی مزمل کا غصہ زیادہ تر اس گھر کی ایک نوکرانی نصیبا پر اترتا تھا۔ یہ رویہ ایک عجیب نفسیاتی کیفیت پر مبنی تھا۔ ایک دن نصیبا نے مزمل کے غسل خانے میں اس کے موزے بنیان دھوئے۔ مگر بعد میں اس کی صفائی نہیں کی۔ مزمل اس پر حسب معمول برس پڑا۔ ذرا اس غصہ کا اظہار ملاحظہ ہو "انہوں نے اس کو قہر بھری نظر سے گھورا تو نظریں پھسل کر کالی چھینٹ کی کرتی پر جم گئیں۔ جس میں اس کا توانا جسم پھنسا ہوا تھا! ان کی شعلہ بار نظر ٹھٹک کر واپس جانے ہی کو تھی کہ اس کی چبھن کو شاید نصیبا نے محسوس کر لیا۔"

مزمل اس کی بہن زہرا اور نصیبا بچپن میں ساتھ کھیلے تھے۔ ساتھ ہی جوان ہوئے تھے۔ نصیبا کا مزمل کا پرستار ہونا تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر یہ تعجب کی بات ضرور ہے کہ مزمل بھی اس کالی کلوٹی نصیبا پر مائل تھا۔ نصیبا تیرہ سال کی بھی نہیں تھی کہ اس کی شادی ایک تندرست جوان نصرو سے کر دی گئی۔ عید الاضحی پر گائے ذبح کرنے کی بنا پر ہندوؤں نے اسے مار ڈالا۔ اس کے گھر والوں نے نصیبا کی نحوست کو اس کی موت کا ذمہ دار قرار دیا۔ گھر میں اس کے ساتھ برا سلوک ہونے لگا۔ اس لئے سید صاحب دوبارہ اسے گھر لے آئے۔

گھر کی دوسری نوکرانیوں میں سے رحمتیا اس سے ہمدردی رکھتی تھی مگر حشمتیا اس سے

جلتی تھی۔ جلنے کی وجہ یہ تھی کہ بیوہ ہونے کے باوجود اسے اپنی بیوگی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ ہر وقت کنواری لڑکیوں کی طرح اچھل کود مچاتے رہتی۔ اس کی آواز بھی بڑی رسیلی تھی۔ زہرہ کی شادی کے موقع پر اس نے خوب گیت گائے۔ سید صاحب کے کہنے پر اس کے لئے بھی رنگین ریشمی کپڑے بنوائے گئے۔ تھوڑا سا زیور بھی پہنا دیا گیا۔ مزمل کے مشورے پر ہی لڑکیوں نے اسے گانے کی ٹولی میں شامل کر لیا۔

نصیبا نے سفید کپڑے اتار کر پہلی بار سنگھار کیا تو اس کا جوبن پھوٹ پڑا۔ مزمل اسے توجہ بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک دن مزمل کو اداس دیکھ کر نصیبا نے اس سے سر میں تیل دبوانے کے لئے کہا۔ مزمل راضی ہو گیا۔ اس کے سر کا تمام بھاری پن دور ہو گیا۔ نصیبا سے کہنے لگا "نصیبا تیرے ہاتھوں میں تو بڑی راحت اور بڑا سکون ہے۔"

بچپن میں جب مزمل، زہرا اور نصیبا ساتھ کھیلا کرتے تھے اور دادی اماں ایک کہانی سنایا کرتی تھی جس میں راجہ پودنی کو لے جاتا تھا اور پودنے میاں سرکنڈوں کی گاڑی پر بیٹھ کر اپنی پودنی کے لئے راجہ سے لڑنے جاتے تھے۔ اس پر مزمل کہتا تھا کہ "نصیبا پودنی ہے۔ دادی اماں اقرار کرتیں تو مزمل کہتا "جب اس کو راجہ لے جائیگا تو پھر میں سرکنڈوں کی گاڑی بناؤں گا، تیلیا میں سے دو مینڈک پکڑ کر اس میں جوتونگا اور۔ اور پھر اس پر اکڑ کر بیٹھوں گا۔ اور جو کوئی مجھ سے پوچھے گا تو اکڑ کر کہوں گا۔ راجہ لے گیا ہماری پودنی ہم پیر بسارن جائیں۔" دادی بگڑ کر کہتیں "اے نوج دور پار۔ میرا لال کاہے کو اس کل موہی کی خاطر کسی سے بیر بسانے جائے۔" مزمل اس کے باوجود کہتا "یہ ہماری پودنی ہے تو اسے راجہ سے چھین کر واپس لانا ہی پڑے گا۔"

اس طرح بچپن ہی سے مزمل کو نصیبا سے لگاؤ تھا۔ وہ بار بار غصہ کا اظہار شاید اس لئے کرتا تھا کہ ان میں دوری ہو گئی تھی۔ وہ اس کا قرب چاہتا تھا۔ اسلئے جھلاہٹ میں بات بات پر اس پر خفا ہوا کرتا تھا۔

سر میں تیل دبوانے کے بعد نصیبا اس کے قریب آ گئی تھی۔ مزمل نے اسے اپنی قمیص استری کرنے کے لئے دی۔ جب وہ قمیص لینے کے لئے گیا تو اس نے پردے

کی اوٹ میں سے نصیبا کو نعیم سے یہ کہتے سنا " نعیم بھیا تم کو کیا خبر ہے منجھلے بھیا کی ڈانٹیں اور چیخم دھاڑ تو میری جندگی ہے۔ میں ان کو دیکھے بنا جندہ رہ سکتی ہوں تو کبھی میں سوچ ہی نہیں سکتی "

ایک دن نصیبا منو کے لئے سرکنڈے کے زیور بنا بنا کر اسے کھلا رہی تھی منو مزمل کا ہاتھ پکڑ کر اسے نصیبا کے زیور دکھانے لے گیا۔ مزمل نے نصیبا سے صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ نصیبا رونے لگی۔ مزمل اسے دلاسا دینے لگا " مزمل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جفاکش، جوان اور تندرست جسم کے لمس میں ایک عجیب، خواب آور سی کیفیت تھی۔

ایک دن نصیبا کے ہاتھ سے بچے کے دودھ کی بوتل چھوٹ گئی وہ اس کی کرچیاں سمیٹنے لگی تو شیشے کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کی ہتھیلی میں گھستا چلا گیا۔ اس کی ہتھیلی سے خون بہت بہہ رہا تھا۔ بھابی دلہن نے مزمل سے کہا کہ وہ اس کے لئے کچھ کرے اس کا خون ان کی ہتھیلی میں لگ گیا۔ اس پر مزمل نے کہا " میں تو یوں ہنس رہا ہوں کہ اس کا خون بڑے کام کی چیز ہے۔ اس کا خون آپ کے ہاتھ کا سنگھار بن گیا ہے۔ بھابی جیسے مہندی لگ گئی ہے "

یہ جملے فلمی انداز کے معلوم ہوتے ہیں۔ مصنف نے شاید انہیں ڈرامائی سچویشن کی حیثیت سے لکھا ہے کہ نصیبا کے ارمانوں کا خون بھابی دلہن کے دوسرے سہاگ کی راہ ہموار کر دے گا۔

نصیبا کے لئے مزمل کی بے تابیاں اتنی بڑھ گئیں کہ اس نے اس سے نکاح کا اعلان کر دیا۔ بات آخر کب تک چھپی رہتی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ اتنے بڑے زمیندار گھرانے میں نصیبا جیسی بیوہ نوکرانی کو بہو کی حیثیت سے قبول کر لیا جاتا۔ گھر میں ایک طوفان سا اٹھنے والا تھا۔ مزمل کی اولین پیشی اس کی بھابی کے سامنے ہوئی۔ مزمل کے لہجے میں کچھ تلخی سی تھی

بھابی کہنے لگیں "ارے تم تو بڑے قانونی اور سرکاری قسم کے لفظ بول رہے ہو۔ اتنے معمولی مسئلوں کے لئے اتنے جید لفظوں کو خرچ کر دیا جائے تو پھر وہ بڑے بڑے مسائل کیا کریں گے جنہیں ان الفاظ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے"

ایسے موقع پر ایسی مرصع گفتگو خلاف قیاس لگتی ہے۔ دراصل یہ زبان تحریر کی ہے گفتگو میں اور پھر ایسے نازک موقع پر اس قسم کی زبان استعمال نہیں کی جاتی۔ دراصل مصنفہ کو بھی بعض دوسرے ناول نگاروں کی طرح انشا پردازی کا شوق ہے۔ اس کتاب میں اس کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ مگر اس میں بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں

بہر حال یہ آنے والے طوفان کا اولین اظہار تھا۔ اس کے بعد منزل کی پیشی اس کی ماں کے سامنے ہوتی مگر سید صاحب اسے مسلم لیگ کی کسی اہم میٹنگ میں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ کہتی بھی ہیں "مگر مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنا ہے" سید صاحب کے نزدیک میٹنگ اس سے بدرجہا اہم تھی۔ اس لئے وہ منزل کو ساتھ لے گئے۔

سرکار بیگم نے موقع غنیمت جان کر نیبیا کو اپنی بہو کے ساتھ گاؤں بھیج دیا۔ اس سے پہلے کہ گھر کا طوفان کچھ رنگ دکھاتا۔ بہار میں فسادات پھوٹ پڑے! اس خاندان پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی۔ مدثر کو بلوائیوں نے مار ڈالا۔ اس کی نماز جنازہ خود سید صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد سید صاحب کو بھی کسی نے قتل کر دیا اور یہ خاندان کس مپرسی کی حالت میں ہجرت پر مجبور ہوا۔

بہر حال یہ کسی نہ کسی طرح ڈھاکہ پہنچ گئے۔ مسلم لیگ کے کارکنوں نے منزل کو پہچان لیا اور بغیر اپنی دکھ بھری داستان سناتے اسے گھنشام کا ٹوٹا پھوٹا اور چھوٹا سا مکان الاٹ ہو گیا۔ کسی دوکان پر حساب کتاب رکھنے کا کام بھی مل گیا مگر یہ زیادہ دن نہ چل سکا

اگر یہ رومانی ناول ہوتا تو اس کے لئے مناسب موقع یہ تھا کہ منزل کے اعلان کے بعد گھر کی مخالفت کے باوجود وہ نیبیا سے نکاح کر لیتا۔ مگر مصنفہ کا مقصد تو بہار کے مہاجرین کے مصائب کی تصویر پیش کرنا تھا۔ اس لئے اس داستانِ محبت کو انہوں نے یہیں چھوڑا اور اس انداز سے چھوڑا ہے کہ قارئین کے دلوں میں منزل اور نیبیا دونوں کے لئے

ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

مزمل کے کردار کی عظمت کا تصور اس وقت قائم ہو جاتا ہے کہ اس نے نصیبا سے نکاح کرنا چاہا ورنہ زمیندار گھرانوں میں تو نوکرانیوں کی حالت کھلونوں جیسی ہوتی ہے۔ جب تک جی چاہتا ہے ان سے کھیلتے ہیں۔ پھر کسی بھی غریب کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ شادی اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی کرتے ہیں۔ گھر والوں کو ان آنکھ مچولیوں کا علم بھی ہو جائے تو وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ رئیس زادے تو ایسا کیا ہی کرتے ہیں۔

مزمل کے گھر میں بھی اس واقعہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ اس کا حل یہ سوچ لیا گیا تھا کہ نصیبا کو گاؤں بھیج دیا جائے اور کسی سے نکاح کر دیا جائے۔ مدثر خاموش ہو ہی جائے گا۔

نصیبا کا کردار اس ناول کا اہم ترین کردار ہے۔ اس میں جو عظمت بیان کی گئی ہے۔ وہ ناممکن تو نہیں لیکن غیر معمولی ضرور ہے۔ مصنفہ نے "دستک نہ دو" میں بھی گیتی کی شکل میں ایک غیر معمولی کردار پیش کیا ہے۔

نصیبا عام نوکرانیوں سے مختلف ہے۔ اسے مزمل سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس کی ساری بدمزاجی برداشت کرتی تھی مگر اسے چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کے باوجود اسے یہ گھرانہ اپنی محبت سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ مزمل کے راستے سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ مشرقی پاکستان پہنچ کر بھی اس نے اس خاندان کی خدمت گزاری نہ چھوڑی۔ وہاں بھی اس نے قربانی کی اعلےٰ مثال قائم کی۔ اس نے بڑی بیگم کو خدا اور رسول کا واسطہ دے کر، رو رو کر اور ان کے پیر پکڑ کر ان سے کہا کہ دلہن بیگم پر چادر ڈال دیں۔ اس طرح اس کے اصرار ہی سے مزمل کا نکاح اس کی بھاوج سے ہو گیا تھا ان دونوں کرداروں کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مزمل جب زخمی ہو کر گرا تو اس کا خون نصیبا کے قدموں پر ہی آ گرا۔ وہ کتنی ہی دیر اس کا سر اپنے گھٹنے پر ٹکائے بیٹھی رہی پھر مزمل کی جیپ آ گئی اور وہ اسے ہسپتال لے گیا مزمل نے زندگی کا آخری جملہ بھی نصیبا سے ہی ادا کیا۔

اس موقع پر بات ذرا کھٹکتی ہے کہ چادر ڈالنے کی یہ رسم اور محاورہ صرف پنجاب میں رائج ہے اس کا رواج مسلمانوں اور سکھوں دونوں میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ یہ لفظ بہار کی تہذیب میں قطعی اجنبی تھا۔ بہار اور یوپی کے زمیندار گھرانوں میں چادر ڈالنے والی رسم نہ تھی، نکاح البتہ ہو جاتا تھا۔

اس لئے کچھ عرصہ بعد نصیبا نے بھی بشروا سے نکاح کر لیا۔ مگر اس نے بشروا کو صاف بتا دیا تھا کہ "یہ تو شیطان سے بچنے اور تیرا انگڑا احلال کرانے کی ایک بات ہے ورنہ میرے من میں تو منجھلے بھیا ایک دیوتا کی طرح بسے ہیں۔" بشروا نے اس سے کہا: "تو پھر تو نے بہو بیگم سے ان کا نکاح کیوں کروایا؟ مجھے اپنے نکاح میں کیوں لیا۔" نصیبا کے اس رویہ کو سمجھنا بشروا کے بس کی بات نہ تھی۔ شاید نصیبا بھی نہ سمجھتی ہو۔

مزمل نے ایک چھوٹی سی پرچون کی دوکان لگالی تھی۔ مزمل خاصہ پڑھا لکھا اور ذہین تھا۔ وہ بڑا اچھا ڈبیٹر رہ چکا تھا۔ اس نے کئی مضمونوں میں سونے کے میڈل لئے تھے۔ ڈھاکہ کے مسلم لیگیوں نے اسے پہچان بھی لیا تھا مگر تعجب ہے اسے معمولی سی نوکری بھی نہ مل سکی۔ شاید مصنف نے اپنے منصوبے کے تحت اسے اس حالت میں دکھایا ہو۔

مشرقی پاکستان کے حالات رفتہ رفتہ خراب ہوئے۔ شروع شروع میں مہاجرین کے ساتھ بنگالیوں کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ مہاجرین کی خاصی تعداد خوشحال تھی۔ مصنف نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی کہ یہ حالات کیوں خراب ہوئے اور اس میں کس کس کا کتنا حصہ تھا۔ اس پر روشنی ڈالتیں تو یہ ناول اور وقیع ہوتا۔

مزمل اپنے بیٹے مدثر سے پوچھتا ہے: "لیکن وہ تم سے نفرت کیوں کرتے ہیں، کبھی یہ سوچا تم نے؟" مدثر "نفرت کی وجہ ان کے اندر نہیں اپنے آپ کے اندر تلاش کرو۔" صرف اتنا سا اشارا کافی نہیں ہے۔ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالنی چاہئے تھی۔ اس سے بہاری مہاجرین کا کردار اور بھی واضح ہو جاتا۔

مدثر کالج میں سائنس کا طالب علم تھا اسے بندل نے میٹرک میں پڑھایا تھا وہ بی بی ای بی

میں تھا مگر بذل ابھی یونیورسٹی میں ہی تھا۔ بذل کا منزل کے گھر میں اس طرح آنا جانا تھا جیسے وہ اسی خاندان کا فرد ہو۔

تعلیمی درس گاہوں کے حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ پروفیسر سائنس کے فارمولوں کے بجائے سیاست پر لیکچر دیتے تھے۔ مغربی پاکستانیوں کے خلاف اور انہی کے ساتھ اردو کے خلاف بھی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ یکتی باہنی دن بدن زور پکڑتی جا رہی تھی۔

پہلے منزل کی دکان پر کئی لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ کبھی شعر و شاعری پر، کبھی عالمی سیاست پر گفتگو ہوتی تھی۔ ان میں بنگالی بھی ہوتے تھے۔ بعض ہندو بھی آجایا کرتے تھے۔ اردو بولنے والے بھی ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ بنگالیوں نے آنا بند کر دیا۔ دوکان کی بکری بھی کم ہو گئی۔ مسجد تک میں سیاست گھس گئی۔ بنگالی بہاریوں کے ساتھ صف بستہ ہونا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

دوسرے بہاریوں کی طرح منزل پر بھی دن بدن مصیبتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مگر اس نے اپنی مصیبتوں میں اپنے بھائی کے بچوں کو شریک نہیں کیا۔ منّو کو اس کے ماموں پہلے ہی زبردستی اپنے ساتھ لندن لے گئے تھے۔ اس کی بہن کراچی میں اپنی سسرال میں خوش ہے نعیم بھی مغربی پاکستان چلا گیا۔ مصیبتیں منزل، اسکے بیٹے اور بیوی کے لئے ہی مقدر تھیں۔ بذل کے اصرار کے باوجود وہ مدثر کو مغربی پاکستان بھیجنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس کا خیال تھا کہ مدثر اس سرزمین کی پیداوار ہے اور وہ سب کچھ یہیں رہ کر بھگتے گا۔ آخر کار بذل کے بے حد اصرار پر مدثر کو مغربی پاکستان روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں بنگال سے نکل کر جانا بے انتہا مشکل تھا۔ یہ کام بھی بذل کے توسط سے ہی انجام پاتا ہے۔

نفرتوں کے اس سیلاب میں صرف چند "انسان" نظر آتے ہیں۔ ایک تو منزل

جو مرتے دم تک نہایت بلند پایہ، صاحبِ ظرف، باشعور اور سچا انسان نظر آتا ہے اس کی رہنما دو کتابیں ہیں جنہیں وہ اکثر پڑھتا رہتا ہے۔ ایک دیوان غالب اور دوسری کشف المحجوب۔ اس کی صحبت میں بذل پر بھی ان دونوں کتابوں کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔

مزمل انتہائی خطرناک حالات میں بھی نواکھالی کی مہاجرہ کو چلتے پانی اور کھانا دینے جاتا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کی نماز جنازہ کا بندوبست کرتا ہے۔

دوسرا بذل الرحمٰن ہے جسے بذل کے نام سے پکارتے ہیں وہ بھی مزمل ہی کا مثنیٰ نظر آتا ہے۔ مزمل اسے بیٹے کی طرح چاہتا ہے۔ اس گھر میں اسے ماں کی محبت بھی ملتی ہے جس سے کہ وہ اپنے گھر میں محروم ہو چکا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں اس سے بڑی بے رخی برتتی تھی۔ اس کی حقیقی ماں فاخرہ بڑی نیک عورت تھی۔ بذل کے باپ ڈاکٹر رحمٰن کے الفاظ میں گویا بدھ بھگوان نے فاخرہ کے روپ میں جنم لیا تھا۔

بذل کا دل بھی نفرتوں سے پاک ہے۔ ان حالات میں مظلوم انسانوں کی خدمت کا یہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ مکتی باہنی میں شامل ہو جائے۔ اس طرح اس نے بہت سے لوگوں کی مدد کی۔ بہتوں کی جان بچائی۔ عام بنگالیوں کے برخلاف اسے اردو سے بھی محبت ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ دیوان غالب پڑھنے والا مجیب کو مذیب کہتا ہے اور سلسبیل کو شوشبیل پنجابی کو پونزابی کہتا ہے۔ مصنفہ نے اس تضاد پر کوئی توجہ نہیں دی۔

جب مزمل خانہ نشین ہو کر بیٹھ گیا تھا تو اسے کھانا اور راشن بذل ہی کی کوششوں سے پہنچتا رہا۔ مزمل پر قاتلانہ حملہ ہونے کے بعد وہی اسے ہسپتال لے کر گیا۔ اسے خون دیا گیا لیکن وہ اسے بچا نہ سکا۔ اس کی موت کے بعد اس نے نماز جنازہ کا بندوبست کیا ورنہ وہاں تو یہ حال تھا کہ کٹے ہوئے دھڑ اور اعضا ننھے ننھے بچوں کی لاشیں گلیوں میں بکھری نظر آتیں۔ کبھی بیلچوں کی مدد سے انہیں کسی گڑھے میں ڈال دیا جاتا کبھی پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی جاتی۔

بذل کی عزیز ترین دوست سلسبیل پنجابی فوجی افسر کی بیٹی تھی وہ عام مغربی پاکستانی لڑکیوں سے مختلف تھی وہ بہت باشعور اور بلند نظر تھی۔ اسے بنگال کے کلچر اور بنگال سے محبت

تھی مگر ان حالات میں ایسے انسانوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کی منگنی اس کے چچا زاد بھائی سے ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے مغربی پاکستان واپس جانا ہے۔ بذل کی اور اس کی ذہنی سطح میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ لاہور کے کنونشن میں بھی یہ دونوں ساتھ تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے بلکہ در پردہ محبت بھی۔ لیکن دونوں جانتے تھے کہ ان کے راستے جدا ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے کی دل سے قدر کرنے کے باوجود دونوں اس باہمی محبت کو دوستی کی سطح تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تاثر اتنا گہرا تھا کہ شادی ہو جانے کے بعد بھی سلسبیل بذل کو اکثر یاد کرتی رہتی ہے بذل بھی اسے اکثر یاد کرتا ہے' وہ سوچتا ہے کتنا ہنستے تھے پھر ہم اپنی حماقتوں پر کوئی سنجیدہ بات آتی ہی نہ تھی درمیان میں، کوئی کسی کا برا نہ مانتا تھا۔ یہ ہمارا پورا ٹولہ عجیب ہی برادری تھا۔ ایک دوسرے پر طنز کرتے تھے۔ چوٹیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد اور ضرورت میں یوں شریک رہتے تھے کہ دکھ درد کا احساس دکھیا کو بعد میں ہوتا اور اس میں شریک ہونے والے پہلے ہی مستعد ہو جاتے" وہ سب بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے۔

دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔ مگر ایک مقام پر مصنفہ نے جس قسم کی بے تکلفی کا اظہار کیا ہے وہ ان دونوں کے رویوں کو دیکھتے ہوئے خلافِ قیاس لگتا ہے۔

ایک دن سلسبیل حالات سے اتنی پریشان تھی کہ وہ بذل کے پاس آئی اور اس سے کہا کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر روئے۔ اس پر بذل کہتا ہے "ارے باپ رے۔ اب اس سمے ایسا کرنا بھی نہیں لوگ کہہ دیں گے بذل اسی اس کو ریپ (Rape) کر رہا تھا"

" Rape وہ بڑبڑائی۔ Rape تو ہم سب ہی ایک دوسرے کو کر رہے ہیں۔ ہم کو کون نہیں Rape کر رہا ہے"؟

یہ اندازِ گفتگو کس قدر بھدا ہے ممکن ہے یہ لفظ انگریزی زبان میں کسی شائستہ معنی میں بھی استعمال ہوتا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ بنگال کے ہندوؤں نے اس باہمی نفرت کو ہوا دینے میں بڑا حصّہ لیا مگر وہاں مُرلی جیسے ہندو بھی تھے جنھوں نے غیر بنگالیوں کی جان بچائی۔ جب تک مزمل گھنشیام والے گھر میں رہا، مرلی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے گھر کھانا اور راشن پہنچاتا رہا۔ گھر پر باہر سے تالا پڑا ہوا تھا مرلی دیوار پھاند کر اندر کودتا تھا۔

مرلی ہی نے سلسبیل کو سفید ساڑھی پہنا کر اور اس کی پیشانی پر بندیا لگا کر بڑی ہوشیاری اور دانش مندی کے ساتھ اسے جہاز پر سوار کرایا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کس قدر خطرناک تھا اگر وہ پکڑا جاتا تو کیا مکتی باہنی والے اسے چھوڑ دیتے۔

بذل کے والد ڈاکٹر رحمٰن بھی قطعاً نیک انسان تھے۔ وہ عام بنگالیوں کے رویہ سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ حالات کی اس خرابی کو وہ روک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس جیسے حساس انسان انسان کے لئے پاگل ہو جانا ہی واحد راستہ تھا۔

مسجد کے پیش امام مولوی منظور الاسلام بھی نیک انسان تھے۔ ایک دن مزمل تاجرہ کے گھر اسے چائے دینے اور اس کے لئے پانی کی ٹھلیا بھرنے گیا تو مولوی منظور الاسلام نے اسے پہچان لیا اور انہوں نے مزمل کے ہاتھوں کو چوما۔

لوگ مزمل کی نماز جنازہ پڑھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ منظور الاسلام نے کڑک کر کہا "میں یہ جنازہ ضرور پڑھاؤں گا۔ اس لئے کہ یہ کسی منافق کا جنازہ نہیں ہے۔ ایک مسکین اور بے ضرر مسلمان کا جنازہ ہے۔ جو بہت سال پہلے ہمارے شہر میں پناہ ڈھونڈھنے آیا تھا۔"

اس طرح نماز جنازہ کی صف میں دس آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ سب سے پیچھے بذل چادر اوڑھے ہوئے چپکے سے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

بنگالیوں کی نفرت کا سب سے زیادہ نشانہ تو مغربی پاکستان کے فوجی تھے۔ جب حالات پر فوج کا اختیار تھا انہوں نے بھی انتظام کے پردے میں بڑے ظلم کئے۔ جب بنگالیوں کو موقع ملا، انہوں نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

دوسرے درجے پر بہاری تھے۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد فوجی تو بنگالیوں کی زد سے بچ گئے تھے۔ ان کے تمام تر غصہ کا نشانہ بننے کے لئے بہاری ہی رہ گئے تھے۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ حالات کی خرابی میں ان کا قصور کس حد تک تھا۔ بہاریوں نے ہجرت بنگال میں نہیں پاکستان میں کی تھی۔ جب علیحدگی کی تحریک چلی انہوں نے یہی سوچا کہ انہیں ہر حال میں پاکستان کا یعنی متحدہ پاکستان کا وفادار ہونا چاہیئے مکتی باہنی کی دعوت پر وہ ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئے۔ مکتی باہنی نے انہیں غدار اور دشمن سمجھا اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جو مسلمان کو مسلمان کے ساتھ تو کیا ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ بھی زیب نہیں دیتا۔ مصنفہ نے اس ظلم کی صرف چند مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ وہاں تو اس سے بھی بدتر ہزاروں واقعات گزرے ہیں۔

مصنفہ اس ناول کے ذریعہ شاید یہ سوال قارئین کے سامنے رکھ رہی ہیں کہ بہاریوں کو کیا کرنا چاہیئے تھا؟ کیا انہیں وفاداری اس سرزمین سے کرنی چاہئے تھی جہاں وہ آباد تھے اور مکتی باہنی کے ساتھ مل کر "پونزابیوں" کے خلاف جنگ کرنی چاہئے تھی۔ اس صورت میں شاید ان پر وہ آفتیں نازل نہ ہوتیں، جن سے کہ انہیں دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا وہ صحیح تھا یا غلط؟ غالباً یہ بہاری مہاجرین سب سے سچے پاکستانی تھے جو جاں نثاری اور وفاداری انہوں نے دکھائی، شاید اتنی فوجیوں نے بھی نہ دکھائی ہو مگر ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا۔ ان سے کئی گنا بنگالی ناجائز طریقوں سے پاکستان میں داخل ہو گئے وہ بھیک مانگ رہے ہیں، بردہ فروشی کر رہے ہیں اور ہم سب کچھ گوارا کر رہے ہیں۔ مگر ان سچے اور کھرے پاکستانیوں کے لئے پاکستان میں جگہ نہیں ہے۔

یہ سوال یہیں ختم نہیں ہو جاتا، خدا سچے پاکستان کو سلامت رکھے۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ پاکستان کے بعض علاقوں میں علیحدگی کی آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، بعض لوگوں پر بغاوت کے مقدمے بھی چل رہے ہیں۔ خدانخواستہ کسی ہمسایہ کی شہ پر کبھی وہی صورتحال پیدا ہو تو مقامی آبادی کیا کرے، پاکستان اور نظریہ پاکستان کا ساتھ دے یا زمین سے وفاداری کا اظہار

کرے۔ علیحدگی پسندوں کی دعوت پر ان کے ساتھ شامل ہو یا فوج کے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ کرے۔

ہم سب کا فرض ہے کہ ملک کی وفاداری کا تصوّر مستحکم کریں اور اتحاد کی خاطر جان لڑا دینے والوں کو سر آنکھوں پر جگہ دیں۔

"چلتا مسافر" اوسط درجے کا مگر وقیع ناول ہے۔ اس کی قدر و قیمت اس دردمندی حب الوطنی میں پوشیدہ ہے جس کے زیرِ اثر یہ لکھا گیا ہے۔ مصنف نے ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔